برِّصغیر میں

اہلِ حدیث کی آمد

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

برصغیر میں
اہل حدیث کی آمد

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

اہل حدیث کے متعلق چند اصحاب علم کے ارشادات

اہل حدیث کی تعریف

(علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری۔ وفات ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء)

اہل حدیث وہ ہے جو حدیث سے استدلال کرتا ہو' جو حدیث کو رشد و ہدایت کا ذریعہ سمجھتا ہو' جو فرمان رسول ﷺ کے سامنے رائے اور قیاس کو چھوڑ دیتا ہو۔ اس تعریف کے مطابق ائمہ اربعہ اور ائمہ ظواہر یقیناً اہل حدیث ہیں اور مالکیہ و شافعیہ و حنابلہ و احناف کے وہ سب علمائے کرام بھی اہل حدیث ہیں جو مسائل شرعیہ میں سنت نبویہ کو حجت سمجھتے ہیں' جو حدیث رسول اکرم ﷺ سے استشہاد کرتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں کلام رسول (ﷺ) کو بہ لفظ حدیث بیان فرمایا ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا (تحریم:۳)

یعنی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی سے ایک حدیث راز میں کہی۔

الفاظ حدیث کو یاد رکھنا' اسے جوں کا توں ادا کرنا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور دعائے برکت کے تحت میں ہے۔

نضر الله عبدا سمع مقالتی فوعاها واداها كما سمعها

یعنی اللہ تعالیٰ اس بندے کو سرسبز و شاداب رکھے' جس نے میرا کلام سنا' اسے محفوظ رکھا۔ پھر جیسا سنا تھا' اسی طرح ادا بھی کر دیا۔

برصغیر میں اہل حدیث کی خدمت حدیث

(علامہ محمد رشید رضا مصری۔ وفات ۲۲۔ اگست ۱۹۳۵ء)

اگر سرزمین ہند میں اہل حدیث خدمت حدیث کا بیڑا نہ اٹھاتے تو مشرق میں علم حدیث ختم ہو جاتا۔ مصر، شام، عراق اور حجاز میں تو دسویں صدی ہجری سے یہ مقدس علم روبہ تنزل تھا اور جامعہ ازہر کے بڑے بڑے علما بھی خطبوں اور وعظوں میں ضعیف بلکہ موضوع روایات بیان کرتے تھے۔ اہل حدیث نے علم حدیث کو اپنی ان تھک کوششوں سے پھر زندگی بخشی۔

خیر القرون میں صرف اہل حدیث ہی تھے

(مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی۔۔۔۔وفات مارچ ۱۹۴۱ء)

خیر القرون میں صرف اہل حدیث ہی تھے۔کوئی حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلی نہ تھا۔ خود چاروں امام امامت کے مرتبے کے ساتھ پہلی صدی ہجری میں موجود نہ تھے۔ پھر ان کے مقلدین کہاں ہوں گے۔اس زمانے کے تمام مسلمان قرآن وحدیث پر عامل تھے اور یہی ان کا عقیدہ تھا۔اسی پر عمل کرنے کی وصیت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں فرمائی تھی' لہٰذا وہ سب کے سب اہل حدیث تھے اور انھیں اس زمانے میں اہل حدیث کہا جاتا تھا۔حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جب کسی نوجوان طالب حدیث کو دیکھتے تو فرماتے تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت مبارک ہو' ہمیں حضور حکم فرما گئے ہیں کہ تمھارے لیے مجلسوں میں کشادگی کریں اور تمھیں حدیث کا درس دیں۔

فَاِنَّكُمْ خُلُوْفُنَا وَاَهْلُ الْحَدِيْثِ بَعْدَنَا.

تم ہمارے خلیفہ ہو اور ہمارے بعد تم ہی اہل حدیث ہو۔یعنی تابعین کرام۔

اہل حدیث کا عقیدہ

(مولانا ثناء اللہ امرتسری۔۔۔وفات ۱۵/مارچ ۱۹۴۸ء)

اہل حدیث کا مذہب ہے کہ خداوند تعالیٰ سب چیزوں کا خالق ہے۔سب مخلوق کیا چھوٹی، کیا بڑی، کیا عزیز کیا ذلیل اس کے سامنے سب سر تسلیم خم ہیں۔کوئی بھی اس کے حکم کو پھیرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔سب دنیا کی اصلی حکومت خاص اسی کے قبضے میں ہے۔چنانچہ ارشاد ہے:

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (ملک:۱)

یعنی برکتوں والی وہ ذات ہے جس کے قبضۂ قدرت میں تمام ملک کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ (المومنون:۸۸،۸۹)

یعنی اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ان مشرکوں سے پوچھ کہ کون ہے جس کے قبضۂ قدرت میں سب چیزوں کی حکومت ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے اور اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔اگر تمھیں علم ہے تو بتاؤ؟ یہ بھی کہہ دیں گے کہ ایسی شان خدا ہی کی ہے۔

قریب قریب تمام قرآن شریف اس مضمون سے پُر ہے، بلکہ کلمہ شریف لا الہ الا اللہ ہی میں یہ بیان بالا جمال پایا جاتا ہے، کیوں کہ اس کے معنی ہیں۔''خدا کے سوا اور کوئی حقیقی معبود نہیں، صرف خدا ہی معبود ہے، باقی تمام مخلوق اس کی عابد اور مملوک ہے۔''

لقبِ اہل حدیث

(مولانا ابوالقاسم بنارسی۔۔۔وفات ۲۵رنومبر ۱۹۴۹ء)

''اہل حدیث'' یہ نام دولفظوں سے مرکب ہے۔ پہلا لفظ ''اہل'' ہے، جس کے معنی ہیں، والے، صاحب۔ دوسرا لفظ ہے ''حدیث''۔۔۔حدیث نام ہے کلام اللہ اور کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا۔۔۔! قرآن کو بھی حدیث فرمایا گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کے مجموعے کا نام بھی حدیث ہے۔ پس اہل حدیث کے معنے ہوئے قرآن و حدیث والے۔۔۔! جماعت اہل حدیث نے جس طریقے پر حدیث کو اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے، اور کسی نے نہیں کیا، اس لیے اس کا حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلائے۔

یہ لقب ہمیں اللہ تبارک تعالیٰ کی جانب سے ملا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔

عن انس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان یوم القیامة یجیئی اصحاب الحدیث ومعھم المحابر فیقول اللہ لھم انتم اصحاب الحدیث. انطلقوا الی الجنة. (طبرانی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اہل حدیث اس حال میں آئیں گے کہ دواتیں ان کے ساتھ ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم اہل حدیث ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔

تحریکِ اہل حدیث کے اثرات

(علامہ سید سلیمان ندوی۔۔۔۔وفات ۲۲نومبر۱۹۵۳ء)

اہل حدیث تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانے سے آج تک ہمارے دورِ ادبار کی ساکن سطح میں اس سے جو جنبش ہوئی وہ بھی ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائق شکریہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا' توحید کی حقیقت نکھاری گئی' قرآن پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا' قرآن پاک سے براہ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا' حدیثِ نبوی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباع نبویؐ کا جو جذبہ کم ہِو گیا تھا وہ دوبارہ پیدا ہو گیا۔ اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ''جہاد'' جس کی آگ اسلام کے مجمر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے' کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پابجولاں دریائے شور عبور کر دیے گئے یا تنگ کوٹھڑیوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔

اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مدت کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا اور یہ جو خیال ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے' رفع ہو گیا اور لوگ از سر نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی اور قیل و قال کے مکدر گڑھوں کی بجائے ہدایت کے اصلی سرچشمۂ مصفا کی طرف واپسی ہوئی۔

صرف کتاب وسنت

(مولانا محمد ابرہیم سیالکوٹی۔۔۔وفات ۱۲؍جنوری ۱۹۵۶ء)

نام کا تقرر تمیز و تعارف کے لیے ہوتا ہے اور صدرِ اول و قرون ثانی میں یعنی صحابہؓ و تابعینؒ میں اختلاف کی بنا پر مذاہب کی بنیاد نہیں پڑی تھی اور اِمت کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے کی حدیں نہیں کھینچی گئی تھیں بلکہ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقید تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دیگر شخص کی شخصیت کو شریعت میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ غرض کوئی دوسرا فرقہ تھا ہی نہیں اس لیے کسی سے متمیز ہونے کے لیے الگ نام کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ حتیٰ کہ جب مجتہدین کے اقوال کو حجت گردانا گیا اور مختلف مذاہب کی بنیادیں قائم ہو گئیں تو جن لوگوں نے طرز اول اور زمانہ سابق کی طرح ہر کسی شخص کو دین میں داخل کرنے کے بغیر صرف کتاب وسنت سے دین حاصل کرنا اپنا دستور رکھا اور راویوں کی روایت اور ان کی درایت میں فرق کیا اور اپنے عمل و اعتقاد کی بنا صرف قرآن وحدیث پر رکھی، وہ اہل حدیث، اصحاب حدیث، اہل اثر اور محدثین کہلائے اور باقی سب یا تو اپنے اپنے امام و مقتدا کی طرف منسوب ہوئے جس کی شخصیت کو انھوں نے دوسرے فرقوں میں حد فاصل قرار دیا تھا اور اس کے مجتہدات کو بجائے خود اصل وسند مانا تھا۔ مثلاً حنفی و شافعی باعتبار امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہونے کے۔۔۔ اور یا اس مسئلے کی طرف منسوب

ہونے کے جس میں انھوں نے اصحاب حدیث سے اختلاف کیا۔ مثلاً قدریہ بسبب تقدیر کے منکر ہونے کے اور جبریہ بلحاظ جبر محض کے قائل ہونے کے اور مرجئہ بوجہ اعمال کو ایمان سے جدا کرنے اور محض ایمان پر امید نجات دلانے کے۔

یہ اس شبہے کا جواب ہے جو بعض ناواقف پیش کرتے ہیں کہ اہل حدیث اگر قدیم ہیں تو یہ لقب زمان صحابہ و تابعین میں کیوں مشہور نہیں ہوا۔

اہل حدیث کا عقیدہ اور نصب العین

(مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔۔۔۔وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء)

۱۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری وحی اور قیامت تک کے لیے بنی نوع انسان کے لیے خدا کا آخری پیغام رشد و ہدایت ہے۔

۲۔ یہ وحی الٰہی سید المرسلین و خاتم النبیین سیدنا محمد بن عبداللہ المطلبی الہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

۳۔ آپ اس وحی الٰہی کے صرف مبلغ ہی نہیں بلکہ اس کے مبین اور مفسر بھی ہیں۔ فرمایا:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ ۝ (النحل:۴۴)

(اے نبیؐ! ہم نے تمھاری طرف یہ قرآن بھیجا ہے تا کہ لوگوں کو آیات قرآنی اچھی طرح وضاحت سے سمجھا دیں۔)

۴۔ آپؐ نے قرآن مجید کی جو تشریح بیان فرمائی اس کا نام حکمت یا سنت ہے۔ فرمایا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ۝ (النساء:۱۱۳)

(اللہ نے آپ پر کتاب اور اس کے معارف و حکم بھی نازل فرمائے اور آپ کو وہ علوم سکھائے جو آپ کو معلوم نہ تھے۔)

معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے علاوہ دوسری چیز بھی آپ پر نازل ہوئی تھی جس کو قرآن مجید "حکمت" (معارف و حکم) سے تعبیر کرتا ہے۔ پس قرآن مجید کے علاوہ دوسری چیز جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوئی، وہ

احادیث یا سنت رسول اللہ ہی ہے جسے قرآن حکیم کی پیغمبرانہ تشریح سمجھا جاتا ہے۔

۵۔ قرآن کریم کی اس تشریح کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آیات قرآنیہ کی تبیین وتشریح اپنے ذمے لی۔۔۔فرمایا:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْءَانَهُ ○ فَإِذَا قَرَأْنَٰهُ فَٱتَّبِعْ قُرْءَانَهُ ○ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ○ (القیامہ:۱۷۔۱۹)

(قرآن کا یاد کرا دینا اور اس کا پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم (جبریل کے ذریعے) قرآن پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ اس کو دہرائیں۔ پھر قرآن (کے احکام) کا بیان کرنا ہمارے ذمے ہے۔)

۶۔ یہ ناممکن ہے کہ قرآن کریم حسب وعدۂ الٰہی قیامت تک محفوظ رہے مگر اس کی پیغمبرانہ شرح گم ہو جائے یا محفوظ نہ رہے۔ قرآن کریم کا دنیا میں بطور ذکر و ہدایت محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید اپنے تمام متعلقات کے ساتھ محفوظ رہے یعنی عربی زبان، عربی قواعد اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن مجید کے ساتھ تا ابد محفوظ رہے۔

۷۔ اگر بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے قرآن مجید کے علاوہ اسوۂ رسولؐ یا سنت رسولؐ کی ضرورت نہ ہوتی تو پھر نزول قرآن مجید کے لیے تیئیس (۲۳) سال کی طویل مدت غیر ضروری تھی، یہ کام چند مہینوں میں انجام پا سکتا تھا۔ آپؐ جبریلؑ سے سن کر قرآن مجید حفظ کر لیتے اور صحابہ کو مختصر عرصے میں حفظ کرا دیتے۔۔۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کا نزول بہ تدریج ہوا اور ۲۳ سال کی طویل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، کیونکہ قرآن مجید کتاب کی صورت میں ایک جامع مگر مختصر ہے لیکن جب سنت رسولؐ اور پیغمبرانہ شرح اس کے ساتھ شامل کی گئی تو یہی مختصر کتاب دینی تکمیل وتشریح کے لیے ۲۳ سال کی طویل مدت کی محتاج ہو گئی اور یہ صرف اس لیے کہ قرآن مجید کے ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زندہ رکھنا

اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔

۸۔ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس قرآن مجید سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی یعنی قرآن مجید اور صاحب قرآن دونوں پر ایمان لانا جزوِ ایمان ہے، اسی طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کے تابندہ نقوش (سنت و اسوۂ رسولؐ) کی علیحدگی ناممکن ہے۔ اس لیے ہمارا ایمان ہے کہ سنت کا انکار قرآن مجید کا انکار ہے۔

۹۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کے اصحاب کرام کی جماعت وہ مقدس جماعت ہے جو تکمیل انسانیت اور اخلاق و اعمال حسنہ کا اکمل نمونہ ہے۔ یہی وہ نفوس قدسیہ تھے جن کے سامنے وحی الٰہی نازل ہوتی رہی اور وہ رسول پاک کی زبان مبارک سے قرآن اور پیمبرانہ تشریح سنتے رہے اور انہی دو چیزوں (کتاب و سنت) کو انھوں نے اپنے اقوال و اعمال کا محور بنائے رکھا اور کتاب و سنت کی امانت جو ان کے سپرد کی گئی تھی، کمال دیانت کے ساتھ انھوں نے اپنے شاگردوں (تابعین) کو پہنچا دی۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

۱۰۔ اسلامی علوم، اسلامی تہذیب اور اسی طرح مسلم معاشرے نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنی ہم عصر قوموں کے اختلاط سے چوں کہ ایسے اثرات قبول کر لیے ہیں جن سے اسلامی تعلیمات قرن اول کی سادگی پر قائم نہیں رہیں، اس لیے مسلم معاشرے کے نظام حیات کو آج اسی چشمۂ صافی سے سیراب کیا جا سکتا ہے، جسے ہم قرن اول کی فطری سادگی کا چشمۂ حیات کہتے ہیں، یعنی اسلام کو اسی طرح سمجھا جائے جس طرح صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ دین نے سمجھا۔

ہمارا حقیقی نصب العین اللہ احکم الحاکمین کی رضا اور خوش نودی کا حاصل کرنا ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ ہم یہی سمجھتے ہیں: اللہ کے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت و محبت اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع۔

اصل اسلام

(مولانا حافظ عبداللہ روپڑی۔۔۔وفات ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء)

اسلام میں تین باتیں ہیں:

ایک یہ کہ قرآن و حدیث کا صاف فیصلہ ہوتے ہوئے مسلمان کسی کے قول یا فتوے کی رعایت نہ رکھے۔

دوسری یہ کہ اگر کسی مسئلے میں قرآن وحدیث سے فیصلہ نہ ملے تو وہاں پہلے لوگوں کے فیصلے کو اپنی رائے پر مقدم کرے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر خود قرآن وحدیث سے واقف نہ ہو تو بغیر التزام تعیین مذہب کے کسی سے مسئلہ قرآن وحدیث کا پوچھ لے۔

بس یہی اصل اسلام ہے اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے تھے اور اسی پر آپ صحابہ کو چھوڑ کر (دنیا سے) رخصت ہوئے۔

اب جتنا کوئی اس روش سے ہٹے گا' اتنا ہی حق سے دور ہوگا اور جتنا اس سے نزدیک ہوگا' اتنا ہی حق سے نزدیک ہوگا۔

❁❁❁

ساحل ہند پر اہل حدیث کا پہلا قافلہ

(مولانا محمد اسماعیل سلفی ۔۔۔ وفات ۲۰ر فروری ۱۹۶۸ء)

سب سے پہلا قافلہ جو فاتحانہ حیثیت میں ساحل ہند پر وارد ہوا' وہ اہل حدیث کا تھا۔ اس وقت گو سندھ میں اہل توحید کو وہ قوت حاصل نہیں' لیکن تاریخ کے اوراق ان کی خدمات کو نہیں بھول سکتے۔ اسی طرح مغل فاتحین بھی اسلامی سادگی اور دین فطرت کی روشنی سے زیادہ فارسی تہذیب سے آشنا تھے' اس لیے ہندوستان میں اسلامی سادگی اور کتاب وسنت کی تعلیمات کا زور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور نہ خدام حدیث کی اس قدر کثرت ہو سکی جس قدر دوسرے ممالک میں تھی۔ شیخ علی متقی صاحب کنز العمال اور شیخ محمد طاہر مولف مجمع البحار' شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں مغتنمات سے تھے۔ اکبری دور میں بعض علما نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اس وقت اہل حق کس قدر کم زور تھے' شیطانی طاقتیں کس قدر جمع ہو رہی تھیں' فتنوں کا سیلاب کتنا تباہی خیز تھا' حکومت کا لادینی جذبہ اہل حق کے لیے کتنی مصیبت کا باعث تھا۔ اعراس اور موالید کو بعض لوگوں نے اسلام کا بنیادی مسئلہ سمجھ رکھا تھا' تاہم بزرگان دین نے ان بدعات پر کڑی نکتہ چینی کی۔ غیر اسلامی رسوم اور غیر اسلامی نظریوں کے خلاف ان مجددین وقت کی پر شکوہ آواز فضائے دہر میں گونجتی رہی۔ رضی اللہ عنہم وارضاہ۔

❀❀❀

قرآن و حدیث کی تعلیم کا اصل مقصد

(مولانا محمد عطاء اللہ حنیف۔۔۔۔وفات درمیانی شب ۲'۳/اکتوبر ۱۹۸۷ء)

قرآن و حدیث کی تعلیم و تعلم کی اولیں غرض حق تعالیٰ کی معرفت کا حصول' اس کی عبادات کے طریقوں کا علم' اس کی رضا و عدم رضا کے اسباب سے واقفیت' انبیا و صلحا کے طرز زندگی کی پہچان' ملکات فاضلہ میں رسوخ پیدا کرنا' مسئلہ جزا و سزا اور اخروی فلاح و بہبود کو اپنے اعمال میں اولیں اہمیت دینا اور حقوق العباد کی نگہداشت ہوتا ہے۔ پھر علوم اسلامیہ کی نگہداشت کے بعد ان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچانا' اسلام کی داخلی فتنوں اور خارجی حملوں سے مدافعت' اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی مقتضیات میں سے ہے۔

ان ہی امور پر مشتمل علم کو قرآن مجید نے ''فقاہت فی الدین'' قرار دیا ہے اور ہر علاقے' خاندان' شہر اور گاؤں کے مسلمانوں پر بہ حیثیت مجموعی فرض گردانا ہے کہ ان میں ایک جماعت اس کے لیے وقف رہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ:۱۲۲)

(ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر قوم میں سے چند آدمی آئیں تاکہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم میں جائیں تو ان کو سمجھائیں تاکہ وہ بھی بچتے رہیں)

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کے ہر گاؤں' ہر شہر' ہر شہر کے ہر محلے' ہر بڑے خاندان' کاروبار کے ہر طبقے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کے سیکھنے سکھانے کا اہتمام کریں۔

جماعت اہل حدیث کا طرۂ امتیاز

(سید محب اللہ شاہ راشدی۔۔۔وفات ۲۱ رجنوری ۱۹۹۵ء)

جماعت اہل حدیث کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ وہ جملہ مصائب ومحن' ابتلاءات اور اتہامات سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ حق کی حمایت کرتی رہی۔اس نے اپنے تصورات واعتقادات' عبادات ومعاملات' اقتصادی اور سیاسی مسائل غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں کتاب وسنت کو پیش نظر رکھا اور اس معاملے میں قطعاً نرمی سے کام نہیں لیا اور نہ حق کے معاملے میں کسی لومۃ لائم کا خوف کھایا۔جس بات کو کتاب وسنت کی روشنی میں حق سمجھا اس کا ڈنکے کی چوٹ اظہار کیا۔حق کی راہ میں ناقابل برداشت اذیتیں جھیلیں۔ذاتی مفادات وشخصی اغراض' لالچ وطمع' حرص وہوائے نفسانی ان کو اپنے ٹھوس موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکے۔اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ جوڑا اور ان کے مقابلے میں دوسرے جتنے رشتے اور تعلقات تھے' خواہ وہ اعزہ واقربا ہی کے رشتے کیوں نہ ہوں' ان سب کو چھوڑ دیا۔ان کا اصل منشا وہی رہا جو قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ میں بیان ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (توبہ:۶۲)

یعنی مومن وہی ہیں جو ہر بات میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں۔

ماضی بعید میں صحابہ کرام کے دور کے بعد حضرت امام احمد' امام بخاری اور امام ابن تیمیہ وغیرھم کی زندگیاں ہمارے لیے درخشندہ ستاروں کی طرح ہیں اور ماضی قریب میں بھی بہت سی ایسی ہستیاں گزر چکی ہیں جن کی زندگیاں ہمارے لیے یقیناً مشعل راہ ہیں۔

جماعت اہل حدیث۔۔۔قدیم جماعت

(سید بدیع الدین شاہ راشدی۔۔۔وفات ۸/جنوری ۱۹۹۶ء)

جماعت اہل حدیث ایک قدیم جماعت ہے جس کے امام' مرشد اور قائد صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور سے آج تک یہ جماعت موجود ہے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی اپنے رسالہ ''اجتہاد و تقلید'' میں لکھتے ہیں کہ اہل حدیث تو تمام صحابہ کرامؓ تھے۔ امام عامر بن شرحبیل کی جو کبار تابعین میں سے ہیں' پانچ سو صحابہ کرامؓ سے ملاقات ہوئی۔ (تہذیب) اور وہ ۴۸ صحابہ کرامؓ کے شاگرد تھے اور ان سے احادیث روایت کرتے تھے۔ (تاریخ بغداد' تہذیب) وہ تقریباً ۳۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۰ھ کے قریب انتقال کیا۔ وہ پہلی اور دوسری صدی کے ابتدا کی شخصیت تھے۔ فرماتے ہیں:

لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَاحَدَّثْتُ اِلاَّ بِمَا اَجْمَعَ عَلَيْهِ اَهْلُ الْحَدِيْثِ. (تذکرۃ الحفاظ)

یعنی جو کچھ میرے ذہن میں ہے اور میں نے سمجھا ہے' اگر پہلے خیال میں آتا تو صرف وہ احادیث پڑھاتا جن پر اہل حدیث کا اجماع اور اتفاق ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانے میں جماعت اہل حدیث موجود تھی۔ امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) ایک دن باہر نکلے تو پکار کر کہا: اے اہل حدیث تم کہاں ہو؟۔۔۔ پھر انھیں چار سو احادیث پڑھائیں۔ (تذکرہ) حنفی مذہب کے رکن عظیم امام محمد بن حسن شیبانی (متوفی ۱۸۹ھ) اپنی

مشہور کتاب الموطا صفحہ ۳۶۳ باب الیمین مع الشاھد میں فرماتے ہیں:

فَكَانَ ابْنُ الشِّهَابِ اَعْلَمَ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ بِالْمَدِيْنَةِ مِنْ غَيْرِهٖ فِيْهَا.

یعنی امام ابن شہاب زہری مدینہ منورہ کے اہل حدیث کے نزدیک سب سے زیادہ عالم تھے۔

واضح ہو کہ اس وقت یعنی دوسری صدی میں مدینہ طیبہ جماعت اہل حدیث کا مرکز تھا۔ حنفیت کے دوسرے رکن قاضی ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) ایک دن باہر نکلے اور انھوں نے اہل حدیث کو دیکھ کر فرمایا:

زمین پر تم سے بہتر کوئی نہیں، کیوں کہ تم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنتے اور سیکھتے ہو۔

امام حفص بن غیاث (متوفی تقریباً ۱۹۴ھ) فرماتے ہیں "خیر اھل الدنیا" یعنی پوری دنیا میں بہترین جماعت اہل حدیث ہے۔ ابوبکر بن عیاش (متوفی تقریباً ۱۷۰ھ) فرماتے ہیں "انھم خیر الناس" یعنی سب سے بہتر لوگ یہی ہیں۔ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم)

حرف آغاز

برصغیر میں کتاب وسنت کو اپنے لئے لائق اتباع قرار دینے والے سرفروشوں کا گروہ تمام تر مسلکی گروہوں میں سب سے زیادہ مظلوم رہا ہے۔ ہر کسی نے انہی پر مشق سخن فرمانے کی کوشش کی ہے۔ بڑے سے بڑے اعتدال پسند ذہنوں کا ذوق بھی اہل حدیث کے معاملے میں بدذوقی کا شکار ہوا۔ اہل حدیث کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا گیا، اگر کوئی متجسسانہ نقطہ نظر سے اسے یکجا کرنے کی کوشش کرے تو کئی مجلدات تیار ہو جائیں۔ یہی وہ گروہ تھا جس پر اہل اسلام نے اپنی مساجد کے دروازے بند کر دیئے۔ عاشقان رسول نبی کریم ﷺ کا اسوہ بھول بیٹھے۔ انہوں نے سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف سے نجران کے صلیبیوں کے لئے مسجد نبوی کے دروازے کھولنے کو فراموش کر دیا اور اہل حدیث کے درپے ہو گئے۔ مساجد کے باہر لکھ دیا گیا کہ اس مسجد میں وہابی یعنی اہل حدیث کا داخلہ منع ہے۔ اگر کوئی قسمت کا مارا بھول کر ان کی عبادت گاہوں میں چلا جاتا تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو بھوکے بھیڑیے معصوم بھیڑوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ کوئی خوش نصیب ہی ایسا ہوتا کہ اسے صرف مسجد سے نکالنے پر اکتفا کیا جاتا۔ اسے مسجد سے نکال کر مسجد دھوئی جاتی اور بسا اوقات صفوں کو نذر آتش کر دیا جاتا تاکہ مسجد کی پاکیزگی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

کیا اعلیٰ حضرت اور کیا ادنیٰ حضرت، سبھی کی خوش کلامی اور شیریں گفتاری کا محور اہل حدیث تھے۔ لیکن اہل حدیث کا جرم کیا تھا صرف یہ کہ وہ کسی کو ایک امام کی تقلید کی دعوت نہیں دیتے تھے۔ ذہنی وفکری آزادی کی دعوت دیتے تھے اور صرف اور صرف دامن محمد ﷺ سے وابستہ ہونے کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ اس آزاد روی کا سب سے زیادہ نقصان ان عناصر کو تھا جن کی زندگیوں کا مقصد لوگوں کو جھوٹے سچے قصوں میں الجھانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حالانکہ اہل حدیث کی دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی بلکہ یہ تو خیر القرون کی فکری اساس کا پرتو تھی۔ لیکن ان درویشوں اور اللہ والوں کو راہ حق میں جن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا، کم از کم برصغیر کی مذہبی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اہل حدیث کے خلاف سب سے زیادہ اس بات کو اچھالا گیا کہ یہ گروہ تو فقط ڈیڑھ سو برس کی پیداوار ہے، درود کا منکر اور نبی کریم ﷺ کا گستاخ ہے۔ افسوس بے شمار اصحاب جبہ ودستار محض فکر معاش کی خاطر خوف خدا سے اس قدر بے گانہ ہو گئے کہ ان کے نزدیک توحید خالص کی دعوت گستاخیٔ رسول قرار پائی۔ ان کی نگاہوں میں حریت فکر کے ان مجاہدین کی انگریزی استعمار کے خلاف

قربانیوں کی بھی کوئی قدر نہ رہی۔ زیادہ افسوس ان بھائیوں پر ہے کہ جن کے اسلاف حضرات شہیدین کی پاکیزہ تحریک میں اہل حدیث کے ہم رکاب تھے۔ لیکن انھوں نے چند فروعی مسائل کو اس قدر اچھالا کہ منزل کھوگئی۔ سیّد بادشاہ کی شہادت کے بعد تحریک مجاہدین کی قیادت کی سعادت اہل صادق پور کے حصے میں آئی۔ لیکن محض ان کی سلفیت کی بنا پر برادران احناف اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئے۔ اس حد تک دور ہوئے کہ واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ داستان ہے، جس کا یہ محل نہیں۔

محترم المقام جناب محمد اسحٰق بھٹی حفظہ اللہ کی یہ کتاب شائع کرتے ہوئے ہمارے دل مسرت سے لبریز ہیں۔ تاریخ اہل حدیث سے محبت ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ والدگرامی قدر جناب مولانا عبدالخالق قدوسی شہید کا یہ خاص موضوع تھا۔ وہ ذہنی طور پر تاریخ اہل حدیث کی ترقیم کا خاکہ تیار کر چکے تھے۔ لیکن 23 مارچ 1987ء کے حادثہ لاہور میں انہیں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس طرح یہ کام آگے نہ بڑھ سکا اور ہمارے اہل قلم پر ہمارے مسلک کا یہ قرض جوں کا توں رہا۔ اب محترم بھٹی صاحب نے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہم اس پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کے لیے دعا گو ہیں۔ ان شاء اللہ اس کتاب سے اہل حدیث کے متعلق ان بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا جن کا عام مسلمان شکار ہیں۔ جہاں تک علماء کا تعلق ہے، ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ جب بھی اپنے ذاتی وگروہی مفادات کی سطح سے بلند ہو کر اہل حدیث کے بارے میں سوچیں گے، یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ تو خالص اسلام کی دعوت ہے، جس کا مرکزی نقطہ شافع روز محشر ﷺ کی بلاشرکت غیرے اطاعت وفرمانبرداری ہے۔

آخر میں اپنے واجب الاحترام بزرگ اور جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کی لجنۃ القارۃ الھند یہ سے منسلک جناب عارف جاوید محمدی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا ہمیں موقع دیا۔ دعا ہے اللہ رب العزت امت مسلمہ میں گروہی نفرتوں اور فرقہ وارانہ آویزشوں کو ختم فرمائیں اور ہمارے دل ایک دوسرے کے لئے نرم فرمادیں۔ اللہ رب العزت اس کتاب کی اشاعت کے بدلے میں ہماری حسنات میں اضافہ فرمائیں اور سیئات سے درگزر فرمائیں۔

آمین یارب العالمین۔

ابوبکر قدوسی

14 نومبر 2003ء

سخن ہائے گفتنی

مولانا عبدالخالق محمد صادق (کویت)

تاریخ نویسی ایک عظیم فن:

اقوام وملل اور تحریکات کی زندگی میں عہد رفتہ کے تجارب اور ان کے اسلاف کی تاریخ سنگ میل اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندہ قومیں اپنی تاریخ کو پیش نگاہ رکھ کر اپنے ماضی کی روشنی میں اپنے مستقبل کی تعمیر کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے ''تاریخ'' ایک عظیم فن ہے جس کے اصول وقواعد اور ایک مؤرخ کی حیثیت وفرائض سے شناسائی از بس ضروری ہے' بالخصوص ایسے دور میں جب حقائق سے چشم پوشی کرکے تاریخ نویسی کے بجائے تاریخ سازی کا رواج عام ہو چکا ہو تو اس فن کی عظمت اور اس کے تقدس کو اجاگر کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

تاریخ کا مفہوم:

لفظ ''تاریخ'' کے ماخذ اور اشتقاق میں علمائے لغت کی مختلف آراء ہیں:

ا۔ لفظ تاریخ عربی الأصل ہے اور وقت کی تعیین کے لیے مستعمل ہے۔

چنانچہ علامہ جوہری لکھتے ہیں

"التاريخ تعريف الوقت والتوريخ مثله' يقال: أرخت الكتاب وورخت"

یعنی تاریخ کا لفظ وقت کی پہچان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ ہمزہ یعنی ''تاریخ'' اور واؤ یعنی ''توریخ'' دونوں طرح استعمال کیا جاتا ہے مثلاً: "أرخت الكتاب وورخت الكتاب". (الصحاح مادہ أرخ: 418\1)

علامہ سخاویؒ فرماتے ہیں:

''التوریخ'' واؤ کے ساتھ بنوتمیم اور ''التأریخ'' ہمزہ کے ساتھ بنوقیس کی لغت ہے اور اس کی جمع ''تواریخ'' آتی ہے۔

علامہ سخاویؒ کا فرمان ہے:

''یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تاریخ عربی لفظ ہے، فارسی سے معرب نہیں ہے کیونکہ بنو تمیم اور قیس دونوں خالص عربی قبیلے ہیں۔(الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ: ص6)

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ لفظ ''تاریخ'' غیر عربی لفظ ہے' جیسا کہ ''نور المقاییس'' میں ہے:

"وتاريخ الكتاب ليس عربيا و لا سمع من فصيح"

یعنی لفظ تاریخ عربی نہیں ہے اور نہ فصیح اللسان عربی سے سنا گیا ہے۔

پھر اس کی اصل میں مختلف آراء ہیں:

۱۔ لفظ ''تاریخ'' اصل میں سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی شہر (یعنی مہینے) کے ہیں۔

۲۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو بعد میں عربی میں مستعمل ہونے لگا اور اس کے معنی ہیں ''ماہ و روز'' یعنی دن اور مہینے۔

۳۔ علامہ جوالیقی کہتے ہیں: ''التاریخ'' غیر عربی کلمہ ہے جو کہ ''أرخ'' سے ماخوذ ہے اور یہ نیل گائے کے نومولود مادہ بچے کو کہا جاتا ہے اور تاریخ کو بھی اس کے حدوث کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ''تاریخ'' کہا جاتا ہے۔(مقدمة الشماريخ فی علم التاریخ: ص12)

تاریخ کا اصطلاحی مفہوم:

بحیثیت فن ''تاریخ'' کا اصطلاحی مفہوم متعین کرتے ہوئے اہل علم نے مختلف عبارات میں ''فن تاریخ'' کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ مفتاح السعادۃ میں ہے:

"وعلم التاريخ هو معرفة أحوال الطوائف وبلدانهم ورسومهم وعاداتهم وصنائع أشخاصهم وأنسابهم ووفياتهم الى غير ذلك".

یعنی لوگوں کے احوال وظروف' ان کے جغرافیائی پس منظر' ان کی رسوم وعادات اور شخصیات کے کارہائے نمایاں اوران کے انساب ووفیات وغیرہ سے آ گاہی حاصل کرنے کا نام ''تاریخ'' ہے۔(علم التاریخ عند المسلمین: ص 26)

علامہ مقریزی(م۸۴۵ھ)فرماتے ہیں

''الاخبار عما حدث فی العالم فی الزمان الماضی''

یعنی عہد رفتہ میں عالم دنیا کے اندر پیش آمدہ وقائع واحداث کی خبر دینے کو تاریخ کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر امین مصری لکھتے ہیں

''التاریخ هو طریقة بحث تقوم علی النقد والمقابلة وتحقق وزن قیم الا دلة وربط السبب بالنتیجة مع التعلیل للحوادث وار جائها الی دوا افعها''.(لمحات فی التربیة: ص228)

یعنی تاریخ وہ طریقہء بحث ہے جس کا دارومدار تحقیق وتنقید' حالات کے تجزیے اوروقائع وحوادث کو ثابت کرنے والے دلائل' وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے اسباب ووجوہ اوراحوال وظروف اوراسباب ونتائج کے باہم مربوط کرنے پر ہے''۔

مذکورہ بالاتعریفات پرغور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرایک معرف نے اپنے ایک خاص نقطۂ نظر کے پیش نظر تاریخ اورفن تاریخ کا مفہوم پیش کیا ہے۔ کسی نے موضوع کو سامنے رکھا اور کسی نے کرداروں کو ملحوظ رکھ کر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور کسی نے صرف تاریخ نویسی کو مدنظر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری نظر میں مختصر اور جامع تعریف علامہ محمد بن سلیمان الکافیجی نے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''هوعلم یبحث فیه عن الزمان وأحواله وعن أحوال ما یتعلق به من حیث تعیین ذلک وتوقیته'' (المختصر فی علم التاریخ ص:723)

یعنی تاریخ وہ علم ہے جس میں زمانہ اور اس میں پیش آمدہ حالات اور ان سے متعلق کرداروں کے احوال وتعیین اور وقائع واحداث کی توقیت پر بحث کی جاتی ہے۔

علم تاریخ کا موضوع:

مذکورہ تعریفات سے واضح ہے کہ علم تاریخ کا موضوع انسان وزمان اور ان سے متعلقہ واقعات واحداث ہیں۔ چنانچہ مفتاح السعادۃ میں ہے:

"وموضوعه:أحوال الاشخاص الماضية من الانبياء والا ولياء والعلماء والحكماء والشعراء والملوك والسلاطين وغيرهم".

(مفتاح السعادة: 250/1)

یعنی تاریخ کا موضوع ماضی کی شخصیات حضرات انبیاء علیہم السلام' اولیا وعلماء' حکماء وشعراء اور ملوک وسلاطین ایسی اہم شخصیات کے احوال وسوانح حیات ہے۔

علامہ سخاویؒ نے انتہائی مختصر اور جامع الفاظ میں تاریخ کا موضوع بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"وأما موضوعه: فالا نسان والزمان" (الاعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ: ص 7)

یعنی تاریخ کا موضوع انسان اور زمان ہے۔

یہ دو اساسی عنصر ہیں' باقی ان کے توابع ومتعلقات ہیں۔

علم تاریخ کی اہمیت:

جہاں تک علم تاریخ کی فضیلت واہمیت کا تعلق ہے تو وہ اسی سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے ایک ثلث میں اللہ رب العزت نے سابقہ امم کی تاریخ اور انبیاے کرام علیہم السلام اور ان کی اقوام کے احوال واطوار کا تذکرہ فرمایا ہے۔ احادیث پاک کے بھی ایک گراں قدر حصے میں سابقہ امم کے کردار اور طرز عمل پر بحث کی گئی ہے' (جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں)۔ چنانچہ شیخ عبدالواسع بن یحیٰ فرماتے ہیں:

"فان علم التاريخ علم جليل القدر شهدت بفضله الآيات والاخبار وأعتنى بنقله الاثبات والاخيار وأنفقوا فى ذلك نفائس الاعمار". (الاستبصار:ص3)

یعنی بلاشبہ علم تاریخ وہ عظیم الشان علم ہے جس کی فضیلت پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ شاہد ہیں اور ثقات وحفاظ علمائے کرام اور اہل صلاح نے اس پر خصوصی توجہ دیتے ہوے اپنا قیمتی سرمایہء حیات اس میں صرف کر دیا۔

علامہ القرمانی کہتے ہیں

"وانه لم يخل من التواريخ كتاب من كتب الله المنز لة فمنها ماورد باخباره المجملة ومنها ماورد باخباره المفصلة" (مقدمة الشماريخ فى علم التاريخ :ص 11)

یعنی اللہ تعالٰی کی نازل کردہ کتب میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں مجمل یا مفصل طور پر سابقہ امم کے اخبار واحوال اور تاریخ نہ بیان کی گئی ہو۔

تاریخ نویسی میں علوم قرآن وسنت کی تاثیر اور ان کے پیش کردہ رہنما اصولوں کی افادیت واہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس سلسلے میں محدثین کرام کی مساعی جمیلہ قابل صد تحسین ہیں کہ جنھوں نے تعلیمات کتاب وسنت کی روشنی میں اس عظیم الشان علم کو جلا بخشی اور کتب تواریخ وسیر وسوانح اور کتب جرح وتعدیل اس کی شاہد عدل ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ تاریخ نویسی کس قدر مہتم بالشان اور مقدس فن ہے اور دیانت وامانت اس کی اساس وبنا ہے۔

مؤرخ کی شخصیت:

تاریخ نویسی چوں کہ انتہائی زمہ دارانہ اور حساس فن ہے جس کا تعلق براہ راست شخصیات واقوام کی سیر واحوال سے ہے' اس لیے مؤرخ کو چاہیے کہ انتہائی دیانت داری اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ وقائع نگاری کرے۔ کیوں کہ قلم کی ذرہ سی جنبش اور لغزش سے دعا' دغا' محرم' مجرم اور تخت سے تختہ بن جاتا ہے۔ نیز بلا تحقیق روایات کو ذکر کرنا اور حقائق کو مسخ

کر کے پیش کرنا ایک مؤرخ کے فرائض منصبی کے منافی اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔ اس طرح حقوق غصب ہوتے' جھوٹ رواج پاتا اور اقوام وملل کے ساتھ دغابازی فروغ پاتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی تعلیمات سے واضح ہے کہ جب بھی کسی قوم نے تاریخی حقائق سے چشم پوشی کر کے تاریخ سازی کی کوشش کی تو فوراً قرآن کریم نے ان کی تردید کردی' جیسا کہ جب یہود ونصاریٰ نے دعویٰ کیا:

﴿نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّآءُ هٗ﴾(المائدة: 18)

(ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔)

تو قرآن کریم نے فرمایا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾(المائدة:18)

(اے نبی! ان سے فرمایئے، پھر اللہ تعالیٰ تمھارے گناہوں کے سبب تمھیں عذاب کیوں کرے گا؟ بلکہ (اصل معاملہ یہ ہے کہ) تم بھی دوسروں کی طرح اللہ کے پیدا کردہ بشر ہو۔)

اور جب یہود ونصاریٰ اور مشرکین مکہ نے اپنی اپنی جگہ پر ملت ابراہیمی پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کیا تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کی فوراً تردید کر کے حقائق کو منکشف کردیا۔ ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (آل عمران: 67)

(ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی' وہ تو خالص اللہ کے فرمانبردار تھے اور مشرکین سے بھی نہیں تھے۔)

لہٰذا مؤرخ کے فرائض میں جہاں صحیح تاریخ نگاری شامل ہے وہاں تاریخ کے مسخ شدہ حقائق سے آگاہ کرنا اور تاریخ کے چہرے سے غبار کو صاف کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں:

"يشترط فی المورخ أن تتو فر فيه العدالة مع الضبط التام

والتحری فی العادات وعدم المداهنة للممدوح واللمز واستخدام الاشارات الخفیفة لشخص یبغضه بسبب منافسة فی رتبة أو اختلاف فی رأی أو نحو ذلک"(الاعلان والتوبیخ عن ذم التاریخ: ص ۴۸۲)

یعنی مؤرخ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عادل ہو،اس کا حافظہ اور یادداشت قوی ہو اور وہ لوگوں کے عرف وعادات سے واقف ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ کسی سے تعلق یا عقیدت کی وجہ سے اس کی مدح میں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لے اور نہ اختلافِ رائے اور معاصر وہم مرتبہ ہونے کی بنا پر اپنے مخالف کی تفضیح اور اشاروں وکنایوں سے اس کا استہزا کرے"۔

تحریک اہل حدیث:

اہل حدیث مسلک اس تحریک وطرز فکر کا نام ہے جو تعلیمات نبوت سے پیدا ہوا' یہ ایک نظریاتی اور اصلاحی تحریک ہے جو امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے فرامین کی روشنی میں صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ سے چلی آتی ہے۔ دوسرے لفظوں یوں کہیے کہ تحریک اہل حدیث اسی وقت سے ہے جب سے حدیث مصطفیٰ ﷺ ہے اور اس کا نصب العین "أطیعوا الله و أطیعوا الرسول" کی دعوت اور بدعات ومحدثات کی تردید ہے۔

ایک دیرینہ خواہش تھی کہ برصغیر میں اس جماعت حقہ اور طائفہء منصورہ کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت خدمات کو دلنشیں انداز اور حسین پیرایۂ بیان میں مرتب کر کے ملت اسلامیہ کی خدمت میں پیش کیا جائے تاکہ وہ کتاب وسنت کی تعلیمات پر مبنی اسلام کی اس اولیں تحریک کے اصل حقائق سے روشناس ہوں اور اس جماعت حقہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں' ان غلط فہمیوں کو لوگوں کے ذہنوں سے نکال کر انہیں صحیح معلومات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ بالخصوص گزشتہ دنوں میں جب بعض لوگوں کی طرف سے قدامت اہل حدیث پر آوازے کسنے کی صدائے دلخراش بار بار سمع خراشی کرنے لگی کہ جن میں سے ایک گروہ نے اپنا صد سالہ اور ایک گروہ نے ڈیڑھ صد سالہ جشن منایا ہے تو اس

ضرورت کو اور زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا کہ ناواقف مسلمانوں کو حقیقت ثابتہ اور حقائق اصلیہ سے باخبر کرنا اب تو لازم اور واجب ہو گیا ہے۔

اب چند الفاظ مصنف کے بارے میں:

چناں چہ احباب گرامی قدر کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس کے لیے محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کو تکلیف دی جائے۔ وہ ایک منجھے ہوئے مصنف اور منصف مزاج صاحب قلم ہیں' تاریخ نویسی میں ان کے اشہب قلم کی روانی مشہور ہے اور وہ تمام علمی حلقوں میں معروف اور یکساں مقبول ہیں' ان کے بارے میں ان کی کتاب "نقوش عظمت رفتہ" کے ناشر نے بجا فرمایا ہے:

"بھٹی صاحب ایک خاص فقہی مسلک کے حامی ہیں جسے مسلک اہل حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے' لیکن ان کی وسعت قلب ملاحظہ ہو کہ وہ ہر مسلک کے اہل علم کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور واضح الفاظ میں ان کی خوبیوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں' جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ وسعت قلب موجودہ دور کے کسی اور مسلک کے اہل علم کے حصے میں نہیں آئی"۔

جب احباب سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی کہ تاریخ اہل حدیث کے لیے بھٹی صاحب کے ہم پلہ تاریخ دان اور مؤرخ جماعت میں کوئی اور نظر نہیں آتا' اس لیے بقول شاعر:

تمتع من شميم عرار نجد

وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں پہلی فرصت میں جناب بھٹی صاحب سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھائیں۔ اس خواہش کا اظہار تھا کہ محسوس ہوا کہ احباب کرام تو مجھ سے بھی کہیں پہلے سے اس آرزو اور خواہش کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ برادر مکرم و محترم مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ نے تو احباب کی اس آرزو کو عملی جامہ پہنانا گویا اپنے اوپر فرض قرار دے لیا اور یہ پروگرام عملی طور پر شروع

کر دیا۔

اللہ تعالیٰ لجنۃ القارۃ الہندیہ کے مدیر الشیخ ابو خالد فلاح المطیری حفظہ اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ جب ان کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو انھوں نے اس پر صاد کرتے ہوئے ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ تمام احباب شکریے کے مستحق ہیں جن کے ہمہ قسم تعاون سے تاریخ اہل حدیث کی پہلی جلد انتہائی حسین وجمیل پیرائے میں معلومات کا بیش بہا ذخیرہ اپنے دامن میں لیے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ آپ اس کی حسن وخوبی کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں: ع

خوشبو آں باشد کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

اس جلد میں بھٹی صاحب نے تحریک اہل حدیث کے تعارف' عقائد ونظریات اور قدامت مسلک اہل حدیث اور برصغیر میں تحریک اہل حدیث کی آمد پر انتہائی منصفانہ اور بجے تلے انداز میں بحث کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل ورحمت سے بھٹی صاحب کو صحت وعافیت کے جلو میں بقیہ کام کی تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس کار خیر کو ان کے لیے اور اس عمل جلیل میں کسی طرح سے بھی تعاون کرنے یا دلچسپی رکھنے والوں کے لیے صدقہ ء جاریہ بنائے۔ آمین۔

عبدالخالق محمد صادق

فاضل مدینہ یونیورسٹی

داعیہ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی

دولۃ الکویت

اہل حدیث اور ان کا شرف و امتیاز

حافظ صلاح الدین یوسف۔لاہور

برصغیر پاک وہند میں تحریک عمل بالحدیث کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟ یہ تو خاصا لمبا موضوع ہے جس کی کچھ تفصیل زیرنظر کتاب میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ تاہم اسے زیادہ فروغ تیرھویں صدی ہجری کے اوئل میں ملا، جس میں امیر الملک نواب صدیق حسن خاں، شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہم کی مساعی حسنہ کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ نواب صاحب نے عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں تقریباً ہر موضوع پر کتابیں تحریر فرمائیں اور متعدد اہم کتابیں (فتح الباری وغیرہ) اپنے خرچ پر طبع کرا کے تقسیم بھی کیں، یوں وہ مجدّد العلوم کے مصداق ٹھہرے۔ میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک مسند حدیث بچھائے رکھی جس سے عرب وعجم کے ہزاروں افراد نے کسب فیض کیا اور پھر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں قرآن وحدیث کا چشمہ صافی جاری کیا۔ یوں حضرت ممدوح کی تدریس حدیث اور ان کے فیض یافتگان کی مساعی سے تقلید وجمود کے بندھن ٹوٹے اور رسم ورواج کی زنجیریں ڈھیلی ہوئیں۔ مولانا بٹالویؒ نے ''اشاعۃ السنۃ'' کے ذریعے سے اہل حدیث صحافت کا آغاز کیا۔ ان کے خاراشگاف قلم نے ایک طرف نیچریت اور

مرزائیت پر خوب خوب ضربیں لگائیں تو دوسری طرف مقلدین جامدین سے بھرپور ٹکر لی۔ اس سے بھی سلفی تحریک کو بڑی تقویت ملی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے بہ یک وقت کئی محاذوں پر چوکھی جنگ لڑی۔ وعظ وتبلیغ، تصنیف وتالیف، ہفتہ واری صحافت اور مناظرہ و مباحثہ ہر ہر میدان میں خوب خوب کام کیا۔ یوں فرق ضالہ کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ ان سب حضرات کی مختلف النوع خدمات اور سرگرمیوں سے سلفی فکر کو فروغ ملا۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ

اور ان سے پہلے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد نے بھی اس میدان میں خوب کام کیا، جس سے بدعات کا زور ٹوٹا، بہت سی رسوم کا خاتمہ ہوا اور عمل بالحدیث کا جذبہ لوگوں میں عام ہوا۔ اور جہاد کا وہ سبق بھی امت نے دوبارہ پڑھا جسے اسی طرح فراموش کر دیا گیا تھا، جیسے فقہ کے مقابلے میں حدیث کو متروکات سخن میں شمار کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ وقت کے ایک عظیم محقق اور مشہور سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندویؒ اس سلفی تحریک اور اس کے اثرات ونتائج کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اس تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانے سے آج تک ہمارے دور ادبار کی ساکن سطح میں اس سے جو جنبش ہوئی، وہ بھی ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائق شکریہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھاری گئی، قرآن پاک کی تعلیم وتفہیم کا آغاز ہوا، قرآن پاک سے براہ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا، حدیث نبویؐ کی تعلیم وتدریس اور تالیف واشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی (یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں) لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباع نبوی کا جو جذبہ کم ہو گیا تھا وہ سالہا سال تک کے لیے دوبارہ پیدا ہو گیا۔ مگر افسوس ہے کہ اب وہ بھی جا رہا ہے۔ اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ ''جہاد'' جس کی آگ اسلام کے مجمر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پابجولاں دریائے شور عبور

کر دیے گئے یا تنگ کوٹھڑیوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔

اس تحریک کی بنیاد تین چیزوں پر تھی۔

(۱) نصب امارت

(۲) زکوٰۃ کی مرکزیت

(۳) اسلام سے تمام بیرونی اثرات کو مٹا کر اس کو پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹانا۔

علمائے اہل حدیث کی تدریسی و تصنیفی خدمت بھی قدر کے قابل ہے۔ پچھلے عہد میں نواب صدیق حسن خان مرحوم کے قلم اور مولانا سید محمد نذیر حسین دہلوی ؒ کی تدریس سے بڑا فیض پہنچا۔ بھوپال ایک زمانے تک علمائے حدیث کا مرکز رہا۔ قنوج، سہسوان اور اعظم گڑھ کے بہت سے نامور اہل قلم اس ادارے میں کام کر رہے تھے، شیخ حسین عرب یمنی ان سب کے سرخیل تھے اور دہلی میں مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب کی مسند درس بچھی تھی اور جوق در جوق طالبین حدیث مشرق و مغرب سے ان کی درس گاہ کا رخ کر رہے تھے۔ ان کی درس گاہ سے جو نامور اٹھے ان میں سے ایک مولانا ابراہیم صاحب آروی تھے جنھوں نے سب سے پہلے عربی تعلیم اور عربی مدارس میں اصلاح کا خیال قائم کیا اور مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس درس گاہ کے دوسرے نامور مولانا شمس الحق صاحب مرحوم (صاحب عون المعبود) ہیں جنھوں نے کتب حدیث کی جمع و اشاعت کو اپنی دولت اور زندگی کا مقصد قرار دیا اور اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس درس گاہ کے ایک اور نامور تربیت یافتہ ہمارے ضلع (اعظم گڑھ) میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم مبارک پوری تھے جنھوں نے تدریس و تحدیث کے ساتھ ساتھ جامع ترمذی کی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' (عربی) لکھی۔

اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مدت کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا اور یہ جو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے، رفع ہو گیا اور لوگ از سر نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے، قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی اور قیل و قال کے مکدر گڑھوں کی بجائے حدیث کے اصلی چشمۂ مصفی کی طرف واپسی ہوئی۔''

(مقدمہ "تراجم علماے حدیث ہند" مولفہ امام خاں نوشہروی مرحوم' ص ۳۱-۳۳)

مولانا مناظر احسن گیلانی' جو ایک متصلب حنفی عالم اور مصنف تھے' انھوں نے بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی مفصل سوانح۔ سوانح قاسمی۔ بھی لکھی ہے' وہ بھی تحریک اہل حدیث کی بابت یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

"اس کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اپنے دین کے اساسی سرچشموں (قرآن وحدیث) کی طرف توجہ ہندوستان (متحدہ) کے حنفی مسلمانوں کی جو پلٹی' اس میں اہل حدیث اور غیر مقلدیت کی اس تحریک کو بھی دخل ہے۔ عمومیت غیر مقلد تو نہیں ہوئی' لیکن تقلید جامد اور کورانہ اعتماد کا طلسم ضرور ٹوٹا۔" (ماہنامہ "برہان" دہلی' اگست ۱۹۵۸ء)

ایک اور مضمون نگار مولانا سید رشید احمد ارشد استاذ عربی جامعہ کراچی ہیں' انھوں نے "ہندو پاکستان میں علم حدیث" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں وہ تحریر کرتے ہیں۔

"آخری زمانے میں حدیث کی تدریس واشاعت سے ہندوستان میں اہل حدیث کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا تھا جو ائمہ کی تقلید کی مخالفت کرتا تھا' اس کی وجہ سے حنفی علما میں بھی کتب حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور وہ فقہی مسائل کو احادیث کی روشنی میں ثابت کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اس طرح اس فرقے کا وجود علم حدیث کی ترقی کا باعث بنا۔" (ماہنامہ "البلاغ" کراچی۔ ترجمان دارالعلوم کراچی۔ ذوالحجہ ۱۳۸۷ء۔ جلد اول' شمارہ ۱۲' ص ۲۵)

مذکورہ اقتباسات سے واضح ہے کہ۔

- ☆ عمل بالحدیث کی تحریک سے متحدہ ہندوستان میں تقلید و جمود کے بندھن ڈھیلے ہوئے اور کورانہ اعتماد کا طلسم ٹوٹا۔
- ☆ تحقیق واجتہاد کا دروازہ کھلا اور فقہی مسائل کی چھان بین کا شوق پیدا ہوا۔
- ☆ بہت سی بدعات کا خاتمہ ہوا اور رسوم ورواج کے بت ٹوٹے۔
- ☆ تحریک کی ہمہ گیریت اور غلغلے نے اپنوں اور بیگانوں سب کو متاثر کیا۔

☆ حدیث کی خدمت اور اس کی نشر و اشاعت کا ذوق عام ہوا۔
☆ فقہی اقوال و آرا کو قرآن و حدیث کے دلائل سے مزین اور محقق کرنے کا احساس پیدا ہوا۔

برصغیر پاک و ہند میں مذکورہ ثمرات' اس جماعت کی ہمہ جہتی مساعی کے نتیجے میں حاصل ہوئے جو فکر و مسلک محدثین کی حامل اور ان کے علم کی وارث تھی۔ اس جماعت نے محدثین ہی کی طرح کسی لگاؤ اور فقہی و حزبی تعصب کے بغیر حدیث پر عمل کرنے کے جذبے کا احیا کیا۔ مخالفین اور معاندین نے اس جماعت حقہ اور طائفۂ منصورہ کو ایک نئے فرقے سے تعبیر کیا اور اس کے جذبۂ عمل بالحدیث کو (نعوذ باللہ) فتنہ انگیزی ٹھہرایا' حالاں کہ یہ کوئی نیا فرقہ نہیں تھا بلکہ اس فکر و عمل کا ایک تسلسل تھا جو تقلیدی فرقوں کے ظہور سے پہلے عہد صحابہ سے چلا آرہا تھا۔ ہندوستان میں بے عمل مسلمان بادشاہوں اور مذہب کے نام پر صوفیا اور جامد فقہا نے اصل دین سے عوام کو دور رکھا ہوا تھا' اس لیے جب سلفی تحریک کے ذریعے سے اصل دین اجاگر ہوا' سنتوں کا احیا عمل میں آیا اور توحید کی ضیا پاشیوں نے دلوں کو منور کیا تو انھوں نے ان عاملان دین متین اور وارثان رسول امینؐ سے عوام کو بدظن کرنے اور اپنے حلقہ ارادت کے لوگوں کو ان سے دور رکھنے کے لیے اس جماعت کو ایک نیا فرقہ باور کرانے کی مذموم سعی کی جو یکسر خلاف واقعہ بات تھی۔ حقیقت میں یہ جماعت اس نبوی پیش گوئی کی مصداق ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے۔

لاتزال من امتی امة قائمة بامرالله لا یضر هم من خذلهم ولا من خالفهم حتی یاتی امرالله وهم علی ذلک. (صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب ۲۸' حدیث ۳٦٤١۔ صحیح مسلم' الامارة' باب ٥٣۔ حدیث ١٩٢٠)

''میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم (صحیح دین) پر قائم رہے گا' اس کو چھوڑنے والا اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا' نہ اس کی مخالفت کرنے والا' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے گا۔ (یعنی قیامت برپا ہوجائے گی) اور وہ اسی (صحیح

دین) پر ہوگا۔"

یہ امت قائمہ' پہلے پہل صحابہ کرام کی شکل میں تھی' پھر تابعین اور تبع تابعین اس کا مصداق بنے' ان کے بعد وہ محدثین جنھوں نے جمع وتدوین حدیث کا نہایت عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا' اس معیار پر قائم رہے۔ ان کے بعد آج تک یہ گروہ کسی نہ کسی انداز میں قائم چلا آ رہا ہے' جس نے ہر دور میں اتباع سنت کی وہ مشعل فروزاں رکھی جس کے اولین علم بردار صحابہ کرام تھے۔ متحدہ ہندوستان میں یہ سعادت اہل حدیث کے حصے میں آئی کہ وہ اس مسلک ومنہج کو زندہ کریں اور زندہ رکھیں جو صحابہ وتابعین کا تھا۔ اس دور میں تقلید کا نام ونشان نہ تھا' اس لیے تقلید سے وابستگی کو لازمی قرار دینے والے اور ائمہ کے اقوال وآرا کو نصوص کے مقابلے میں ترجیح دینے والے اس امت قائمہ کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اس کے صحیح اور اصل مصداق صرف وہی لوگ ہوں گے جن کی عقیدت ومحبت کا مرکز اور اطاعت واتباع کا محور صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپؐ کے اقوال وافعال اور تقریرات ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جو آج اصحاب الحدیث' اہل الحدیث اور السلفیون وغیرہ ناموں سے عالم اسلام میں متعارف اور موجود ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا' باقی سب جہنمی۔ اور اس جنتی فرقے کی نشانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے جو ماانا علیه و اصحابی۔ "میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر چلنے والا ہوگا۔" (سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب شرح السنه' رقم ٤٥٩٦ ۔ سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء افتراق هذه الامة وقد حسنه الترمذی فی بعض النسخ واقره الالبانی فی شرح عقیدة الطحاویة' رقم الحدیث ٢٦٣)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اہل الحدیث کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کس خوبی کے ساتھ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(۱) "فهم اعلم الا مة بحديث الرسول و سير ته ومقاصده واحواله ونحن لا

نعنی باھل الحدیث المنتصرین علیٰ سماعته او کتابته اور روایته بل نعنی بھم کل من کان احق بحفظه ومعرفته وفھمه ظاھراً وباطنا واتباعه باطنا وظاھراً وکذلك اھل القرآن۔

وادنی خصلة فی ھؤلاءِ محبة القرآن والحدیث والبحث عنھما وعن معانیھما' والعمل بم علموہ من موجبھما ففقھاء الحدیث اخبر بالرسول من فقھاء غیرھم' وصوفیتھم اتبع للرسول من صوفیة غیر ھم وامراء ھم احق بالسیاسة النبویة من غیرھم وعامتھم احق بموالاۃ الرسول من غیر ھم۔"

(مفصل الاعتقاد' مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیة' ج ٤'ص ٩٥)

پس اہل حدیث رسول اللہ ﷺ کی حدیث' آپ کی سیرت اور آپ کے مقاصد واحوال کو سب فرقوں سے زیادہ جانتے ہیں اور ہمارے نزدیک اہل حدیث سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو حدیث کی سماعت یا اس کی تحریر وکتابت یا اس کی روایت کے لیے وقف رہے' بلکہ اس لقب اہل حدیث کا مستحق ہر وہ شخص ہے جو حدیث کی حفاظت ومعرفت اور اس کے ظاہر وباطن کے فہم اور اس کے اتباع میں نمایاں اور ممتاز ہو۔ اسی طرح اہل قرآن کا انطباق بھی ان پر صحیح ہے۔

ان لوگوں کی خصلت یہ ہے کہ یہ قرآن وحدیث سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے معانی ومفاہیم پر بحث وگفتگو کرتے ہیں اور ان سے جن واجبات کا انھیں علم ہوتا ہے ان پر عمل کرتے ہیں۔ اسی لیے فقہاے حدیث (محدثین کرام) رسول اللہ ﷺ سے' دوسرے فقہا کی بہ نسبت زیادہ باخبر ہیں اور ان کے صوفیا بہ نسبت دوسرے صوفیا کے' رسول اللہ ﷺ کے زیادہ پیروکار ہیں اور ان کے امراے حکومت نبوی سیاست کو' بہ نسبت دوسروں کے زیادہ سمجھنے اور اس کے مطابق رویہ اختیار کرنے والے ہیں۔"

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر اہل حدیث کی بابت تحریر فرماتے ہیں۔

من المعلوم ان اھل الحدیث یشارکون کل طائفة فیما یتحلون به من

صفات الکمال ویمتازون عنھم بمالیس عند ھم فان المنازع لھم لا بدان یذکر فیما یخا لفھم فیہ طریقا اخر ی مثل المعقول والقیاس والرای والکلام والنظر والاستد لال والمحاجۃ والمجادلۃ والمکاشفۃ والمخاطبۃ والوجد والذوق و نحوذلک وکل ھذہ الطرق لاھل الحدیث صفوتھا و خلاصتھا فھم اکمل الناس عقلا واعد لھم قیا سا واصوبھم رایا واسدھم کلاما واصحھم نظرا واھداھم استدلا لا واقومھم جدلا واتمھم فراسۃ واصدقھم الھاما واحدھم بصرا ومکاشفۃ واصوبھم سمعا و مخاطبۃ واعظمھم و احسنھم وجدا و ذوقًا..... (حوالہ مذکور ص ۹۔۱۰)

یہ بات واضح ہے کہ اہل حدیث ان صفات کمال میں دوسرے تمام گروہوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں جن سے دوسرے لوگ آراستہ ہیں اور بہت سی صفات میں ان سے ممتاز ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ اس لیے اہل حدیث سے بحث ومجادلہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی مخالفت میں کوئی اور طریقہ اختیار کرے جیسے معقول، قیاس، رائے، کلام، نظر واستدلال، محاجہ، مجادلہ، مکاشفہ ومخاطبہ اور وجدان وذوق اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔ یہ تمام طریقے اہل حدیث کی شان اور ان کا امتیاز ہیں۔ پس وہ عقل میں سب لوگوں سے زیادہ کامل اور قیاس میں سب سے زیادہ انصاف سے کام لینے والے، رائے میں سب سے زیادہ درست، کلام میں سب سے زیادہ درست، نظر وفکر میں سب سے زیادہ صحیح، استدلال میں سب سے زیادہ راہ راست کو پانے والے اور بحث وحجت میں سب سے زیادہ موزوں، فہم وفراست میں سب سے زیادہ کامل، الہام (القائے ربانی) میں سب سے زیادہ سچے، بصر ونظر اور مکاشفے میں سب سے زیادہ تیز، سماعت اور مخاطبے میں سب سے زیادہ درست اور وجدان وذوق میں سب سے زیادہ عظیم اور احسن ہیں۔"

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

واذ ا کانت سعادۃ الدنیا والاخرۃ ھی با تباع المرسلین فمن

المعلوم ان احق الناس بذلک، هم اعلمهم بآثارالمرسلین واتبعهم لذلک، فالعالمون باقوالهم وافعالهم المتبعون لها هم اهل السعادة فی کل زمان ومکان، وهم الطائفة الناجیة من اهل کل ملة، وهم اهل السنة والحدیث من هذه الامة فانهم یشارکون سائر الامة فیما عندهم من امورالر سالة ویمتازون عنهم بما اختصوا به من العلم المور وث عن الرسول مما یجهله غیر هم اویکذب به. (حواله مذکور ص ۲٦)

”جب دنیا وآخرت کی سعادت پیغمبروں کے اتباع میں ہے تو یہ واضح ہی ہے کہ اس کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جو پیغمبروں کے آثار (اقوال واعمال) کو زیادہ جاننے اوران کی زیادہ پیروی کرنے والے ہیں۔ پس ان کے اقوال وافعال کو جاننے والے اوران کی پیروی کرنے والے ہی ہر زمانے اور ہر جگہ میں اہل سعادت ہیں اور یہی گروہ ہر ملت میں نجات پانے والا ہے اوراس امت (محمدیہ) میں یہی حیثیت اہل سنت وحدیث کو حاصل ہے، اس لیے کہ وہ ساری امت کے ساتھ ان چیزوں میں ان کے شریک ہیں جو ان کے پاس رسالت کے امور میں سے ہیں اور اس علم میں ان سے ممتاز ہیں جس میں انھیں درجہ اختصاص حاصل ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی وراثت ہے۔ جس سے دوسرے لوگ نا آشنا ہیں یا اس کو جھٹلانے والے ہیں“۔

اہل حدیث کی تعریف کرتے ہوئے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں:

”فهذه الطبقة کان لهاقوة الحفظ والفهم والفقه فی الدین والبصر والتاویل، ففجرت من النصوص انهارالعلوم، واستنبطت منها کنوزها ورزقت فیها فهما خاصا، کما قال امیرالمومنین علی بن ابی طالب ر ضی الله عنه وقد سئل ”هل خصکم رسول الله

ﷺ بشیء دون الناس؟ فقال لا والذی فلق الحبة و برأ النسمة الا فهما یوتیه الله عبدا فی کتابه فهذا الفهم هو بمنزلة الکلاء والعشب الذی انبتته الا رض الطیبة وهوالذی تمیزت به هذه الطبقة عن الطبقة الثانیة وهی التی حفظت النصوص فکان همها حفظها و ضبطها. فوردها الناس وتلقوها بالقبول و استنبطوا منها واستخرجوا کنوزها واتجروافیها و بذروها فی ارض قابلة للذرع والنبات ورووها کل بحسبه (قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ)۔

وهولاء الذین قال فیهم النبی ﷺ "نضر الله امرءاً سمع مقالتی فوعاها ثم اداها کما سمعها فرب حامل فقه ولیس بفقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه"۔

"پس یہی طبقہ اہل حدیث وہ ہے جسے قوت حفظ، فہم وفقاہت دین اور بصرو تاویل کی صلاحیت حاصل ہے۔ پس اس نے نصوص سے علوم کی نہریں جاری کیں، ان نصوص سے ان کے خزانے نکالے اور ان میں خصوصی فہم عطا کیا گیا، جیسے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ نے کسی چیز کی بابت کوئی خصوصی علم بھی دیا ہے جو آپ نے دوسروں کو نہیں بتایا؟ تو حضرت علی نے فرمایا۔ "نہیں! اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور مخلوق کو پیدا کیا...... ہاں فہم کی بات اور ہے جو اللہ اپنے بندے کو اپنی کتاب کی بابت عطا کرتا ہے"۔

پس یہی فہم کتاب اس گھاس چارے کی مثل ہے جسے پاکیزہ زمین اگاتی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے یہ طبقہ اہل حدیث دوسرے طبقے سے ممتاز ہے، اور یہی طبقہ ہے جس نے نصوص کی حفاظت کی۔ پس اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ان نصوص کا حفظ وضبط ہی ہے۔ پس اس کے پاس لوگ آئے اور اس سے قبولیت کا یقین حاصل کیا۔ ان نصوص سے مسائل کا استخراج کیا۔ اس

کے خزانے نکالے‘ اس میں تجارت کی اور ایسی زمین میں اس کی کاشت کی جو روئیدگی اور پیداوار کے قابل تھی‘ اور ہر ایک نے اسے اپنی طاقت کے مطابق سیراب کیا (تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا)۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی بابت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش رکھے جس نے میرا فرمان سنا اور اسے یاد کیا‘ پھر اسے (اسی طرح) آگے پہنچایا جیسے اس نے سنا‘ اس لیے کہ بہت سے حامل فقہ (دین کی بات سننے والے) فقیہ (سنی ہوئی بات سے استنباط کرنے والے) نہیں ہوتے‘ اور بہت سے حامل فقہ (جن کو دین کی بات پہنچائی جاتی ہے) وہ پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں“۔

اسی طرح امام لالکائی اہل حدیث کی تعریف اور اس نام کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

ثم کل من اعتقد مذهبا فالی صاحب مقالته التی احدثها ینتسب والی ر ایه یستند الا اصحاب الحدیث فان صاحب مقالتهم رسول الله ﷺ فهم الیه ینتسبون والی علمه یستندون وبه یستدلون والیه یفزعون وبرایه یقتدون وبذلک یفتخر ون وعلی اعداء سنته بقربهم منه یصولون فمن یوازیهم فی شرف الذکر؟ ویبا هیهم فی ساحة الفخر وعلو الاسم؟ اذاسمهم ماخوذ من معانی الکتاب والسنة یشتمل علیهما لتحققهم بهما اولا ختصا صهم باخذ هما‘ فهم مترد دون فی انتسابهم الی الحدیث بین ما ذکر الله سبحانه و تعالی فی کتابه، فقال تعالی ذکره، الله نزل احسن الحدیث (الزمر ۲۳) فهو القرآن فهم حملة القران واهله وقواء ہ و حفظته وبین ان ینتمواالی حدیث رسول الله ﷺ، فهم نقلته و حملته فلا شک انهم یستحقون هذا الاسم موجود المعنیین فیهم لمشاهدتنا ان اقتباس الناس الکتاب والسنة منهم

واعتماد البریة فی تصحیحهما علیهم لانا ما سمعنا عن القرون التی قبلنا ولا راینا نحن فی زماننا مبتدعا راسافی اقراء القرآن واخذ الناس عنه فی زمن من ا لا زمان ولا ارتفعت لا حد منهم رأیة فی روایة حدیث رسول الله ﷺ فیما خلت من الایام ولا اقتدی بهم احد فی دین ولا شریعة من شرائع الاسلام.

والحمد الله الذی کمل لهذه الطائفة سهام الا سلام وشر فهم بجوامع الا قسام و میزهم من جمیع الانام حیث اعزهم الله بدینه و رفعهم بکتابه و اعلیٰ ذکرهم بسنة و هداهم الی طریقته و طریقة رسوله فهی الطائفة المنصورة والفرقة الناجیة والعصبة الهادیة والجماعة العادلة المتمسک بالسنة التی لا ترید برسول الله بدیلا ولا عن قوله تبدیلا و لا عن سنته تحویلا و لا یثنیهم عنها تقلب الاعصار و لا یلویهم عن سمتها تغیرالحدثان و لا یصرفهم عن سمتها ابتداع من کادالاسلام لیصد عن سبیل الله و یبغیها عوجا و یصرف عن طرقها جدلا و لجاجا ظنا منه کاذبا و تخمینا باطلا انه یطفیٔ نورالله' والله متم نوره و لوکره الکافرون."

(شرح اصول اعتقاد اهل السنة والجماعة ' ج ۱ ص ۲۳ـ۲۵' به تحقیق احمد سعد حمدان)

"ہر وہ شخص جو کسی مذہب (مسلک) سے وابستگی رکھتا ہے' تو وہ اسی صاحب مذہب کی طرف' جو اس کا بانی ہوتا ہے' اپنا انتساب کرتا اور اسی کی رائے سے استناد کرتا ہے۔ سوائے اہل حدیث کے' اس لیے کہ ان کے صاحب مذہب خود رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پس وہ انہی کی طرف اپنی نسبت کرتے اور انہی کے علم سے استناد کرتے ہیں اور دشمنان سنت پر سنت کے ہتھیار ہی سے حملہ کرتے ہیں'

پس کون ہے جو اس شرف ذکر میں اہل حدیث کا مقابلہ کر سکے اور فخر کے میدان اور نام کی بلندی میں ان پر برتری جتا سکے؟ اس لیے کہ ان کا (اہل حدیث) نام معانئ کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔ وہ ان دونوں پر مشتمل ہے' کیوں کہ وہ ان دونوں کے ساتھ ہی تحقق کرتے یا ان دونوں سے ہی بطورِ خاص دلیل پکڑتے ہیں۔ پس وہ حدیث کی طرف اپنا انتساب کرنے میں متردد ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھی اپنی کتاب میں حدیث کہا ہے۔ جیسے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے بہترین حدیث نازل فرمائی ہے''۔

پس یہ حدیث قرآن ہے اور اہل حدیث قرآن کے حامل' اس کے ماننے والے' اس کے قاری اور اس کے حافظ ہیں۔ اور فرامین رسول بھی حدیث ہیں۔ اور اہل حدیث اس حدیث کے بھی ناقل اور اس کے حامل ہیں۔ (پس اہل حدیث کا تردد اس لیے ہے کہ وہ اہل حدیث اس معنی میں ہیں کہ وہ قرآن کے ماننے والے ہیں یا اس معنی میں کہ وہ حدیث کے ماننے والے ہیں)۔ بلاشبہ وہ اس نام کے مستحق ہیں، کیوں کہ دونوں ہی معنی ان کے اندر موجود ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ لوگ انہی سے کتاب وسنت (کا علم) حاصل کرتے ہیں اور مخلوق قرآن و حدیث کی تصحیح میں انہی پر اعتماد کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے اپنے سے پہلے زمانے میں نہ سنا اور نہ اپنے زمانے میں دیکھا کہ کسی بدعتی نے قرآن کے پڑھانے میں حصہ لیا ہو اور کسی زمانے میں لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا ہو' اسی طرح ماضی میں کبھی ان میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی روایت کا جھنڈا بلند کیا' نہ کسی نے دین وشریعت کے معاملے میں ان میں سے کسی کی اقتدا کی۔

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اس اہل حدیث گروہ کے لیے اسلام کے حصے کو مکمل کر دیا اور تمام اقسام کے ساتھ اس کو مشرف کیا اور تمام مخلوق میں اسے اس اعتبار سے ممتاز کیا کہ اسے اپنے دین کے ساتھ عزت بخشی اور اپنی

کتاب کے ساتھ اسے بلندی عطا کی اور اپنی سنت کے ساتھ اس کا ذکر بلند کیا اور اپنے اور اپنے رسول (ﷺ) کے طریقے کی طرف رہنمائی کی۔ پس یہی طائفہ منصورہ' فرقہ ناجیہ' حق کا علم بردار اور جماعت عادلہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کو تھامنے والی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کو نہیں چاہتی۔ نہ آپؐ کے فرمان میں کسی تبدیلی کی روادار ہے اور نہ آپ کی سنت سے انحراف اسے گوارا ہے۔ نہ اسے انقلابات زمانہ اس سنت نبویؐ سے پھیرتے ہیں' نہ تغیر حوادث اس کو اس سمت سے موڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور نہ اس شخص کی بدعت سازی ہی اس سے اس کا رخ بدلتی ہے جو اسلام کے خلاف سازش کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے راستے سے روکے' اور اس دین میں وہ کجی تلاش کرتا ہے اور وہ اس راستے سے لوگوں کو جدل و تکرار کے ذریعے سے پھیرتا ہے۔ یہ جھوٹا گمان اور باطل تخمینہ ہے کہ وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دے گا جب کہ اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے چاہے کافروں کو ناگوار ہی گزرے''۔

زیرنظر کتاب میں اسی جماعت اہل حدیث کی تاریخ' نظریہ و عقیدہ اور اس کی ہمہ جہتی جلیل القدر خدمات کا اجمالی تذکرہ اور ان کی بابت پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔

یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے جو زیادہ تر اصولی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے آئندہ حصوں میں اس کی خدمات جلیلہ کا (ان شاء اللہ) قدرے تفصیل سے ذکر ہوگا۔

کتاب کے فاضل مؤلف مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب ہیں ((بارک اللہ فی عمرہ وعملہ) جو جماعت ہی میں نہیں' بلکہ پورے علمی حلقے میں معروف ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخ اور شخصیت نگاری ان کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس میں وہ کمال فن کے منصب پر فائز ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس حصے میں بھی اپنے موضوع کا حق ادا کیا ہے اور امید ہے کہ اگلے حصوں میں بھی کماحقہ موضوع کا حق ادا کریں گے۔

جماعت اہل حدیث نے برصغیر پاک و ہند میں جو دینی و علمی خدمات سرانجام دی

ہیں، اسی طرح دعوت و تبلیغ اور جہاد کے میدانوں میں جو انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، وہ تاریخ کا ایک سنہری باب' بلکہ اس کا جھومر ہیں۔ لیکن افسوس کہ ابھی تک اسے ایسا مؤرخ میسر نہیں آیا جو اس کی جملہ تفصیلات سمیت اسے زیب قرطاس کر سکے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے جو ہر باشعور اہل حدیث کو مضطرب رکھتا ہے۔

اس پہلے حصے کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرعہ فال مولانا بھٹی صاحب حفظہ اللہ ہی کے نام نکلا ہے' وہ ان شاء اللہ اس کے اگلے حصوں میں دیدہ وری کا حق ادا کرتے ہوئے اہل حدیث کی ہمہ جہتی خدمات کا دل آویز تذکرہ بھی اسی تفصیل سے کریں گے جیسا کہ ان کا حق ہے۔ واللہ ھو الموفق والمعین۔ ایدہ اللہ بنصرہ العزیز و وفقہ بتکمیلہ. (آمین)

صلاح الدین یوسف

مدیر شعبہ تحقیق و تصنیف و ترجمہ دارالسلام۔ لاہور

۲۴ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ۔ ۳۰ نومبر ۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفے چند

یہ خطۂ ارض جسے برصغیر کہا جاتا ہے' تین ملکوں کے مجموعے کا نام ہے' وہ ملک ہیں ہندوستان' پاکستان اور بنگلہ دیش- اگرچہ مسافت کے اعتبار سے یہ خطۂ ارض مرکز اسلام (مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ) سے بہت دور ہے' لیکن اسے یہ سعادت حاصل ہے کہ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی وسعت پذیر ردائے رحمت اس پر سایہ فگن ہونے لگی تھی اور یہاں کے بعض شہروں اور علاقوں کو دینی اور اسلامی تعلیم کی برکتوں نے اپنی آغوش محبت میں لینا شروع کر دیا تھا اور اس خطے میں قرآن وحدیث کی تبلیغ واشاعت کے روح پرور سلسلے کا آغاز ہو گیا تھا- بعض کتابوں میں کچھ ایسی روایات بھی ملتی ہیں' جن میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ہند'' کا ذکر فرمایا اور اس کے بعض امور سے متعلق دلچسپی کا اظہار کیا- ان میں سے دو روایات کتاب الجہاد باب غزوۃ الہند' سنن نسائی میں ہیں' ایک مستدرک حاکم میں اور بعض روایات سید غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) نے مختلف کتابوں سے اخذ کر کے اپنی عربی تصنیف ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' میں درج کی ہیں-

برصغیر میں عرب مسلمانوں کی مجاہدانہ تگ وتاز کا آغاز:

برصغیر پر عرب مسلمانوں کی طرف سے فوج کشی کا آغاز رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے چار سال بعد ۱۵ ہجری میں ہوا- اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین اور عمان کا والی مقرر کر کے بھیجا- وہاں سے حضرت عثمان بن ابوالعاص نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا کمان دار بنا کر ہندوستان کی ایک بندرگاہ ''تھانہ'' پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا- موجودہ جغرافیائی اعتبار سے یہ بندرگاہ بمبئی کے قریب تھی- اب بھی اسے چھوٹی سی

بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک روایت کے مطابق عثمان بن ابوالعاص نے اپنے بھائی حکم بن ابوالعاص کو گجرات کاٹھیاواڑ میں تھانہ اور بھڑوچ کی طرف بھیجا اور دوسرے بھائی حضرت مغیرہ بن ابوالعاص کو فوج دے کر دیبل پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ تینوں بھائی (عثمان' حکم اور مغیرہ) رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔ اس زمانے میں تھانہ' بھڑوچ اور دیبل بلاد ہند و سندھ کے تین اہم مقامات تھے' جن پر سرور کائنات ﷺ کے صحابہ کرام نے سب سے پہلے پرچم اسلام لہرانے کا عزم کیا۔ عرب اصحاب تاریخ تھانہ کو تانہ اور بھڑوچ کو بروص یا بروس رقم کرتے ہیں۔ اس کی مناسب تفصیلات بہ ترتیب زمانی ہم نے اپنی اس کتاب کے بعض مقامات میں درج کی ہیں جو قارئین کرام کے مطالعہ میں آئیں گی۔

چچ نامہ کی روایت کی رو سے اس عہد میں ہندوستان کے ان علاقوں کا بادشاہ چچ بن سیلائچ تھا جو پینتیس سال سے حکومت کر رہا تھا اور اس کی طرف سے دیبل کا حکمران سامہ بن دیوائچ تھا۔ دیبل ایک مشہور تجارتی شہر تھا جو سندھ کے موجودہ شہر ٹھٹھہ کے قریب واقع تھا۔

عہد فاروقی میں بعض صحابہ کرام کرمان اور مکران کے علاقوں میں بھی وارد ہوئے' وہاں جنگیں لڑیں اور اس نواح کے بہت سے حصوں کو فتح کیا۔ یہ علاقے اس دور میں حدود سندھ میں واقع تھے۔ وہاں دربارِ خلافت سے بعض صحابہ باقاعدہ والی اور گورنر مقرر ہو کر آتے رہے۔

تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین رن کچھ کے علاقے میں بھی تبلیغ اسلام اور جہاد کے لیے تشریف لائے' جسے عربی زبان کی کتب تاریخ میں ''کس'' لکھا گیا ہے۔ یہ علاقہ موجودہ جغرافیائی صورت حال کے مطابق ہندوستان میں واقع ہے اور اس کی حدود ایک طرف سے صوبہ گجرات' دوسری طرف سے صوبہ راجستھان اور تیسری طرف سے صوبہ سندھ سے ملحق ہیں۔

قلات' لس بیلہ اور بلوچستان کے علاقوں کو بھی چند صحابہ کرام کی قدم بوسی کا شرف

حاصل ہوا۔ اس زمانے میں بلوچستان کسی صوبے یا مخصوص چند مقامات تک محدود علاقے کا نام نہ تھا۔ عربی تاریخوں میں اسے بلوص (ص کے ساتھ) بھی اور بلوس (س کے ساتھ) بھی لکھا گیا ہے۔

خطۂ برصغیر میں جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے، رسول اللہ ﷺ کے پچیس صحابہ کرام تشریف لائے۔ بارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں، پانچ حضرت عثمان کے عصر خلافت میں، تین حضرت علی کے دور امارت میں، چار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایام حکومت میں اور ایک یزید بن معاویہؓ کے زمانۂ حکمرانی میں۔

بعض علمائے اصول حدیث نے صحابی کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

اول: وہ جس نے رسول اللہ ﷺ کے قرن عالی قدر میں اسلام قبول کیا، آپؐ کی صحبت و رویت سے بہرہ ور ہوا اور بحالت اسلام وفات پائی۔

دوم مخضرم: جس نے زمانہ جاہلیت بھی پایا اور دور رسالت مآب ﷺ بھی دیکھا۔ لیکن کسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت سے مستفیض نہ ہو سکا۔ البتہ قبول اسلام کی سعادت عہد رسالت ہی میں حاصل کر لی۔

سوم مدرک: جس نے آنحضرت ﷺ کا عہد مبارک پایا، اسلام اگرچہ آپ کی حیات طیبہ میں قبول کیا یا بعد میں کلمہ شہادت پڑھ کر دائرۂ ایمان میں داخل ہوا۔

بعض حضرات صحابی کی اس تقسیم سے اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن وارد برصغیر ہونے والوں میں ان تینوں قسم کے صحابی شامل ہیں۔ ان کے حالات میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ ان میں کون مخضرم اور کون مدرک ہیں۔

ان پچیس صحابہ کرام کے وہ حالات جن کا تعلق برصغیر سے ہے، آئندہ صفحات میں بیان ہوں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی دور ہی میں اسلام یہاں آ گیا تھا اور قرن اول کے مسلمانوں نے کفرستان ہند میں جنگ و جہاد کی طرح ڈال دی تھی تاکہ اس ملک کے باشندے ان پاکیزہ اخلاق و کردار، اعلیٰ تہذیب و ثقافت اور تعلیم و شائستگی کی ان بلند

تریں اقتدار سے بہرہ یاب ہو سکیں، جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔
لیکن پوری قوت اور عظیم فاتح کی حیثیت سے مسلمان اموی حکمران ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت (۹۳ھ) میں محمد بن قاسم ثقفی کے زیر کمان پاکستان کے موجودہ صوبہ سندھ کی طرف سے داخل برصغیر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں قبیلہ بنو ثقیف کے اس بہادر جرنیل ۔۔۔۔محمد بن قاسم ثقفی۔۔۔۔نے سندھ کا تمام علاقہ فتح کر لیا اور اس کی سرحدوں کو عبور کر کے ایک طرف ملتان تک آگے بڑھ گئے، تو دوسری موجودہ راجستھان کے متعدد اہم مقامات تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسلامی طاقتوں نے ہتھیار ڈال دیے، پرچم کفر سرنگوں ہو گیا اور اسلام کے فروغ واشاعت کی راہیں لحہ بہ لحہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئیں۔

قبیلہ بنو ثقیف اور برصغیر:

قبیلہ بنو ثقیف کے لوگوں نے ابتدائے اسلام میں رسول اکرم ﷺ کو بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ طائف میں آنحضرت تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لے گئے تو انھوں نے پتھر مار مار کر آپ کو لہولہان کر دیا تھا۔ یہ لوگ بہت سے عرب قبائل کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نعمت اسلام سے متمتع ہوئے تھے۔ لیکن ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خدمت اسلام کے بعض نہایت اہم گوشوں میں اللہ نے ان کو اولیت کی سعادت سے نوازا اور ان کی سعی مسلسل اور تگ وتاز مجاہدانہ سے دنیا کے دور دراز کونوں تک صدائے حق پہنچی۔ اسی بت کدۂ ہند کی تاریخ کو سامنے رکھیے کہ یہاں سب سے پہلے اسی قبیلے کے بہادر فوجیوں اور نبی اکرم ﷺ کے جاں نثار صحابہ نے توحید کی آواز بلند کی۔

برصغیر میں حدیث رسول ﷺ

صحابہ کرام کا ہر قول اور ہر عمل حدیث رسول (ﷺ) اور ارشادات پیغمبر سے ہم آہنگ تھا۔ وہ جہاں جاتے فرامین نبوت ان کے ساتھ جاتے، جن سے زندگی کے تمام نشیب وفراز میں وہ رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ برصغیر میں بھی احادیث مبارکہ کا قلب نواز گنجینہ اور روح پرور ذخیرہ ان کے ساتھ آیا۔ آنحضرت ﷺ کے دنیا سے تشریف لے

جانے کے چار سال بعد ١٥ ہجری میں صحابہ کی جو جماعت یہاں آئی، وہ حدیث رسول اپنے ساتھ لائی۔ اس طرح کہنا چاہیے کہ ١٥ ہجری میں اس خطے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔

صحابہ کی مقدس جماعت کے سفر حیات کی منزلیں نبی ﷺ کے فرامین و ارشادات کی روشنی میں طے ہوتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی طرز معاشرت کا ہر گوشہ اور اسلوب زندگی کا ہر پہلو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ عمل کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ گھر میں ہوں یا باہر، سفر میں ہوں یا حضر میں، حالت جنگ میں ہوں یا امن میں، زراعت میں مشغول ہوں یا تجارت میں، ہر لمحے اور ہر حال میں اقوال و احادیث رسول ﷺ کا گلستانِ پُر بہار ان کے سامنے لہلہاتا رہتا تھا اور اسی کے سائے میں انھیں روحانی اور جسمانی سکون حاصل ہوتا تھا۔ یہی ان کا مقصد حیات اور یہی ان کا سرمایہ زندگی تھا۔ وہ جس ملک اور جس علاقے میں گئے اور جس منصوبے کے تحت گئے، حدیث رسول اپنے ساتھ لے کر گئے۔ برصغیر میں آئے تو یہ متاع بے بہا ان کے ساتھ تھی اور انھوں نے یہاں جو قدم اٹھایا اسی کی رہنمائی میں اٹھایا۔

برصغیر میں اسلام کے یہ اولین نقوش ہیں، جو پہلی مرتبہ ١٥ ہجری میں اس کی سطح ارض پر ابھرے اور پھر تاریخ کے ایک خاص تسلسل کے ساتھ پوری تیزی سے لحہ بہ لحہ ابھرتے اور نمایاں ہوتے چلے گئے۔۔۔اور یہ اولین نقوش و آثار اس پُر عظمت کارواں کے ہیں، جنھیں اصحاب حدیث اور اہل حدیث کے عظیم الشان لقب سے پکارا جاتا ہے اور یہی پہلا کارواں تھا جو نبی ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے صرف چار سال بعد برصغیر میں وارد ہوا۔ دوسرا کاروان حدیث تابعین کا، تیسرا محمد بن قاسم اور ان کے رفقائے عالی قدر کا اور چوتھا کارواں تبع تابعین کا تھا۔

یہ پاک باز لوگ جہاں گئے حدیث رسول (ﷺ) ان کے ہم رکاب رہی۔ یہی ان کی زندگی کا حاصل، یہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اسی کے احکام ان کے شب و روز کا معمول، یہی ان کا اصل مقصد زیست اور یہی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

اس کتاب میں ان چار جلیل القدر کاروانوں کی ان مساعیٔ جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے دور میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں سرانجام دیں۔ یہی وہ ذی مرتبت حضرات ہیں جنھوں نے پہلے پہل یہاں قال اللہ و قال الرسول کی مسرت انگیز اور بہجت افزا صدائیں بلند کیں۔

بعض حضرات فرمایا کرتے ہیں کہ برصغیر میں سب سے پہلے حنفی مسلک آیا' اہل حدیث کی عمر اس ملک میں صرف ڈیڑھ دو سو سال ہے۔ یہ بالکل بے تکی اور بے وزن بات ہے اور ان لوگوں کی ذہنی اختراع ہے جو برصغیر کی اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور سے واقفیت نہیں رکھتے یا اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ انھوں نے اپنی خواہش کا نام تاریخ رکھ لیا ہے۔ تاریخی واقعات بیان کرنے کے لیے تاریخ کو سمجھنے اور اس کے مختلف گوشوں کو فہم کی گرفت میں لانے کی ضرورت ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ پچیس صحابہ کرام جو یہاں آئے وہ حنفی تھے؟ کیا وہ کسی ذی اکرام امام فقہ کے مقلد تھے؟ کیا ان کے بعد یا ان کے زمانے میں برصغیر میں تشریف لانے والے بیالیس تابعین کسی لائق صد احترام شخصیت کے حلقہ تقلید سے وابستہ تھے؟ ہرگز نہیں! وہ براہِ راست نبی ﷺ کی احادیث مبارکہ پر عمل پیرا تھے اور آپؐ کے فرامین اقدس پر عامل اور ان کے اولین مبلغ تھے اور اسی متاعِ گراں بہا کی رفاقت میں انھوں نے اس نواح کا رخ فرمایا تھا۔ ان کا مرکز عمل اور نقطہ ماسکہ صرف قرآن اور حدیث تھے۔ اس کے علاوہ عمل کے لیے کوئی بات کبھی ان کے حاشیہ خیال میں نہیں آئی۔

یہ وہ دور ہے جب فقہی مسالک کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور کسی قابل تکریم امام فقہ کا اس عالم آب و گل میں کوئی وجود نہ تھا۔ صحابہ کا پہلا کارواں برصغیر میں ۱۵ ہجری میں آیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس سے ۶۵ سال بعد ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ ہجری میں انھوں نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ۹۳ ہجری میں رونق آرائے بزم وجود ہوئے اور ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۰ ہجری میں اس جہان ہست و بود میں نمودار ہوئے اور ۲۰۴ ہجری میں یہ آفتاب علم غروب ہو گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ١٦٤ ہجری میں ہوئی اور ٢٤١ ہجری میں وہ عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ صحابہ کرام کے زمانے میں نہ حنفی تھے' نہ مالکی' نہ شافعی تھے' نہ حنبلی۔۔۔۔خالص فرامین پیغمبر اور حدیث رسول کا سکہ چلتا تھا' کسی امام فقہ کی تقلید کا ہرگز کوئی تصور نہ تھا۔ جب ائمہ فقہ کی پاک باز ہستیاں دنیا میں موجود ہی نہ تھیں تو تقلید کیسی اور کس کی؟ تقلید کے سلسلے ان سے کئی سو سال بعد پیدا ہوئے۔ پہلے صرف قرآن و حدیث اور فقط کتاب و سنت کی بنیاد پر عمل کی دیواریں استوار کی جاتی تھیں اور اسی پر اسلام کا قصر رفیع الشان قائم تھا اور اسی کا نام اہل حدیثیت ہے اور اسی کو ماننے اور حرز جان بنانے والے لوگ سب سے پہلے وارد برصغیر ہوئے' جنھیں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے پُراعزاز لقب سے پکارا جاتا ہے اور جن کے بارے میں قرآن ناطق ہے۔ رضی اللہ عنهم و رضوا عنه' اللہ تعالیٰ کی خوشنودیاں ان کے حصے میں آئیں اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

جو حضرات گرامی قدر اہل حدیث کو برصغیر میں نیا مذہب قرار دیتے ہیں' ہم نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اگر اس خطہ ارض میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث نئی ہے تو یہ مذہب بھی نیا ہے اور اگر آنحضرت ﷺ کی حدیث پاک کا وجود چودہ سو سال سے ہے تو اہل حدیث کا وجود بھی چودہ سو سال سے ہے' اور اسی کا نام قدامت اہل حدیث ہے۔

تاریخی حقائق ہمیں بتاتے ہیں اور واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلک اہل حدیث اصل دین اور اسلام کی صحیح ترین تعبیر ہے جو صحابہ کرام کے زمانے میں برصغیر میں آیا اور یہاں کے لوگ اس سے آشنا ہوئے۔ باقی سب فقہی مذاہب یا مسالک ہیں جو بہت بعد میں عالم وجود میں آئے۔ اس وقت حنفیت کہاں تھی؟ مالکیت کا وجود کہاں تھا؟ شافعیت اور حنبلیت کہاں تھی؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے کے اہل حدیث یا اصحاب حدیث اور تھے اور یہ اور ہیں۔ یہ بھی مہمل بات ہے اور ابتدائی دور کی اسلامی تاریخ سے عدم تعلق کی دلیل۔

نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوۃ‘ بیع و شرا وغیرہ امور میں جن احادیث پر وہ عمل کرتے تھے‘ انہی پر یہ کرتے ہیں۔ ان بزرگان عالی مقام سے ان کی کوئی الگ حدیثیں اور الگ احکام نہیں ہیں۔

اسلام موٹے موٹے دو امور پر مشتمل ہے۔ ایک عبادات اور دوسرے معاملات۔۔۔ ان دونوں کا احادیث رسول (ﷺ) میں تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے اور ان کی جزئیات تک بیان کر دی گئی ہیں۔ ان پر اہل حدیث اللہ کے فضل سے پوری طرح عامل تھے اور عامل ہیں۔

ایک گروہ کا ارشاد گرامی ہے کہ دورِ قدیم کے اہل حدیث وہ تھے جو حدیثیں جمع کرتے تھے۔

ہمارا مقصد کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں ہے‘ مثبت انداز سے یہ عرض کرنا ہے کہ اس طائفہ مقدسہ کے عالی قدر ارکان حدیثیں جمع بھی کرتے تھے اور لوگوں کو ان کا درس بھی دیتے تھے یعنی احادیث کی ہر رنگ میں اشاعت فرماتے تھے۔ اب بھی اہل حدیث کا یہی معمول اور یہی کام ہے۔ وہ مدارس میں احادیث کی تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں‘ ان کی شرحیں لکھتے ہیں‘ ان کی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں‘ ان کی نشر و طباعت کا اہتمام کرتے ہیں‘ حدیث پر اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں‘ منکرین حدیث کا باقاعدہ مقابلہ کرتے ہیں‘ تحریری صورت میں بھی اور تقریری صورت میں بھی۔ حجیت حدیث اور استناد حدیث کے موضوع پر کتابیں لکھتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور ملکوں میں احادیث کو پھیلاتے اور تراجم و شروح کے ذریعے انھیں ہر طبقہ فکر کے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی دورِ صحابہ سے لے کر اب تک اہل حدیث کا یہی طرز عمل اور یہی طریق کار ہے اور وہ اس کے لیے ہر آن کوشاں رہے ہیں۔۔۔ اور اس کتاب میں اہل حدیث کی انہی مساعی کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اہل حدیث اور مقلدین کے درمیان اصل امتیاز یہی ہے کہ اہل حدیث کہتے ہیں براہِ راست قرآن و حدیث کو مانو جو اسلام کا اصل ماخذ ہے اور مقلدین کا ارشاد گرامی ہے‘

تقلید کرو۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود ائمہ فقہ کس کی تقلید کرتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ کسی کی بھی نہیں۔۔۔۔۔! وہ صرف کتاب وسنت پر عمل پیرا تھے اور ان کا فرمان ہے کہ اگر ہماری کوئی بات قرآن وحدیث سے مطابقت نہ کرتی ہو تو اسے بالکل نہ مانو۔۔۔!

تقلید ائمہ کے دعوے داروں کو تو حضرات ائمہ کرام کے اس فرمان پر لازماً عمل کرنا چاہیے۔ تقلید سمجھ کر ہی اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔

گزشتہ سطور میں جو باتیں اختصار سے بیان کی گئی ہیں، کتاب کے آئندہ صفحات میں یہ باتیں ان شاء اللہ قارئین کرام کو تفصیل سے ملیں گی۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
اسلامیہ کالونی۔ ساندہ' لاہور
۱۰۔ فروری ۲۰۰۳۔۔۔۸۔ ذی الحجہ ۱۴۲۳ ہجری
فون نمبر: ۷۲۲۰۵۹۲

پہلا باب

برصغیر میں اہل حدیث کا پہلا کارواں۔۔صحابہ کرام

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت

۲۲ر اور ۲۳ر جمادی الاخریٰ کی درمیانی شب ۱۳ ہجری کو خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ ۲۳ر جمادی الاخریٰ کو بالاتفاق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین منتخب کر لیا گیا۔ ۲۷ ذی الحجہ ۲۳ ہجری کو ابولؤ لؤ نے ان پر اس وقت خنجر سے حملہ کیا اور لگا تار چھ وار کیے جب کہ وہ مسجد نبوی میں فجر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ یکم محرم ۲۴ ہجری کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا زمانۂ خلافت ساڑھے دس برس پر مشتمل ہے۔ ان کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے بہت سے علاقے اور ملک فتح کیے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی انہی کے زمانے میں صحابہ کے قدم پہنچے اور یہاں کے باشندوں کو اسلامی احکام واقدار سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ تاریخ کی کتابوں میں ہمیں بارہ صحابہ کرام کے نام ملتے ہیں جو عصر فاروقی میں بسلسلۂ جہاد واردِ برصغیر ہوئے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ بہت سے صحابہ ان کے زمانے میں اس ملک میں آئے ہوں گے' مگر افسوس ہے تاریخ نے ان کے نام محفوظ نہیں رکھے' اس لیے ہماری رسائی اس اولوالعزم جماعت کے تمام حضرات کے اسمائے گرامی تک نہیں ہو سکی۔ ہماری محدود نظر صرف بارہ حضرات تک پہنچ سکی ہے' ان کے بھی زیادہ حالات میسر نہیں آئے۔ سطورِ ذیل میں ان بارہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کا تذکرہ کیا جاتا ہے' جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں برصغیر پاک و ہند میں آئے اور یہ بارہ صحابہ دراصل اہل حدیث کے اس کارواں کے اولیں ارکان ہیں' جن کے قدوم میمنت لزوم سے برصغیر کی سرزمین سب سے پہلے سعادت اندوز ہوئی۔

۱۔ حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی:

قبیلۂ بنو ثقیف سے تعلق رکھنے والے صحابۂ کرام میں حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ حافظ ابن حزم ''جمہرۃ انساب العرب'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

كان من خيار الصحابة.

کہ حضرت عثمان کا شمار بلند مرتبت صحابہ میں ہوتا تھا۔

یہ جلیل القدر صحابی طائف کے رہنے والے تھے اور بنو ثقیف کے اس وفد کے ساتھ مدینہ منورۃ آئے تھے جو رمضان المبارک ۹ ہجری کو عبد یالیل کی قیادت میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت عثمان کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔

ارکان وفد کئی دن مدینہ منورہ میں اقامت گزیں رہے تھے۔ اس اثنا میں عثمان بن ابو العاص نے اسلام قبول کر لیا تھا اور پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے قرآن مجید کی چند سورتیں زبانی یاد فرمالی تھیں اور دین کے ضروری مسائل سیکھ لیے تھے۔ اس اعتبار سے ارکانِ وفد میں نبی ﷺ کے نزدیک دینِ اسلام کے یہ سب سے زیادہ عالم قرار پائے اور آپؐ نے انھیں طائف کے منصبِ امارت و امامت سے سرفراز فرمایا۔

۱۴ ہجری میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو بصرے کا معلم مقرر کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال وہ اس منصب عالی پر فائز رہے اور وہاں کے لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا۔

۱۵ ہجری میں حضرت عمر نے انھیں عمان اور بحرین کے علاقوں کا گورنر بنا دیا۔ اسی سال حضرت عثمان بن ابو العاص نے عمان میں ایک بحری بیڑا تیار کرایا اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن ابو العاص ثقفی کی قیادت میں اسے ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اسلامی حکومت کا یہ پہلا بحری بیڑا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے حکم سے تیار کیا گیا تھا اور یہی وہ اولین بحری بیڑا تھا جو موجودہ جغرافیائی اعتبار سے بمبئی کے قریب

تھانہ اور بھڑوچ کی بندرگاہوں کی طرف حرکت کناں ہوا تھا۔ مجاہدینِ اسلام نے ان بندرگاہوں کو فتح کیا' لیکن ان پر قبضہ برقرار نہیں رکھا اور واپس عمان چلے گئے۔ ہندوستان کے کسی علاقے پر عرب مسلمانوں کا یہ پہلا حملہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ یہ پہلا کاروانِ تہذیبِ اسلامی اور اولیں قافلۂ حاملینِ حدیث رسول (ﷺ) تھا جو عازم ہند ہوا۔

ان حضرات کا اصل مقصد اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق و کردار' صاف ستھری تہذیب و ثقافت اور تعلیم و شائستگی کی ان بلند تریں اقدار سے بہرہ مند کرنا تھا' جن کو اسلام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان کی طرف یہ قافلہ ۱۵ ہجری میں روانہ ہوا تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر صرف چار سال کا عرصہ گزرا تھا اور یہ آپ کے صحابہ کا زمانہ تھا۔ اس بحری بیڑے میں صحابہ کرامؓ کا ایک لشکر سوار تھا' ان حضرات کی نہ تعداد کا علم ہو سکا ہے اور نہ ان کے نام کتب تاریخ میں مل سکے ہیں۔ بحری بیڑا تیار کرنا اور پھر اس کے ذریعے کسی ملک کی طرف روانہ ہونا دو چار یا دس بیس آدمیوں کا کام نہیں، یقیناً یہ حضرات سیکڑوں کی تعداد میں ہوں گے' جنھوں نے اپنے آپ کو شدید خطرے میں ڈال کر سمندر کی تند و تیز لہروں پر تیرتے ہوئے ایک دور دراز ملک پر چڑھائی کی تھی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ عثمان بن ابوالعاص نے اس بحری بیڑے کی قیادت خود کی تھی اور انہی کی کمان میں تھانہ اور بھڑوچ کی بندرگاہوں کو فتح کیا گیا تھا۔

آخری دور میں انھوں نے بصرے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ایک روایت کی رو سے ۵۱ ہجری میں اور ایک روایت کے مطابق ۵۵ ہجری میں وفات پائی۔ (۱)

۲۔ حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفیؓ:

حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶۔۔۔طبقات ابن سعد' ج ۵ ص ۸۔۵۰۹'۵۔۔۔ تاریخ طبری ج ۲' ص ۲۱۹۔۔۔الاستیعاب ج ۲ ص ۲۷۲۔۔۔اسد الغابہ ج ۲ ص ۲۷۲۔۔۔العقد الثمین فی فتوح الہند و من ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین۔ ص ۵۶۔ ۵۷

ابوالعاص ثقفی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔۱۴ہجری میں جب حضرت عمر فاروق ؓ نے عثمان بن ابوالعاص کو معلم بصرہ کا منصب عطا کر کے بصرے بھیجا اور پھر ایک سال بعد ۱۵ہجری میں جب انھیں عمان اور بحرین کا والی بنایا تو حضرت عثمان نے اپنی جگہ اپنے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص کو طائف کا امیر مقرر کر دیا تھا' اس لیے کہ حضرت عمر نے طائف سے مدینہ منورہ بلاتے وقت عثمان کو لکھا تھا کہ جسے آپ مناسب سمجھیں اپنی جگہ طائف کا والی بنا دیں اور خود میرے پاس تشریف لے آئیں۔ چنانچہ عثمان طائف کی امارت اپنے بھائی حکم کے سپرد کر کے خود امیر المومنین حضرت عمر فاروق کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

اس سے کچھ عرصے بعد حضرت حکم اپنے بڑے بھائی حضرت عثمان کے پاس چلے گئے۔ عثمان نے ان کو بحرین کا امیر مقرر کیا اور انھوں نے امیر کی حیثیت سے کئی علاقوں پر فوج کشی کی اور فتح یاب ہوئے۔

علاوہ ازیں حکم نے عثمان کے حکم سے بلادِ سندھ و ہند میں سے بندرگاہ تھانہ' بھڑوچ' دیبل' مکران اور اس کے نواحی علاقوں پر یلغار کی اور جہاں گئے کامیاب رہے۔

ہندوستان کے بعض علاقوں کی طرف آنے والے یہ صحابیٔ رسولؐ (حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی) زندگی کے آخری دور میں بصرے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہیں ۴۵ہجری میں وفات پائی۔ [1]

۳۔ حضرت مغیرہ بن ابوالعاص ثقفیؓ:

یہ بھی حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کے بھائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ فتوح البلدان میں بلاذری لکھتے ہیں کہ مغیرہ کو ان کے بھائی عثمان نے عمان سے سندھ کے شہر دیبل پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ انھوں نے دیبل کا رخ کیا' دشمن

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶۔۔۔طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۴۱۔۔۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۳۵۔۔۔الاصابہ ج ۲ ص ۲۸۔۔۔فتوح البلدان ص ۴۰۰'۔۔۔البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۴۱۔۔۔معجم البلدان ج ۲ ص ۴۸۱

پر حملہ آور ہوئے اور فتح پائی۔

چچ نامہ میں مرقوم ہے کہ حضرت مغیرہ نہایت عاقل وفہیم اور دوررس نگاہ رکھنے والے صحابی تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی حضرت عثمان کی ہدایات کے مطابق پہلے سندھ کے شہر دیبل کا عزم کیا اور پھر بعض دیگر علاقوں کی جنگوں میں حصہ لیا۔ مثلاً جنگ فارس میں انھوں نے نہایت بہادری اور جرأت مندی کا ثبوت دیا۔

ان تینوں بھائیوں۔۔۔۔ حضرت عثمان، حضرت حکم اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہم۔۔۔۔ نے طائف سے منتقل ہو کر بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں کے لوگ انھیں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مالی اور دینی اعتبار سے اس خاندان کو ہمیشہ اونچا مرتبہ حاصل رہا۔

حضرت مغیرہ بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کا بصرہ میں انتقال ہوا۔ سال وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ (۱)

۴۔ حضرت ربیع بن زیاد حارثی مذحجیؓ:

عرب کے قبیلے بنو مذحج سے تعلق رکھتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ گورے رنگ کے دبلے پتلے اور بظاہر کمزور جسم کے تھے، لیکن جنگ و جہاد میں بہت تیز اور دشمن کے مقابلے میں انتہائی جری تھے۔ لوگوں سے میل جول اور مراسم و روابط میں نہایت متواضع، منکسر اور نرم خو تھے۔

۱۷ ہجری کو عہد فاروقی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت ربیع کو مختلف محاذوں پر عساکرِ اسلامی کا کمانڈر بنا کر بھیجا تو نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا اور ہر محاذ پر دادِ شجاعت دی۔ اس زمانے میں سجستان کا زیادہ علاقہ سندھ میں شامل تھا اور کچھ حدودِ ایران میں واقع تھا، اس محاذ پر بھی وہ گئے اور فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے۔

عہدِ فاروقی میں انھوں نے زرنج، زالِق، کابل، سیوستان، کرمان اور مکران کی جنگوں میں

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶۔ فتوح البلدان ص ۹۲، ۲۵۶۔ العقد الثمین فی فتوح الھند ومن ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین ص ۵۶۔ ۵۷

شرکت کی۔ کرمان' مکران اور سیوستان کے گورنر بھی رہے۔ ان میں سے بعض علاقوں کا کچھ حصہ اس عہد میں پاکستان کے موجودہ صوبہ بلوچستان میں اور کچھ حصہ سندھ میں شامل تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان علاقوں میں حضرت ربیع نے جو سلسلۂ جہاد شروع کیا تھا' وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ حکومت میں بھی جاری رہا۔

حضرت ربیع بن زیاد حارثی مذحجی رضی اللہ عنہ چوتھے صحابیِ رسول ہیں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بسلسلۂ جہاد واردِ برصغیر ہوئے۔ اس نواح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تبلیغ فرمائی۔ انھوں نے عہدِ معاویہ میں ۵۱ ہجری کو یا اس سے کچھ عرصہ بعد وفات پائی۔ [1]

۵۔ حضرت حکم بن عمرو ثعلبی غفاریؓ:

عرب کا ایک مشہور قبیلہ بنو غفار تھا' جس کی ایک شاخ بنو ثعلب کہلاتی تھی۔ حضرت حکم بن عمرو بن مجدع رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو غفار کی اسی شاخ سے تھا۔ اسی وجہ سے انھیں ثعلبی غفاری کہا جاتا ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ۱۷ ہجری میں حضرت حکم کو مکران کا والی مقرر کیا اور لواءِ مکران سے نوازا۔ ۲۳ھ ہجری میں حضرت حکم نے پورے علاقۂ مکران پر چڑھائی کی اور اسے فتح کیا۔ انھوں نے مکران کا محاصرہ کر لیا تھا' جس کی وجہ سے مکران کے حکمران اور اس کی فوج میں اس قدر بددلی اور مایوسی پھیل گئی کہ ان میں اسلامی سپاہ کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رہی۔ حضرت عمر کو فتح کی اطلاع پہنچائی گئی تو بہت خوش ہوئے۔ امیر المومنین کی خدمت میں فتحِ مکران کی خوش خبری حضرت صحار عبدی لے کر گئے تھے۔

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۴۱۷۔۔۔ فتوح البلدان ص ۳۸۵' ۳۸۶۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۶۰۔۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۵۵ ۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۳۔۔۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۶۴۔۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین ص ۵۷' ۵۸۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۵۷۔

مال غنیمت بھی انہی کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔
مکران کا یہ وہ حصہ تھا جو موجودہ بلوچستان میں شامل تھا۔مکران اوراس کے قرب و جوار کا حکمران اس زمانے میں راجا راسل تھا جو ایرانیوں کا طرف دار اور باجگزار تھا۔اس نے مسلمانوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی۔لیکن صحار عبدی نے برصغیر کے کچھ اس قسم کے حالات معلوم کیے کہ جن کی بنا پر اسلامی فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔یہ کس قسم کے حالات تھے؟اس کا ذکر حضرت صحار کے تذکرے میں آئے گا۔
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ حکومت میں حضرت حکم کو خراسان کا والی مقرر کر دیا تھا۔بہ اختلافِ روایات انھوں نے ۴۵یا ۵۰یا ۵۱ہجری کو خراسان میں وفات پائی۔[1]

۶۔حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ:

ان کا شمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالی قدر صحابہ اور معززینِ انصار میں ہوتا ہے۔
۲۳ہجری میں عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ کو مکران (بلوچستان) بھیجا گیا۔اس وقت مکران میں حضرت حکم بن عمرو غفاری مصروف جہاد تھے۔عبداللہ بن عبداللہ انصاری نے جہادِ مکران میں حکم بن عمرو غفاری کی مدد کی اور آنحضرتؐ کے ان دونوں صحابہ نے اس نواح میں بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔[2]

۷۔حضرت سہل بن عدی خزرجی انصاریؓ:

انھوں نے جنگِ بدر میں حصہ لیا اور مشرکینِ مکہ کے خلاف شریکِ جہاد ہوئے۔
ان کے دو بھائی اور تھے ان میں سے ایک کا نام ثابت بن عدی اور دوسرے کا عبدالرحمٰن

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۱۸۶۔۔۔فتوح البلدان ص ۴۰۰۔۔۔طبری ج ۴ص ۱۸۱‘۱۸۲۔۔طبقات ابن سعد ج ۷ص ۲۸‘۲۹۔۔۔الاصابہ ج ۱ص ۳۴۶۔۔۔اسد الغابہ ج ۱ص ۱۶ وج ۲ص ۲۶‘۲۷۔۔۔البدایہ والنہایہ ج ۸ص ۴۷۔۔۔تہذیب التہذیب ج ۲ص ۴۳۶‘۴۳۷۔۔۔الاستیعاب ج ۱ص ۳۱۳‘۳۱۴۔۔۔العقد الثمین ص ۵۹تا ۶۱۔برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۵۹

۲۔ الاصابہ ج ۲ص ۳۲۸۔۔۔طبری ۴ص ۱۸۱‘۱۸۲۔۔۔اسد الغابہ ج ۳ص ۱۹۹۔۔العقد الثمین ص ۶۱

بن عدی تھا۔ یہ جنگِ احد میں شامل تھے۔ یعنی تینوں بھائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی اور اسلام کے نامور مجاہد تھے۔
حضرت عمر فاروق نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ سہل بن عدی کو مکران کا والی مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت سہل مکران گئے اور علاقہ مکران اور اس کے گرد و نواح کی فتوحات میں نمایاں کردار ادا کیا' جس میں حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاریؓ نے بھی ان کی مدد کی۔ حضرت حکم بن عمرو غفاری بھی ان معرکوں میں شریک تھے۔ یہ تینوں بزرگ آنحضرت ﷺ کے صحابی تھے۔ یہ ۲۳ ہجری کا واقعہ ہے۔ اسی سال بلوچستان کے بعض علاقے فتح کیے گئے۔ اس میں بھی ان حضرات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ (۱)

۸۔ حضرت شہاب بن مخارق بن شہاب تمیمیؓ:

یہ قبیلۂ بنوتمیم یا قبیلہ بنو مازن کے صاحبِ احترام فرد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرک صحابی تھے۔ طبری نے سولھویں سن ہجری کے واقعات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق کا عہدِ خلافت تھا۔
حضرت حکم بن عمرو ثعلبی جب مکران میں مصروف پیکار تھے تو یہ وہاں پہنچے اور شریک جہاد ہوئے۔ اس طرح ارضِ برصغیر کو ان کی قدم بوسی سے بہرہ یاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ (۲)

۹۔ حضرت صحار بن عباس عبدیؓ:

کتبِ سیرت میں منقول ہے کہ حضرت صحار بن عباس عبدی رضی اللہ عنہ' وفدِ عبدالقیس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر کے صحابیت کے مرتبۂ عالی کو پہنچے۔ منقول ہے کہ یہ وفد تیرہ ارکان پر مشتمل تھا اور یہ تیرہ افراد ۵ ہجری میں یا اس کے پس و پیش دربار نبوی میں حاضر ہوئے تھے۔ ان میں حضرت صحار

۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۸۸۔۔۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۱۔۔۔ اسد الغابہ ج ۲ ص ۴۶۸۔۔۔ العقد الثمین ص ۶۲۔۔
۲۔ الاصابہ ج ۳ ص ۴۵۵۔۔۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۱ تا ۱۸۶۔۔۔ العقد الثمین ص ۶۳۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۶۱۔

عبدی بھی تھے۔ان کا رنگ نہایت سرخ تھا اور وہ ماہر انساب تھے۔

حضرت صحارؓ جنگ مکران میں شامل تھے۔ فتحِ مکران کے بعد انھیں دربارِ خلافت میں حضرت عمر فاروق کی خدمت میں مژدۂ فتح سنانے کے لیے بھیجا گیا تو فاروقِ اعظم نے بے حد اعزاز کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور فرمایا:

مکران کے بارے میں بتاؤ کیسا علاقہ ہے؟

ادیبانہ زبان میں جواب دیا:

فھلھا جبل، وماء ھا وشل وتمرھا وقل، وعدوھا بطل

(اس کی نرم و ہموار زمین پہاڑ ہے، پانی کم، کھجوریں ردی اور دشمن بے باک۔)

حضرت عمر نے یہ سن کر فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔[1]

۱۰۔ حضرت عاصم بن عمرو تمیمیؓ:

انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرفِ صحابیت حاصل تھا۔ جنگِ قادسیہ میں شریک تھے اور مجاہدانہ فطرت کے مالک تھے۔ شاعر بھی تھے۔ فتحِ عراق کے سلسلے میں ان سے کئی شعر منقول ہیں۔

حضرت عاصم بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ نے نواحِ سندھ میں یلغار کی اور سجستان کے قرب و جوار کا وہ علاقہ جو سندھ سے ملحق تھا، ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی زد میں آیا اور مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔[2]

۱۔ الاستیعاب ج ۱ص ۱۹۳۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۶۲۔۔۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۴۹، ۱۹۳۔۔ کتاب المحبر ص ۲۹۴۔۔۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۱۔۔۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۷۰۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۲۷۔ العقد الثمین ص

۲۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۲۸، ج ۳ ص ۲۳۰۔۔۔ الاستیعاب ج ۳ ص ۱۲۵۔ العقد الثمین ص ۶۵۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۶۳

۱۱۔ حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعیؓ:

طبری کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی ہیں جو عہد فاروقی میں ۲۳ ہجری کو جنگِ بجستان میں حضرت عاصم بن عمیر تمیمی رضی اللہ عنہ سے ملے اور ان دونوں کی جدوجہد سے وہ علاقہ فتح ہوا جو اس زمانے میں بلادِ بجستان سے لے کر سندھ کے اندرونی حصے تک پھیلا ہوا تھا اور دریائے بلخ بھی اس میں شامل تھا۔

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ کی جلد ۷ میں ۲۳ ہجری کے واقعات میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ (۱)

۱۲۔ حضرت نسیر بن دیسم بن ثور عجلی:

امام ابن حزم نے ''جمہرۃ انساب العرب'' میں حضرت نسیر بن دیسم کو عرب کے قبیلۂ بنو عجل کے فرد قرار دیا ہے۔ ۲۳ ہجری میں جب حضرت سہل بن عدی رضی اللہ عنہ نے علاقہ قفص یعنی موجودہ بلوچستان کا کچھ حصہ فتح کیا تو نسیر بن دیسم اس میں شامل تھے اور فوج کے ایک دستے کی کمان ان کے سپرد تھی۔ (۲)

یہ وہ بارہ صحابی ہیں جو سب سے پہلے برصغیر کے بعض علاقوں میں تشریف لائے اور ان کا شمار اس اولیں جماعت میں ہوتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کا ذخیرہ لے کر اس خطۂ ارض میں آئی۔ یہاں ان کے صرف وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں، جن کا تعلق برصغیر کے کسی علاقے سے ہے۔ باقی واقعات حذف کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۴۶ ۔۔۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۸۰، ۱۸۱ ۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۳۲ ۔۔۔ الاستیعاب ج ۲ ص ۱۲۵ ۔۔۔ العقد الثمین ص

۲۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۳۴۴ ۔۔۔ طبری ج ۴ ص ۱۴۶، ۱۸۰ ۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۵۵۳ ۔ العقد الثمین ص ۶۶

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت

اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے ان چند صحابہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو برصغیر میں وارد ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غرۂ محرم ۲۴ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ ان کا عہدِ خلافت بارہ دن کم بارہ سال پر محیط ہے۔ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو ان کی شہادت کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ ان کے ایامِ خلافت میں فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ دُور دراز علاقوں تک پھیلا۔ فارس، خراسان، بجستان، افریقہ، سواحل شام اور بحر روم ان کے زمانے میں فتح ہوئے۔ نیز ارضِ ہند میں مکران، سندھ اور بلوچستان کے متعدد علاقوں اور شہروں پر عساکرِ اسلامی کے علمِ فتح لہرائے۔ اس ضمن میں امام ابو یوسف ''کتاب الخراج'' میں امام زہری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ان افریقیة وخراسان وبعض السند افتتحت فی زمن عثمان رضی اللّٰه عنه.

یعنی افریقہ، خراسان اور سندھ کے بعض حصے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں فتح ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں پانچ صحابہ کرام خطۂ برصغیر میں تشریف لائے۔ مسلسل نمبروں کے ساتھ ان کے اسمائے گرامی اور مختصر حالات درجِ ذیل ہیں۔

۱۳۔ حضرت حکیم بن جبلہ عبدی رضی اللہ عنہ

بعض علمائے اصول کے نزدیک حضرت حکیم بن جبلہ عبدی رضی اللہ عنہ مدرک صحابی تھے۔ یعنی انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ مبارک پایا، لیکن یہ معلوم

نہیں ہوسکا کہ قبولِ اسلام کی نعمت آنحضرت کی حیاتِ طیبہ میں حاصل ہوئی یا آپؐ کے بعد۔!

حضرت حکیم بن جبلہ عبدی قبیلۂ بنوعبدالقیس سے تعلق رکھتے تھے اور پہلے مسلمان سیاح تھے جو سیاحت کی غرض سے برصغیر پاک و ہند کے بعض علاقوں میں آئے اور اس نواح کے حالات وکوائف سے واقفیت حاصل کی۔

بلاذری نے فتوح البلدان میں ان کے بارے میں یہ دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عامر کو عراق کا والی مقرر کیا تو ایک مکتوب کے ذریعے ان کو حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو ہندوستان بھیجا جائے جو وہاں کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر کچھ ضروری معلومات حاصل کرے اور پھر ان معلومات سے دربارِ خلافت کو مطلع کیا جائے۔ چنانچہ عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ عبدی کو ہندوستان بھیجا۔ وہ بعض علاقوں کے چکر لگا کر واپس آئے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت عثمان نے پوچھا: کچھ معلومات لائے؟

عرض کیا: امیر المؤمنین! میں دیارِ ہند میں گھوم پھر کر معلومات لایا ہوں۔

فرمایا: اپنی حاصل کردہ معلومات بیان کرو۔

بولے:

ماء هاوشل، وثمرها دقل، وارضها جبل، واهلها بطل ان قل الجيش فيها ضاعوا وان كثروا جاعوا.

یعنی خطۂ ہند کی حالت یہ ہے کہ پانی میلا، پھل ردی، زمین پتھریلی، باشندے بہادر، چور بے باک، لشکر کم ہو تو ضائع ہو جانے کا اندیشہ، زیادہ ہو تو بھوک سے مر جانے کا خطرہ۔

فرمایا: واقعہ بیان کر رہے ہو یا شاعری فرما رہے ہو۔؟

عرض کیا: واقعہ بیان کر رہا ہوں۔

حضرت حکیم بن جبلہ عبدی فصیح البیان صحابی تھے۔ بصرہ میں اقامت گزیں

ہو گئے تھے اور وہاں کسی نے ان کو شہید کر دیا تھا۔ (۱)

۱۴۔ حضرت عبید اللہ بن معمر تیمیؓ:

خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں انھیں فوج کا ایک دستہ دے کر مکران اور سندھ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ فتوحاتِ مکران میں انھوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ بعد ازاں اس نواح کے مفتوحہ علاقوں کی امارت ان کے سپرد ہوئی۔

ایک روایت کی رو سے اس صحابیِ رسول اور امیر مکران نے اصطخر کے ایک معرکے میں جامِ شہادت نوش کیا۔ (۲)

۱۵۔ حضرت عمیر بن عثمان بن سعدؓ:

۲۹ ہجری کے لگ بھگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمیر کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو امارتِ مکران کے منصب پر متمکن کیا۔ کافی عرصہ وہ یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ مکران کا یہ وہ حصہ تھا جو سندھ میں شامل تھا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت عمیر بن عثمان رضی اللہ عنہ نے ملکِ شام میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ (۳)

۱۶۔ حضرت مجاشع بن مسعود سلمیؓ:

ابو عثمان النہدی جو حضرت مجاشع بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے، بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع نے ان کو بتایا کہ میں اور میرا بھائی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم نے آپ سے عرض کیا کہ ہم ہجرت پر آپؐ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ فتوح البلدان ص ۴۲۲۔ الاصابہ ج ۱ ص ۳۷۹۔۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۹۸۔ الاستیعاب ج ۱ ص ۳۲۲۔۔۔۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۴۰۔۔۔ العقد الثمین ص ۲۷، ۳۷۔ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش ص ۶۸

۲۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۱۴۰۔۔۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۴۵۔۔۔ الاستیعاب ج ۲ ص ۴۲۵، ۴۲۶۔۔۔ تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۶۴۔۔۔ الاصابہ ج ۲ ص ۴۳۲، ۴۳۳۔۔۔ فتوح البلدان ص ۳۸۲۔

۳۔ اسد الغابہ ج ۴ ص ۱۴۴، ۱۴۵۔ طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۳۷۴، ۳۷۵۔۔۔ العقد الثمین ص ۷۶۔

آپؐ نے فرمایا: ہجرت کا معاملہ تو گزر چکا۔
ہم نے عرض کیا: پھر ہم آپ سے کس چیز کے متعلق بیعت کریں؟
فرمایا: **علی الاسلام و الجهاد فی سبیل الله** [1]
کہ خدمتِ اسلام اور راہِ خدا میں جہاد کی بیعت کرو۔
فبایعناه.
(چنانچہ ہم نے اس سلسلے میں آپ سے بیعت کی۔)

حضرت مجاشعؓ نے موجودہ افغانستان کے دارالحکومت کابل میں اسلامی فوج کے ایک دستے کی کمان کرتے ہوئے مخالفین اسلام سے جہاد کیا۔ مورخین کے نزدیک اس زمانے میں کابل کا شمار بلادِ ہند میں ہوتا تھا۔ حضرت مجاشع کابل کے بت کدے میں داخل ہوئے تو ایک بڑے سے بت کو ہاتھ میں پکڑا اور وہاں موجود لوگوں سے فرمایا: میں نے اس لیے اسے ہاتھ میں پکڑا ہے کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ:

انه لایضر و لا ینفع
(نہ یہ کسی کو تکلیف پہنچا سکتا ہے' نہ فائدہ۔)

حضرت مجاشع رضی اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پاکستان کے صوبے بلوچستان میں مخالفین اسلام سے جنگ کی اور اس سے ملحقہ علاقے بجستان پر علم فتح لہرایا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے برصغیر کے ان علاقوں میں سکونت اختیار کر لی تھی اور انھیں اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ مختلف آبادیوں میں آمد و رفت کے لیے وہاں راستے بنائے' زمینیں آباد کیں' کنوئیں کھودے اور کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع کیا۔ سرائیں تعمیر کیں اور مسافروں کے لیے رہائشی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ [2]

۱۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ' باب المبایعۃ بعد فتح مکۃ علی الاسلام و الجہاد صحیح بخاری' کتاب الجہاد۔
۲۔ اسد الغابہ ج ۴ ص ۳۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۳۰۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۳۴۲۔۔ الاستیعاب ج ۳ ص ۴۹۳۰، ۴۹۲۔ العقد الثمین

۱۷۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ قرشیؓ:

ان کا اسم گرامی ان حضرات میں شامل ہے، جنھوں نے فتح مکہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ قبول اسلام سے قبل ان کا نام ابن کعبہ یا عبدِ کلال تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد یہ آنحضرت کے ساتھ جنگِ تبوک میں شریک ہوئے۔

عبدالرحمٰن بن سمرہ نے فتوحاتِ عراق اور فارس کی بعض جنگوں میں حصہ لیا۔ ۲۳ ہجری میں انھیں سجستان کا والی مقرر کیا گیا اور شہادتِ عثمان تک اس منصب پر فائز رہے۔ کابل اور خراسان کی جنگوں میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر حملے کیے اور رن کچھ کا علاقہ جو ہندوستان میں واقع ہے اور گجرات کاٹھیا واڑ اور راجستان کی سرحدوں کے درمیان پڑتا ہے، اس صحابیِ رسول نے فتح کیا۔

زندگی کے آخری دور میں حضرت عبدالرحمٰن نے بصرے میں سکونت اختیار کر لی تھی اور بہ اختلافِ روایات ۵۰ یا ۵۱ ہجری کو وہیں فوت ہوئے۔ (۱)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ پانچ صحابی ہیں جو خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں برصغیر پاک و ہند میں بغرضِ جہاد تشریف لائے اور جن کی مساعیِ جمیلہ سے یہ علاقہ روشناسِ اسلام ہوا اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچیں۔

۱۔ فتوح البلدان ص ۲۸۸۔۔۔الاستیعاب ج ۲ ص ۱۶۴۔۔۔کتاب المعارف ص ۱۳۲۔۔۔الاصابہ ج ۲ ص ۳۹۳۔۔۔اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۹۷، ۲۹۸۔۔۔العقد الثمین

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ذی الحجہ ۳۵ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت کو زینت بخشی۔ وہ چوتھے خلیفۂ راشد ہیں۔ ان کی مدتِ خلافت چار برس نو مہینے بنتی ہے۔ ۱۷۔رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو شہید ہوئے۔

حضرت علی کے زمانے میں جیوشِ اسلام بالائے مکران سے ہوتے ہوئے سندھ میں داخل ہوئے اور پھر وہاں سے چل کر قیقان پہنچے اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ فتح کیا۔ قیقان' گیگان کا معرب ہے اور یہ وہی علاقہ ہے' جسے اب قلات کہا جاتا ہے اور پاکستان کا حصہ ہے۔ قلات سے عساکرِ اسلامی نے ارضِ ہند کی طرف حرکت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ یہ ۳۸ ہجری کے اواخر اور ۳۹ ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حسب ذیل تین صحابی برصغیر میں تشریف لائے۔

۱۸۔ حضرت خریت بن راشد ناجی سامیؓ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت خریت کو کچھ عرصے کے لیے فارس کے ایک علاقے کا والی مقرر کیا گیا تھا اور انھوں نے یہ خدمت بحسن وخوبی انجام دی تھی۔

۳۷ھ ہجری میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر فائز تھے' حضرت خریت واردِ مکران ہوئے۔ اس طرح ارضِ برصغیر کو ان کی قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔ (۱)

۱۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۲۳۔۔۔الاستیعاب ج ۱ ص ۴۵۳۔۔۔العقد الثمین

۱۹۔ حضرت عبداللہ بن سوید تمیمیؓ:

قبائلِ عرب میں قبیلہ بنو تمیم ایک مشہور قبیلہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن سوید اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مخضرم صحابی تھے۔ یعنی انھوں نے زمانۂ جاہلیت بھی پایا اور عصر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھا، لیکن کسی سبب سے آنحضرت کے فیضِ صحبت سے مستفیض نہ ہو سکے۔ البتہ قبول اسلام کی سعادت عہدِ رسالت ہی میں حاصل کر لی تھی۔
حضرت عبداللہ بن سوید تمیمی بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ علاقۂ سندھ کی ایک جنگ میں شریک ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے یہ دوسرے صحابی ہیں جو بغرضِ جہاد خطۂ سندھ میں تشریف لائے اور جن کے نام کا ہمیں علم ہو سکا ہے۔ (۱)

۲۰۔ حضرت کلیب ابو وائلؓ:

ان کے بارے میں صرف اسی قدر معلوم ہو سکا ہے کہ یہ برصغیر کے کسی علاقے میں آئے اور وہاں ایک درخت دیکھا، جس کے سرخ رنگ کے ایک پھول پر سفید حروف میں محمد رسول اللہ کے الفاظ مرقوم تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ تین صحابی ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں سرزمین برصغیر میں تشریف لائے۔ (۲)

۱۔ کتاب المحبر ص ۱۵۴۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۹۲ و ج ۵ ص ۹۳

۲۔ لسان المیزان ج ۴ ص ۴۹۰۔۔۔ عیون الاخبار ج ۲ ص ۱۰۵

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت

حضرت علیؓ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت آتا ہے۔ وہ بیس سال ملکِ شام کے گورنر رہے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ۴۰ ہجری میں زمام خلافت ہاتھ میں لی۔ ۲۲ رجب ۶۰ ہجری کو دمشق میں حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوا۔ اس طرح وہ بیس برس گورنر اور بیس برس خلیفہ رہے۔ ان کا زمانۂ اقتدار چالیس برس پر محیط ہے۔ ان کے عہدِ خلافت میں مندرجہ ذیل چار صحابہ کرام خطۂ برصغیر میں آئے جو اس نواح کے مختلف علاقوں میں سرگرم جہاد رہے اور بعض مفتوحہ مقامات کی امارت انھیں تفویض ہوئی۔

۲۱۔ حضرت مہلب بن ابوصفرہ ازدی عتکیؓ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقعے پر حضرت مہلب بن ابوصفرہ بہت کم سن تھے اور ان کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق مدرک صحابی تھے۔

حضرت مہلب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے اعزازات سے نوازا۔ مجاہدانہ سرگرمیوں میں ہمیشہ آگے آگے رہے۔ عرصۂ دراز تک خراسان کا منصبِ امارت ان کے سپرد رہا۔

عہدِ معاویہؓ میں ۴۴ ہجری کو حضرت مہلب فوجی کی حیثیت سے حدود ہند میں داخل ہوئے اور پھر برصغیر کے بعض دور دراز علاقوں کو پامال کرتے چلے گئے' اس اثنا میں سندھ کے ایک شہر قندابیل کا رخ کیا اور برابر آگے بڑھتے گئے۔

اس عظیم مردِ مجاہد اور صحابیِ رسول نے ایران کے شہر مرو میں ۸۳ ہجری کو وفات پائی۔[1]

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۲۹۔۔۔ کتاب المعارف ص ۱۷۵۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۶۔۵۔ جمہرۃ انساب العرب ۳۶۷۔۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین

۲۲۔ حضرت عبداللہ بن سوار عبدیؓ:

ان کا تعلق بنی مرہ بن ہمام سے تھا اور مدرک صحابی تھے۔

حضرت عبداللہؓ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۳ ہجری میں چار ہزار فوج کے ساتھ حدودِ ہند کی طرف روانہ کیا اور وہ اس نواح میں مصروفِ جہاد ہوئے۔ سب سے پہلے رن کچھ کے علاقے کو ہدفِ توجہ ٹھہرایا اور مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔ بعدازاں دائرۂ جہاد قلات کے میدانوں اور پہاڑوں تک پھیلا دیا۔

حضرت عبداللہ نہایت فیاض تھے۔ ایک مرتبہ قلات کے ایک گاؤں میں انھوں نے دیکھا کہ ایک گھر سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ آدمی بھیجا تو معلوم ہوا کہ ایک بیمار عورت کے گھر میں کھانا تیار ہو رہا ہے۔ اسی وقت اشیائے خورونوش اس کے گھر بھجوائیں اور ایک شخص کو مریضہ کی عیادت کے لیے روانہ کیا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ۴۷ ہجری کو قلات میں ترک باشندوں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا۔ (۱)

۲۳۔ حضرت یاسر بن سوار عبدیؓ:

یہ حضرت عبداللہ کے بھائی تھے۔ انہی کے ہم رکاب ہو کر دورِ معاویہ میں واردِ برصغیر ہوئے تھے۔ جن علاقوں میں ان کے برادرِ مکرم (عبداللہ) نے جہاد کیا' وہیں انھوں نے گرم جوشی سے تیغ و سناں کے جوہر دکھائے۔ عالی ہمت اور مضبوط دل گردے کے مالک تھے۔ (۲)

۲۴۔ حضرت سنان بن سلمہ ہذلیؓ:

بعض حضرات نے ان کو صحابہ کرام میں اور بعض نے تابعین میں گردانا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں زیاد بن ابوسفیان نے ۵۰ ہجری

۱۔ کتاب المحبر ص ۱۵۴' ۱۵۵۔۔۔تاریخ الطبری ج ۵ ص ۵۴۷۔ الاصابہ ج ۳ ص ۹۲۔۔۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۶۔۔۔ چچ نامہ ص ۱۰۱۔

۲۔ چچ نامہ ص ۱۰۸۔۔۔ العقد الثمین ص ۱۰۲

میں ان کو جنگ کے لیے فوج کا امیر بنا کر ہندوستان بھیجا۔

حضرت سنان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: تمھارے والد کو تمھاری شجاعت و جرات پر فخر تھا۔ اب تمھاری کامیابی اور فتح مندی کا زمانہ آ گیا ہے۔

یہ خواب انھوں نے ۴۲ ہجری میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں مکران کے والی و امیر راشد بن عمرو الجدیدی تھے۔ اسی سال ان کی شہادت کی اطلاع پہنچی تو حضرت معاویہ کے حکم سے سنان کو وہاں کی امارت تفویض کی گئی۔ انھوں نے اس علاقے میں فتوحات کا دائرہ کافی دور تک پھیلا دیا تھا۔

انھوں نے حجاج بن یوسف کے دورِ آخر میں ۹۴ یا ۹۵ ہجری کو وفات پائی۔ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ چار صحابہ کرام ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں مخالفینِ اسلام سے جہاد کی غرض سے برصغیر پاک و ہند کے مختلف مقامات میں آئے اور اس علاقے میں ارشاداتِ پیغمبر اور احادیث پاک کی تبلیغ کا باعث بنے۔

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۴۱، ۲۴۲۔۔۔العقد الثمین ص ۱۰۶۔۔۔چچ نامہ ص ۱۰۵

یزید کا زمانۂ حکومت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے یزید نے عنان حکومت ہاتھ میں لی۔ یزید نے تین سال آٹھ مہینے حکومت کی اور ۱۰ ربیع الاول ۶۴ ہجری کو وفات پائی۔ ان کے زمانے میں ایک صحابی برصغیر میں آئے اور وہ تھے منذر بن الجارود عبدی۔۔!
ان کے حالات مندرجہ ذیل سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۵۔ حضرت منذر جارود عبدیؓ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منذر کو اصطخر کا والی مقرر کیا تھا۔ حضرت علیؓ کی طرف سے جنگِ جمل میں شریک ہوئے اور حضرت معاویہ کی مخالفت کی۔

یزید بن معاویہ کے دورِ حکومت میں عبیداللہ بن زیاد کے کہنے سے ۶۰ ہجری میں حضرت منذر کو سرحدات ہند کی طرف روانہ کیا گیا۔ بوقان' قلات اور خضدار کی جنگوں میں انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ایک روایت کے مطابق ۶۲ ہجری میں سندھ کے مفتوحہ علاقے کی امارت اور گورنری کا منصب ان کے سپرد رہا۔ اسی اثنا میں بہ اختلاف روایات سندھ یا قلات میں ان کی وفات ہوئی۔ وفات کے وقت اس صحابیِ رسول کی عمر ساٹھ برس تھی۔ (۱)

یہ اہل حدیث کا پہلا کارواں تھا جو برصغیر میں وارد ہوا۔ اس وقت کوئی فقہی مذہب نہ تھا' نہ ائمہ فقہ دنیا میں موجود تھے اور نہ کسی امام کی تقلید کا کوئی تصور پایا جاتا تھا۔

۱۔ فتوح البلدان ص ۴۲۳٬۲۶۱۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۴۵۸۔۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۶۱۔ چچ نامہ ۱۱۰۔۔ العقد الثمین۔۔۔ برصغیر میں اسلام کے اولیں نقوش ص ۸۵

دوسرا باب

برصغیر میں اہل حدیث کا دوسرا کارواں

تابعین کرام

حاملینِ تہذیبِ اسلامی کا پہلا قافلہ اور اصحاب الحدیث کا اولیں کارواں صحابہ کرام کا تھا جو واردِ ہند ہوا۔ ان حضرات کا اصل مقصد اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق و کردار' صاف ستھری تہذیب وثقافت اور تعلیم وشائستگی کی ان بلند ترین اقدار سے فیض یاب کرنا تھا جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔

صحابہ کرامؓ کے علاوہ یہ خطۂ ارض بہت سے تابعین کرام یعنی رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے صحابۂ عظام کے تلامذہ کا مسکن رہا ہے۔ ان تابعین کرام میں وہ حضرات بھی تھے جو مختلف اوقات میں جہاد کے لیے یہاں آئے اور وہ بھی تھے جو تبلیغ واشاعتِ دین کی غرض سے اس خطے میں وارد ہوئے۔ بعض ایسے حضرات بھی تھے جو اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اور یہیں رہے۔ ان حضرات نے حدیث وسنت کی نشر وترویج کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرائے رکھا۔ بعض کسی دوسرے ملک میں تشریف لے گئے اور وہاں قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کرنے کے لیے زندگیاں وقف کر دیں۔

یہاں برصغیر کے ان عظیم القدر تابعین کے مختصر حالات' ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور اشاعتِ قرآن وحدیث کے لیے ان کی جدوجہد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ واقعات تاریخ کی روشنی میں ہم ان حضرات کو برصغیر میں اصحاب حدیث کا دوسرا کارواں قرار دیں گے۔ یہ کل بیالیس حضرات ہیں' ان کے جو حالات ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں' اختصار کے

ساتھ درج ذیل ہیں۔

۱۔ابن اسید بن اخنس:

یہ وہ تابعی تھے جو عرب کے قبیلہ بنوثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ان کو سندھ کا والی مقرر کیا تھا اور یہ ایک عرصے تک علاقہ سندھ میں مقیم رہے۔ اس اثنامیں سندھ میں ان کا سلسلۂ تدریس حدیث بھی جاری رہا۔ (۱)

عبدالملک ۷۲ ہجری میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے اور ۱۵ شوال ۸۵ ہجری کو انھوں نے وفات پائی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (۹۳) ہجری سے پہلے ہی سندھ کا خاصا بڑا علاقہ فتح ہو چکا تھا اور صحابہ و تابعین کی نہ صرف وہاں آمدورفت شروع ہوگئی تھی بلکہ دارالحکومت دمشق کی طرف سے عمال وامرا کا بھی تقرر ہونے لگا تھا۔

۲۔ابوشیبہ جوہری:

ان کا نام یوسف تھا' والد کا اسمِ گرامی ابراہیم تھا۔قبیلۂ بنوتمیم سے تعلق رکھتے تھے اور تابعی تھے۔انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی اور باقاعدہ ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل رہے۔خود ابوشیبہ سے بھی بہت سے حضرات نے علم حدیث حاصل کیا۔

ابوشیبہ اچھے منتظم بھی تھے۔چنانچہ دیبل اور نیرون کی فتح کے بعد ان کو ان شہروں اور ان کے گردونواح کا والی مقرر کر دیا گیا تھا۔ (۲)

۳۔تاغر بن ذعرؒ:

یہ پہلی صدی ہجری کے نامور بزرگ ہیں اور تابعین کی پاک باز جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ پتا نہیں چل سکا کہ یہ اصلاً کہاں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے کن کن

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۸۔۔الحمبر ص ۱۰۵' ۲۸۸۔۔۔اسدالغابہ ج ۱ ص ۸۴۔۔۔۔البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۴۶۔

۲۔ لسان المیزان ج ۶ ص ۶۹

صحابہ کرام سے سماعِ حدیث اور اخذِ روایت کا شرف حاصل کیا۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ ان کو خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی لشکر کا امیر بنا کر علاقۂ سندھ میں بھیجا تھا اور وہاں انھوں نے بہترین خدمات انجام دی تھیں۔ (۱)

۴۔ حاتم بن قبیصہؒ:

حاتم بن قبیصہ بن مہلب بن ابوصفرہ ازدی عتکی ۔۔۔ خالص عرب تھے اور قبیلۂ بنو ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ حاتم کے دو بیٹے تھے جو حدیث وفقہ کے ماہر تھے۔ ایک کا نام یزید اور ایک کا روح تھا۔ روح افریقہ کے امیر مقرر کیے گئے تھے اور یزید سندھ کے ۔۔۔ یزید کے ایک بیٹے کا نام مغیرہ تھا جو سندھ کے گورنر ہوئے اور وہیں انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ یزید کا ایک بیٹا داؤد تھا، اسے پہلے افریقہ کا گورنر بنایا گیا، بعد میں سندھ کا۔ یزید کے پوتے ابراہیم بھی کم وبیش بیس سال سندھ، مکران اور کرمان کی مسندِ گورنری پر فائز رہے۔ حاتم ایک عرصے تک سندھ میں مصروفِ جہاد رہے۔ (۲)

۵۔ حکم بن منذر عبدیؒ:

ان کی کنیت ابوغیلان تھی۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ سندھ اور اس کے نواح میں جہاد کے لیے آئے اور وہیں وفات پائی۔ حرمازی نے ان کے لیے کہا تھا:

یا حکم بن المنذر بن الجارود
الجوا دوالجواد محجود
سرادق المجد علیک ممدود
بنت فی الجود و فی بیت الجود

حکم بن منذر بڑے سخی اور ہمدرد خلائق تھے۔ یہ سرزمین سندھ میں آئے اور مخالفین اسلام سے جہاد کیا اور پھر اسی خطۂ ارض میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے، رحمۃ اللہ علیہ (۳)

۱۔ چچ نامہ ۹۹
۲۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۳۷۰ ۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۳۴
۳۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۹۶ ۔۔۔ المعارف ص ۲۵۶ ۔ العقد الثمین ص ۱۱۲، ۱۱۳ ۔۔۔ چچ نامہ ص ۱۱۱

۶۔راشد بن عمرو بن قیس ازدی:

قبیلۂ بنوازد کے عالی ہمت بزرگ تھے اور تابعین کی مقدس جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے حضرت راشد کے والد عمرو کو عراق میں قیام کے لیے ایک مکان عطا کیا تھا۔اس مکان کو "لولعۃ عمرو" کہا جاتا تھا۔[1]

حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں راشد بن عمرو نے قلات اور المید کی جنگوں میں شرکت کی اور کامیاب رہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۲ ہجری میں ان کو سندھ اور اس کے اطراف کا امیر مقرر کر دیا تھا۔اس کے بعد انھوں نے عرب کی سکونت ترک کر دی تھی اور سندھ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔[2]

۷۔زائدہ بن عمیر طائی کوفیؒ:

ابن سعد نے زائدہ بن عمیر طائی کو کوفہ کے طبقۂ ثالثہ کے تابعین میں شمار کیا ہے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن عمرو اور متعدد جلیل القدر صحابہ سے روایتِ حدیث کی، فتح سندھ کے وقت یہ محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔محمد بن قاسم نے جب ایک لمبا چکر کاٹ کر دریاے بیاس عبور کیا اور ملتان کی طرف بڑھنے لگے تو اس وقت زائدہ بن عمیر ان کی فوج میں شامل تھے۔جوں ہی کفار نے شکست کھا کر راہِ فرار اختیار کی، مسلمانوں نے محمد بن قاسم کی قیادت میں پیش قدمی کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔اس طرح ملتان کا شہر بغیر کسی بڑی جدوجہد کے مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔[3]

۸۔زیاد بن حواری عمیؒ:

ان کے نام میں اختلاف ہے۔بعض زیاد بن حواری عمی کہتے ہیں، بعض زیاد بن

۱۔ العقد الثمین فی فتوح الہند و من ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین ص ۹۹

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۶۔۔۔المحبر ص ۱۵۴، ۱۵۵۔

۳۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۳۱۳۔۔۔فتوح البلدان ص ۴۲۷۔

حواری عبدی تحریر کرتے ہیں اور بعض حواری بن زیادہ لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے زید بن حواری لکھا ہے۔ یہ وہ تابعی ہیں جو جہادِ سندھ کے موقعے پر محمد بن قاسم کے ساتھی اور اس کے بے حد قابل اعتماد فوجی تھے۔ فتح سندھ کے بعد محمد بن قاسم نے جن لوگوں کے ہاتھ راجا داہر کا سر کاٹ کر عراق بھیجا تھا، یہ ان میں شامل تھے۔

زیاد بن حواری نے جن اکابر صحابہ سے روایتِ حدیث کی ان میں حضرت انس بن مالک، معاویہ بن قرہ اور عبداللہ بن عمر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، رضی اللہ عنہم۔

پھر خود زیاد بن حواری نے بھی سلسلۂ درسِ حدیث قائم کیا۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں گردانا ہے۔[۱]

۹۔ ابوقیس زیاد بن رباح قیسی بصری:

یہ جلیل القدر تابعی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت ابوہریرہ سے انھوں نے جو احادیث روایت کیں، ان میں ایک حدیث یہ ہے:

من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات ميتة جاهلية.[۲]

جو شخص دائرہ اطاعت سے باہر نکلا اور جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔

ابوقیس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ محمد بن قاسم کے ساتھ جہاد کی غرض سے سندھ آئے۔ علی بن حامد نے چچ نامہ میں لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے جس جماعت کو راجا داہر کا سر دے کر عراق بھیجا تھا، ابوقیس اس جماعت کے امیر تھے۔ اس جماعت نے عراق جا کر ہندوستان کے بادشاہوں اور حکمرانوں کے بہت سے واقعات بیان کیے تھے۔[۳]

۱۔ لسان المیزان ج ۲ ص ۳۶۹۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۰۷۔۔۔ چچ نامہ ص ۱۶۱۔۔۔ العقد الثمین۔ ۱۶۶

۲۔ صحیح مسلم کتاب الامارۃ، باب وجوب ملازمة المسلمين عند ظهور الفتن وفي كل حال وتحريم الخروج من الطاعة ومفارقة الجماعة

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۶۶، ۳۶۷۔۔۔ چچ نامہ ۱۶۱۔

۱۰۔ حکم بن عوانہ کلبیؒ:

یہ وہ تابعی تھے جو سیاسی اور انتظامی معاملات میں مہارت رکھتے تھے۔ دو مرتبہ سندھ آئے۔ پہلی مرتبہ محمد بن قاسم کے ساتھ ایک مجاہد کی حیثیت سے ساحل سندھ پر قدم رکھا اور عساکرِ اسلامی کے ساتھ مل کر کفار سے جنگ کی۔ دوسری مرتبہ ہشام بن عبدالملک (حکومت ۲۵ شوال ۱۰۵ ہجری تا ۶ ربیع الثانی ۱۲۵ ہجری) کے عہد حکومت میں آئے جب کہ تمیم بن زید کے بعد انھیں سندھ کا امیر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اپنے زمانۂ امارت میں انھوں نے سندھ کے مختلف علاقوں میں جہاد کے ساتھ ساتھ لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم سے آراستہ کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ [1] حضرت حکم بن عوانہ کلبی نے علاقہ سندھ میں شہادت پائی۔ [2]

۱۱۔ معاویہ بن قرہ مزنی بصریؒ:

ان کے والد حضرت قرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ ان سے ایک دن کسی نے پوچھا:

> کیف ابنک لک؟ قال نعم الابن کفانی امر دنیای و فرغنی لأخرتی. [3]
>
> (آپ کا بیٹا (معاویہ) آپ کے بارے میں کیسا ہے؟ بولے' میرا بیٹا میرے بارے میں بہت اچھا ہے' اس نے مجھے دنیاوی کاموں سے بچا لیا اور توشۂ آخرت جمع کرنے کے لیے فارغ کر دیا ہے۔)

معاویہ بن قرہ نے متعدد صحابہ سے حدیث پڑھی اور ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ ان صحابہ کرام میں معاویہ کے والد قرہ بن ایاس' معقل بن یسار مزنی' ابوایوب انصاری' عبداللہ بن مغفل اور دوسرے بہت سے حضرات شامل ہیں۔ خود معاویہ بن قرہ کا حلقۂ درس بھی جاری تھا۔ ان سے بہت سے حضرات نے درس حدیث لیا۔

۱۔ چچ نامہ ص ۲۹۹

۲۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۵۹۔۔۔ فتوح البلدان ص ۱۳۰۔۔۔ لسان المیزان ج ۲ ص ۲۶۸

۳۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین ص ۱۳۰۔

قرآن و حدیث پر عبور کی وجہ سے عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں معاویہ کو بصرے کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ وہ صادق اور ثقہ تابعی تھے۔

معاویہ بن قرہ دو مرتبہ علاقہ سندھ میں آئے اور کافی عرصہ یہاں مقیم رہے۔ ۱۲۲ ہجری میں وفات پائی۔ بصرے میں ان کے اخلاف و اعقاب اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ (۱)

۱۲۔ مکحول بن عبداللہ سندھیؒ:

ان کی کنیت ایک روایت کے مطابق ابوعبداللہ' ایک کے ابوایوب اور ایک روایت کی رو سے ابومسلم تھی۔ علومِ قرآن و حدیث میں مہارت کے سبب انھیں ''امام السند والشام'' کہا جاتا تھا۔ سند اور شام دونوں ملکوں میں طویل قیام کی وجہ سے ان کی نسبت شام کی طرف بھی کی جاتی تھی اور سندھ کی طرف بھی۔

مکحول کی زبان صاف نہ تھی اور عربی صحیح نہ بول پاتے تھے۔ لہجے میں عجمیت نمایاں تھی۔ زبان میں لکنت بھی تھی اور لہجہ ایسا تھا کہ ق کو کاف بولتے تھے۔ ث' س اور ص میں فرق نہ کر پاتے تھے۔ ع اور الف میں ان کے ہاں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس کے باوجود امام ذہبی ان کو ''عالم اہل الشام'' قرار دیتے ہیں اور حافظِ حدیث اور ماہر فقہ کے طور سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

ابومسہر اور بعض دیگر حضرات کا بیان ہے کہ سندھ کے اس جلیل القدر محدث و فقیہ نے ۱۱۳ ہجری میں وفات پائی۔ ابونعیمؒ کے بقول ان کا انتقال ۱۱۲ ہجری میں ہوا۔ (۲)

۱۳۔ عبدالرحمٰن بن عباسؒ:

۸۲ یا ۸۳ ہجری میں عبدالرحمٰن بن عباس سندھ آئے۔ ان کی آمد سے پہلے سندھ کا جو علاقہ فتح ہو چکا تھا' اس کو منظم کرنے اور مزید علاقہ فتح کرنے کی طرف توجہ مبذول

۱۔ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۱۷۹۔۱۸۰۔۔۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۰۲۔۔۔ طبقات ابن سعد ج' ص ۲۲۱' ۲۲۲۔۔۔ البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۱۳۹۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۱۳۔۔۔ العقد الثمین ص ۱۳۰ تا ۱۳۲۔

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۸۹ تا ۲۹۳۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۴ ص ۳۶۸ تا ۳۷۰۔

فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انھوں نے سماع حدیث کی۔ ان کے دادا حضرت ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ ان کے والد عباس عوام و خواص میں بے حد قدر و منزلت کے مالک تھے۔

عبدالرحمٰن بن عباس نے سندھ میں وفات پائی۔ (۱)

۱۴۔ عبدالرحمٰن سندھیؒ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ امام بخاری نے التاریخ الکبیر میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی سند سے ایک حدیث بھی درج کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں۔

عبدالرحمن السندی سمع انساً کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یأکل ولایتو ضأمن اللحم. (۲)

یعنی عبدالرحمٰن سندھی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کرتے تھے۔

۱۵۔ قطن بن مدرک کلابیؒ:

قبیلۂ بنوکلاب سے تعلق رکھتے تھے۔ تابعی تھے اور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عمال و امرا میں سے تھے۔ جہادِ سندھ میں یہ محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔ اسی زمانے میں جب کہ یہ پاک باز لوگ سندھ کے محاذ پر مصروف جہاد تھے، حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے نام ایک مکتوب بھیجا، جس میں قطن بن مدرک کلابی کی بہت تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ قطن پر مکمل اعتماد کیا جائے۔ یہ صادق القول، وفادار اور لائق احترام شخص ہیں۔ خیانت و بددیانتی سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے۔

۱۔ تاریخ طبری ج ۶ ص ۳۷۳۔ الکامل ابن اثیر جلد ۴ ص ۱۸۷۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۰۵۔۔۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۱۷۔۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیھا من الصحابہ والتابعین۔

۲۔ التاریخ الکبیر ج ۳ ص ۲۹۵

قطن کافی عرصہ سندھ میں رہے اور وہاں شعائرِ اسلام پھیلانے کے سلسلے میں انھوں نے بڑی جدو جہد کی۔ (۱)

۱۶۔ قیس بن ثعلبہؒ:

یہ تابعین کے اس عالی مرتبت گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے درسِ حدیث اور تبلیغ سنت کے ساتھ ساتھ جنگ و جہاد میں بھی با قاعدہ حصہ لیا۔ یہ محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ ایک سپاہی کی حیثیت سے واردِ سندھ ہوئے اور دیبل کے محاذ پر جنگ میں حصہ لیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ (۲)

۱۷۔ کہمس بن حسن بصریؒ:

عبادت و زہد میں منفرد تھے۔ محمد بن قاسم کی کمان میں سندھ پر حملہ کیا۔ ابن سعد نے ان کو طبقۂ رابعہ کے بصری محدثین و تابعین میں شمار کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل، ابن حبان، ابن سعد، یحییٰ بن معین اور دیگر بہت سے حضرات نے ان کو ثقہ راوی حدیث قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی تصنیف التاریخ الکبیر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن قاسم کی قیادت میں جہاد کی غرض سے جو لشکر سندھ آیا، اس میں یہ شامل تھے۔ ۱۴۹ ہجری میں وفات پائی۔ مشہور بزرگ حضرت حسن بصریؒ کے بیٹے تھے۔ (۳)

۱۸۔ یزید بن ابو کبشہ سکسکی دمشقیؒ:

حضرت یزید بن ابو کبشہ دراصل دمشق کے رہنے والے تھے اور تابعین کی عالی قدر جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ابن حبان نے ان کو روایتِ حدیث میں ثقہ قرار دیا ہے۔ صحابہ میں سے یزید بن ابو کبشہ نے حضرت شرحبیل بن اوس اور حضرت ابو الدرداء سے روایتِ حدیث کی۔ اپنے باپ ابو کبشہ اور مروان سے بھی سماع روایت کی۔ خود یزید

۱۔ اسد الغابہ ج ۱ ص ۱۲۹۔

۲۔ لسان المیزان ج ۴ ص ۴۷۷۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۸۵ نیز دیکھئے ص ۴ تا ۵

۳۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۰۷۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ صفوۃ الصفوۃ ج ۳ ص ۴۳۴، ۴۳۵۔

بن ابو کبشہ سے بھی بہت سے حضرات نے علم حدیث حاصل کیا۔

آخر میں یزید بن ابو کبشہ کو علاقہ سندھ کا والی بنا دیا گیا تھا۔ یہ سندھ تشریف لائے اور فرائض امارت ادا کرنا شروع کیے۔ لیکن یہاں آنے کے اٹھارہ دن بعد ۹۶ ہجری میں وفات پا گئے۔ (۱)

۱۹۔ موسیٰ سیلانیؒ :

سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔

مقدمہ ابن الصلاح میں موسیٰ سیلانی کو ثقہ قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے:

اسناده جيد، حدث به مسلم بحضرة ابى زرعة، وذكره ابن ابى حاتم الرازى وابن الاثير الجزرى، وو ثقه يحيىٰ بن معين. (۲)

۲۰۔ موسیٰ بن یعقوب ثقفیؒ :

موسیٰ بن یعقوب وہ محدث اور تابعی تھے جو محمد بن قاسم کے زمانے میں سندھ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، عرب کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس سے محمد بن قاسم کا تعلق تھا یعنی قبیلہ بنو ثقیف سے۔۔۔! قرآن و حدیث اور معاملہ فہمی میں مہارت کی بنا پر محمد بن قاسم نے ۹۳ ہجری میں سندھ کا شہر اروڑ فتح کرنے کے فوراً بعد انھیں اس شہر کی مسندِ قضا و خطابت پر متمکن کر دیا تھا۔ بعد میں پورے سندھ کے قاضی القضاۃ بنا دیے گئے تھے۔

موسیٰ بن یعقوب ثقفی کا خاندان قرآن و حدیث پر عبور اور فراوانیٔ علم کے اعتبار سے دیارِ سندھ کا مشہور خاندان تھا۔ ان کے اخلاف کو ہر دور میں عزت و احترام کا مستحق گردانا گیا۔ یہ خاندان سلطان شمس الدین ایلتتمش (متوفی ۶۳۳ھ) کے عہد تک سندھ اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں موجود تھا۔

۱۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۴۳۲۔۔۔تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۵۴، ۳۵۵۔

۲۔ مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۴۶۔۔۔العقد الثمین ص ۲۱۷

۲۱۔عبدالرحمٰن کندیؒ:

امام ابنِ حزم نے ''جمھرۃ انساب العرب'' میں لکھا ہے کہ والیٔ عراق حجاج بن یوسف نے ان کو بجستان کا والی مقرر کر دیا تھا' جو (بعض روایات کے مطابق) اس وقت سندھ کا حصہ تھا۔ اپنے دورِ ولایت و امارت میں انھوں نے بعض ملوکِ ہند سے جہاد کیا۔

حجاج نے ان کو ۸۰ ہجری میں امارتِ بجستان کی سند دے کر بھیجا تھا۔ جب وہاں ان کے قدم جم گئے اور لوگوں پر اثر ورسوخ قائم ہو گیا تو انھوں نے حجاج کی اطاعت گزاری سے انکار کر دیا تھا اور اس سے باغی ہو گئے تھے۔

مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ حجاج نے عبدالرحمٰن کندی کو بجستان کا اور اس کے علاوہ بست' رخج اور ان ترک قبائل کا امیر بنا کر بھیجا تھا' جو اس زمانے میں وہاں آباد تھے۔ ان قبائل میں غور اور خلج کے قبائل بھی تھے۔ اپنے عہدِ امارت میں عبدالرحمٰن کندی نے متعدد والیانِ ہند سے جنگیں لڑیں۔

سنن ابی داؤد اور بعض دیگر کتبِ احادیث میں ان کی سند سے چند حدیثیں مندرج ہیں۔

منقول ہے کہ ۹۰ ہجری سے کچھ عرصہ بعد حجاج بن یوسف نے انھیں قتل کرا دیا تھا۔(۱)

۲۲۔عبدالرحمٰن بیلمانیؒ:

ان کا شمار حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے موالی میں ہوتا ہے۔ ان کی کنیت ابو حاتم تھی۔

یہ وہ تابعی ہیں جنھوں نے صحابہ میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عباس' عثمان بن عفان' عبداللہ بن عمر' سعید بن زید' عبداللہ بن عمرو' حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن اوس رضی اللہ عنہم سے روایتِ حدیث کی۔ تابعین کی جماعت میں سے انھوں نے عبدالرحمٰن اعرج اور نافع بن جبیر بن مطعم سے روایت کی۔

۱۔ جمھرۃ انساب العرب ص ۴۲۵۔۔ مروج الذہب ج ۳ ص ۱۳۸' ۱۳۹۔۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۵۶۔ الاغانی ج ۴ ص ۱۷۴۔۔ رجال السند والہند ص ۴۳۹' ۴۴۰۔

ابنِ حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے اور دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

ضعیف لاتقوم به حجة.

یعنی عبدالرحمٰن بیلمانی ضعیف راوی ہیں' ان کی مرویات کو قابل حجت نہیں مانا جاسکتا۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مولیٰ تھے اور بیلمانی تھے۔ بیلمان' بھیلمان کا معرب ہے جو سندھ گجرات کاٹھیاواڑ اور مارواڑ کے درمیان ایک قصبہ تھا اور یہ قصبہ جنید بن عبدالرحمٰن مری کے ہاتھوں بنوامیہ کے مشہور حکمران ہشام بن عبدالملک کے عہدِ حکومت میں فتح ہوا۔ (۱)

۲۳۔ عمر بن عبیداللہ قرشی تیمیؒ:

ان کی کنیت ابوحفص تھی۔ یہ عرب کے اصحابِ سخاوت اور نیک تریں لوگوں میں سے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب ہو کر انھوں نے کابل کا علاقہ فتح کیا۔ جب مخالفینِ اسلام سے جہاد کرتے اور فتوحات حاصل کرتے ہوئے یہ کابل کی حدود میں داخل ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پاس آئے۔

چچ نامہ کی روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عمر بن عبیداللہ کو ارمائیل میں جہاد کی غرض سے بھیجا تھا۔ ارمائیل سندھ کا ایک شہر تھا۔ ایک روایت کے مطابق ارمائیل کو اب لسؔ بیلہ کہا جاتا ہے جو قلات میں واقع ہے۔

حجاج بن یوسف نے عمر بن عبیداللہ کو ضمیر کے مقام پر قتل کرادیا تھا جو دمشق سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت عمر بن عبیداللہ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ (۲)

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۳۶۔۔۔تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۱۴۹' ۱۵۰۔۔۔العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابة والتابعین ص ۲۱۸

۲۔ رجال السند والہند ص ۲۶۰ تا ۲۶۳۔

٢٤۔ شمر بن عطیہ بن عبدالرحمٰن اسعدیؒ:

ثقہ راوی تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ ان سے کئی صحیح احادیث مروی ہیں۔

شمر بن عطیہ وہ تابعی ہیں جو جہاد کے سلسلے میں محمد بن قاسم کے ساتھ واردِ سندھ ہوئے تھے اور جنھوں نے فتوحاتِ ہند میں حصہ لیا تھا۔

چچ نامہ میں ان کا نام بشیر لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ ان کا اسم گرامی شمر ہے۔ (١)

٢٥۔ سعید بن اسلم کلابیؒ:

ان کا شمار تابعین کی پروقار جماعت میں ہوتا ہے۔ تاریخ الکبیر میں امام بخاری نے لکھا ہے کہ سعید بن اسلم نے بنوکلاب کے ان موالی سے روایتِ حدیث کی جو قبیلہ بنوغفار سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔

ابن حبان نے سعید بن اسلم کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

ابن ماکولا نے لکھا ہے کہ سعید بن اسلم کو سندھ کا والی مقرر کیا گیا تھا اور ان کے بیٹے مسلم کا تقرر خراسان کی ولایت پر ہوا تھا۔

بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف عراق کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے سعید بن اسلم کلابی کو مکران اور اس کی سرحد کی ولایت پر مامور کیا تھا۔

یعقوبی کے بقول حجاج نے سعید بن اسلم کو سندھ اور ہند کی سرحدوں کا والی بنایا تھا اور ان کی رہائش مکران میں تھی۔ انھیں شہید کر دیا گیا تھا اور عرب شاعر فرزدق نے ان کے قتل کے بعد چند اشعار کہے تھے۔ (٢)

٢٦۔ سعید بن کندیر قشیریؒ:

طبری کی روایت کے مطابق سعید بن کندیر کا شمار خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی

١۔ طبقات ابن سعد ج ٧ ص ٢١٠۔۔۔ فتوح البلدان ص ٢٧٨۔۔۔ رجال السند والہند ص ٩٦، ٣٩٤۔

٢۔ تاریخ الکامل ج ٤ ص ٧، ١٤٧۔۔۔ فتوح البلدان ص ٤٢٣۔۔۔ الاکمال (ابن ماکولا) ج ٦ ص ٩٥۔۔۔ جمہرۃ انساب العرب ص ٢٨٧۔۔۔ رجال السند والہند ص ٤١٤ تا ٤١٦۔

اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے ولات اور امرائے سندھ و مکران میں ہوتا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے وقت یہ مکران کے منصبِ امارت پر فائز تھے۔ (۱)

۲۷۔ سعد بن ہشام انصاریؒ:

یہ وہ تابعی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی تھے۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایتِ حدیث کی اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی سماعِ حدیث کا شرف حاصل کیا۔

امام نسائی نے سعد بن ہشام کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ سرزمین مکران میں جہاد کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ یہ ثقہ راوی تھے۔

امام بخاری ''التاریخ الکبیر'' میں رقم طراز ہیں کہ حصین بن نافع نے حضرت حسن بصری سے سعد بن ہشام انصاری کے بارے میں یہ الفاظ سنے۔

قتل بارض مکران علیٰ احسن حالہ.

یعنی سعد بن ہشام انصاری نے ارضِ مکران میں بہترین حال میں مرتبۂ شہادت پایا۔

تقریب التہذیب میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ثقة من الثالثة' استشهد بارض الهند.

کہ سعد بن ہشام ثقہ تھے اور محدثین کے طبقۂ ثالثہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خطۂ ہند میں شربتِ شہادت نوش فرمایا: (۲)

۲۸۔ حباب بن فضالہ ذہلیؒ:

ارض ہند سے کسی نہ کسی شکل میں تعلق رکھنے والے جن تابعین عظام اور عالی مقام

۱۔ رجال السند والہند ص ۴۱۸۔

۲۔ التاریخ الکبیر۔۔۔تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۸۳۔۔۔رجال السند والہند ص ۴۱۳، ۴۱۴۔

اصحابِ حدیث کے اسمائے گرامی قدیم کتب تاریخ میں مرقوم ہیں' ان میں ایک نام حباب بن فضالہ ذہلی کا ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ منقول ہے کہ ہندوستان آنے والے اسلامی لشکر میں ان کا نام لکھا گیا تھا۔ انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فتویٰ پوچھا کہ والدین سے اجازت لیے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہوں یا نہیں۔۔؟ حضرت انسؓ نے واپس والدین کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا۔

خود حضرت فضالہ ذہلی فرماتے ہیں:

اتيت البصرة فلقيت انس بن مالك فقلتَ له انى اردت سفرا فاردت ان استامرك.

قال: واين تريد؟

قلت: الهند.

قال: فحي والداك او احدهما؟

قلت: حيان.

قال: فراضيان بمخرجك؟

قلت: بل ساخطان' استعدىٰ على ابى و حبسنى السلطان .

قال: فالدنيا تريد اوالاخرة؟

قلت: كليهما.

قال: ما اراك الاستحبطهما كلتيهما. ارجع الى ابويك' فبرهما واصحبهما' فانك لن تصيب كسباً خيراً منه.

یعنی حباب بن فضالہ کہتے ہیں' میں بصرے آیا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ملا۔ میں نے ان سے عرض کیا' میں سفر پر جانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے آپ سے اجازت کا طالب ہوں۔

فرمایا: کہاں جانا چاہتے ہو۔؟

عرض کیا: ہندوستان!

فرمایا: تمھارے ماں باپ دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟

عرض کیا: دونوں زندہ ہیں۔

فرمایا: وہ تمھارے جانے پر خوش ہیں؟

میں نے جواب دیا: خفا ہیں۔ میرے والد نے مجھ پر زیادتی کی۔ (وہ مجھے سلطان کے پاس لے گئے) اور سلطان نے مجھے جانے سے روک دیا۔

فرمایا: دنیا چاہتے ہو یا آخرت؟

عرض کیا: دونوں!

فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ضائع کر بیٹھو گے۔ جاؤ' ماں باپ کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو۔ ان کی خدمت میں رہو' تمھارے لیے اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔ (۱)

۲۹۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ ؒ:

کوفے کے رہنے والے تھے اور کوفے کے شعراے بنو امیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تابعین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

غزوۂ مکران میں شریک تھے جواب پاکستان کے صوبہ سندھ کا علاقہ ہے۔ (۲)

۳۰۔ حارث بن مرہ عبدی:

بعض اصحابِ تاریخ وسیرت نے حارث بن مرہ عبدی کو تابعی اور بعض نے مدرک صحابی قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معتمد علیہ ساتھی اور معاون تھے۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں اور ان کے حکم سے ۳۸ ہجری کو حدودِ ہند میں داخل ہوئے۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حارث بن مرہ اور ان کے بعض ساتھیوں نے

۱۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال (حافظ ذہبی) ج ۱ ص ۲۰۸۔

۲۔ رجال السند والہند ص ۲۲۸' ۲۲۹۔ بحوالہ الاغانی۔

۴۲ ہجری کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے قلات میں جامِ شہادت نوش کیا۔ (۱)

۳۱۔ حارث بیلمانیؒ:

یہ وہ تابعی تھے، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و ممتاز صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایتِ حدیث کا شرف حاصل کیا۔ پھر خود بھی مسند درسِ حدیث آراستہ کی۔

بیلمان، بھیلمان کی تعریب ہے۔ اس زمانے میں یہ ایک گاؤں یا قصبہ تھا، جو سندھ، گجرات کاٹھیاواڑ اور مارواڑ کے درمیان کہیں واقع تھا۔ (۲)

۳۲۔ ایوب بن زید ہلالیؒ:

ان کی کنیت ابوسلیمان تھی اور ان کا تعلق عرب کے قبیلے بنی ہلال بن ربیعہ سے تھا، اس لیے ہلالی کہلاتے تھے۔ ان پڑھ دیہاتی تھے۔ لیکن عرب کے مشہور فصیح و بلیغ خطیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سندھ، ہندوستان، مکران اور بامیان کے علاقوں میں بغرضِ جہاد و سیاحت آئے اور ان علاقوں کی آب و ہوا، تہذیب و ثقافت اور معاشرت کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کیں۔ یہ حجاج بن یوسف کا زمانہ تھا۔

حجاج نے کہا ہندوستان کے بارے میں بتاؤ، کیسا ملک ہے، اس کے باشندے کن عادات و اطوار کے حامل ہیں اور وہاں کی آب و ہوا کیسی ہے؟

جواب دیا:

بحرها در، وجبلها ياقوت، وشجرها عود، وورقها عطر واهلها طغام كقطع الحمام.

۱۔ رجال السند والہند ص ۳۷۸۔

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۰۴، ۲۹۴، ۲۹۵۔ بضمن محمد بن الحارث بیلمانی و محمد بن عبدالرحمٰن البیلمانی۔

(اس کے دریا موتی اگلنے والے، پہاڑ لعل و یاقوت کی کانیں، درخت عود و صندل کے حامل، پتوں میں خوشبو اور مہک، اس کے باشندے کم عقل فاختاؤں کی طرح ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے۔)

حجاج نے مکران کے بارے میں سوال کیا تو ایوب بن زید نے جواب دیا۔

ماء ھاوشل، وتمرھا دقل، وسھلھا جبل، ولصھابطل، ان کثرالجیش فیھا جاعوا وان قلوا ضاعوا.

(مکران میں پانی کم، کھجوریں ردی، میدان پہاڑوں کی مانند، چور بے باک، فوج زیادہ ہو تو بھوک کا خطرہ، کم ہو تو ضائع ہو جانے کا اندیشہ۔)

حجاج بن یوسف نے ۸۴ ہجری میں انھیں قتل کرا دیا تھا۔[1]

۳۳۔ حری بن حری باہلیؒ:

عبیداللہ بن زیاد نے ان کو خطۂ ہند کے مفتوحہ علاقوں کا والی مقرر کیا تھا۔ ان کی کمان میں ہندوستان کی طرف جو فوج روانہ کی گئی تھی، اس نے متعدد علاقے فتح کیے اور کامیاب واپس گئی۔ حری بن حری دراصل حضرت سنان بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ کی فوج کے ایک حصے کے قائد تھے۔[2]

۳۴۔ عباد بن زیاد بن ابوسفیان:

عباد نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ اور حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ دونوں بھائیوں سے روایت حدیث کی۔ خود ان سے زہری اور مکحول نے روایت کی، جن کا شمار اکابر ائمہ حدیث میں ہوتا ہے۔ مسح علی الخفین کی حدیث عباد بن زیاد سے مروی ہے۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ یہ ثقات میں سے تھے۔

۵۳ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو سجستان کا والی مقرر کر دیا تھا۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۲۷ تا ۲۳۲۔۔۔ رجال السند والہند ص ۳۶۰، ۳۶۱۔

۲۔ فتوح البلدان ص ۴۲۲

ایک روایت کے مطابق بجستان سندھ میں تھا اور اس کے کچھ حصے کو اب سیون شریف کہا جاتا ہے۔

عباد نے افغانستان کے شہر قندھار اور اس کے گرد و نواح میں دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا اور ہندوستان کے بعض ان علاقوں میں جو بت خانوں کی حیثیت سے مشہور تھے یا ان کے قرب و جوار میں تھے، جنگیں لڑیں۔

عباد نے حدودِ بجستان اور حدودِ ہند کے کئی مقامات میں سلسلۂ جہاد جاری رکھا۔ ایک مرتبہ وہ دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان کے بعض علاقوں میں داخل ہوئے اور رن کچھ تک پہنچے۔ اس نواح میں کچھ عرصہ ان کا قیام رہا۔ وہاں سے قندھار کا عزم کیا۔

عباد بن زیاد اموی نے ۱۰۰ ہجری میں وفات پائی۔ (۱)

۳۵۔ یزید بن مفرغ حمیریؒ:

ان کی کنیت ابو عثمان تھی اور تابعی تھے۔ دورِ بنو امیہ کے قادر الکلام شاعر اور ادیب تھے۔

یزید بن مفرغ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ پیکرِ صبر و قناعت اور باہمت مجاہد۔ جن دنوں عباد بن زیاد ہندوستان اور قندھار کے علاقوں میں غیر مسلموں کے خلاف مصروفِ جہاد تھے، یزید بن مفرغ ان کے ہم رکاب تھے۔ اس مردِ مجاہد نے ہندوستان کے علاقے رن کچھ میں بھی کفار کے ساتھ جہاد کیا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو علاقہ ہند کی طرف روانہ کیا تھا۔ انھوں نے ۶۹ ہجری میں وفات پائی۔ (۲)

۳۶۔ ربیع بن صبیح سعدی بصریؒ:

جلیل القدر تابعی تھے۔ حسن بصری، حمید الطویل، یزید رقاشی، ابو الزبیر، ثابت بنانی

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۹۳، ۹۴۔۔۔ رجال السند والہند ص ۴۳۵۔۴۳۶۔

۲۔ وفیات الاعیان ج ۵ ص ۳۸۴۔۔ الاغانی ج ۷ ص ۲۲۹۔۔ فتوح البلدان ص ۴۲۲۔۔۔ رجال السند والہند ص ۵۵۳۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند و من ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین ص ۱۰۹

اور مجاہد بن جبیر وغیرہ حضرات کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا اور روایتِ حدیث کی۔
حصولِ علم حدیث کے بعد خود مسندِ تدریس بچھائی اور ان سے سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، وکیع، ابن مہدی اور عاصم بن علی وغیرہ بڑے بڑے محدثین نے حدیث کی سماع و روایت کا شرف حاصل کیا۔

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب کی تیسری جلد میں ان کے متعلق مختلف محدثین کی آرا خاصی تفصیل سے بیان کی ہیں۔

ابن سعد کی روایت کے مطابق اس مردِ مجاہد نے بغرض جہاد بحری راستے سے عزمِ سندھ کیا۔ سمندر میں وفات پائی اور بحر ہند کے ایک جزیرے میں دفن کیے گئے۔

حافظ ابن حجر نے رامہرمزی کی کتاب الفاصل کے حوالے سے لکھا ہے کہ ربیع بن صبیح پہلے شخص ہیں، جنھوں نے بصرے میں حدیث کی کوئی کتاب تصنیف کی۔ انه اول من صنف بالبصره۔[1]

ان کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ ۱۵۹ ہجری میں عرب تاجروں کو اہل گجرات سے کوئی ایسی شکایت پیدا ہوئی، جس کی وجہ سے جنگ ناگزیر ہوگئی۔ اس کے لیے عباسی خلیفہ مہدی نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کے زیر کمان ایک بحری بیڑا روانہ کیا۔ ۱۶۰ھ میں یہ بیڑا بھاڑ بھوت پہنچا، جو بھڑوچ سے سات میل کے فاصلے پر بجانب مغرب ایک پکی بندرگاہ تھی اور وہاں سمندر کے مدوجزر کے ساتھ جہاز آتے جاتے تھے۔

زمین پر قدم رکھتے ہی اسلامی فوج نے غیر مسلموں پر حملہ کر دیا۔ اہل اسلام کی اس باقاعدہ فوج میں بہت سے رضاکار بھی تھے، جن کے سالار ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی بصری تھے، انھوں نے اسلامی فوج کے سامنے جہاد کے موضوع پر زوردار تقریر کی اور فوجیوں کو جہاد کے لیے جوش دلایا۔ اس کے بعد عرب مسلمانوں نے حملہ کر دیا اور مخالفینِ اسلام، اسلامی فوج کے اس پُرزور حملے کو روک نہ سکے۔

حملے کی تاب نہ لا کر باشندگانِ گجرات شہر میں چلے گئے اور پھاٹک بند کر لیا، اسلامی

۱۔ تہذیب التہذیب ج۳ ص ۲۴۷۔

فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے طول پکڑا تو لوگ تنگ آ گئے۔ آخر ایک دن عرب فوج شہر میں داخل ہو گئی اور شہر فتح کر لیا گیا۔ لوگ بھاگ کر بدھوں کے ایک عبادت خانے میں داخل ہو گئے۔ عربوں کو اس عبادت خانے پر قلعے کا شبہ گزرا' انھوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور جلد فتح کرنے کے لیے آتش گیر مادہ پھینکا' جس سے عبادت خانے میں آگ بھڑک اٹھی۔ کچھ لوگ جل کر مر گئے' باقی گھبراہٹ کے عالم میں باہر نکلے جو تہ تیغ کر دیے گئے۔

اس جنگ میں انتالیس عرب مسلمان شہید ہوئے۔ اتفاق سے یہ وہ دن تھے' جب وہاں ایک میلہ لگتا تھا' جس میں قرب و جوار کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ چوں کہ میلے میں شامل ہونے والوں کا بہت بڑا ازدحام تھا اور ساتھ ہی آتش گیر مادے کا اثر فضا میں پھیل گیا تھا' اس لیے شہر میں وبا پھوٹ پڑی' جس سے ایک ہزار مسلمان موت کا لقمہ بن گئے' جن میں ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی بصری بھی تھے۔ یہ ۱۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ [۱]

۳۷۔ مجاعہ بن سعر تمیمیؒ:

یہ وہ تابعی تھے' جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایتِ حدیث کی اور خود ان سے علی بن زید بن جدعان نے حدیث کے بیان و روایت کا شرف حاصل کیا۔

اموی حکمران عبدالملک بن مروان نے مجاعہ کو پہلے عمان کا امیر مقرر کیا' اس کے بعد ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کی امارت ان کے سپرد کی گئی۔ سندھ کے والی بھی مقرر ہوئے۔ علاقہ مکران میں جہاد کیا اور وہیں وفات پائی۔ [۲]

۳۸۔ عطیہ بن سعد عوفیؒ:

انھوں نے حضرت ابوہریرہ' ابوسعید خدری' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمر' زید

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۸۔۔ تاریخ الکامل ابن اثیر ج ۵ ص ۵۵۔۔ رجال السند والہند ص ۲۰۲ تا ۲۰۴۔

۲۔ التاریخ الکبیر ج ۲ ص ۲۰۱۔۲۰۲۔۔۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۱۷۔۔۔ رجال السند والہند ص ۵۱۰۔۵۱۱۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین ص ۱۱۷' ۱۱۸' ۱۲۲' ۱۲۳۔

بن ارقم، عکرمہ بن ثابت اور عبدالرحمٰن بن جندب رضی اللہ عنہم سے روایتِ حدیث کی۔ خود عطیہ سے حجاج بن ارطاۃ، عمرو بن قیس ملائی، محمد بن ابی لیلیٰ وغیرہ متعدد حضرات نے روایتِ حدیث کی۔

عطیہ، بسلسلۂ جہاد محمد بن قاسم کے ساتھ واردِ ہند ہوئے تھے۔ آرمائیل سے چلتے وقت محمد بن قاسم نے لشکر کو تیاری کا حکم دیا تو عطیہ بن سعد کو فوج کے میمنہ پر متعین کیا۔

فتحِ ملتان کے وقت یہ محمد بن قاسم کے ساتھ تھے۔ اس سے کچھ عرصے بعد واپس کوفے چلے گئے تھے۔ پھر وہیں رہے اور وہیں ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔ (۱)

۳۹۔ حسن بصریؒ:

حضرت حسن بن ابوالحسن یسار بصری بہت بڑے عالم وزاہد، عابد ومتقی اور حسین و جمیل تھے۔ کبار اور مشاہیر تابعین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ۲۱ ہجری میں پیدا ہوئے اور تمام اوصاف حسنہ سے نوازے گئے۔ ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی اور وادی القریٰ کے مقام میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ کئی مرتبہ خراسان، کابل اور سجستان کی جنگوں میں شریک ہوئے۔ ۴۰ ہجری میں حضرت ربیع بن زیاد حارثی سجستان کے محاذ پر روانہ ہوئے تو حسن بصری ان کے سیکرٹری تھے۔ ڈھائی سال کے لگ بھگ حضرت ربیع اس علاقے کے امیر رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے فہرج، زالق، کرکویہ، زرنگ وغیرہ متعدد مقامات فتح کیے۔ حسن بصری ہر مہم اور ہر فتح میں ان کے ہم رکاب تھے۔ قاضی اطہر مبارک پوری کی تحقیق کے مطابق فہرج کی فتح علاقہ سندھ کی فتح تھی، کیوں کہ یہ شہر سندھ میں واقع تھا۔

حسن بصری کا شمار جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد اکابر صحابہ کا زمانہ پایا اور ان سے سماع وروایتِ حدیث کا شرف حاصل کیا۔ ۱۱۰ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔ (۲)

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۳۰۴۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔۔۔ رجال السند والہند ص ۲۵۵۔

۲۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان ص ۲۶۷، ۲۶۸۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۵۴۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۳۔

۴۰۔ صیفی بن فسیل شیبانیؒ :

طبقات ابن سعد میں حضرت صیفی بن فسیل شیبانی کا تذکرہ ان کی بیوی سبیہ بنتِ عمیر شیبانیہ کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ وہ تابعیہ تھیں اور بصرہ میں مقیم تھیں۔ حضرت عثمان اور حضرت علی سے انھوں نے روایتِ حدیث کی۔

حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں حضرت صیفی جہاد کے سلسلے میں قندابیل گئے جو علاقہ سندھ کا شہر تھا۔ بیوی کو اطلاع پہنچی کہ قندابیل میں ان کے شوہر صیفی وفات پا گئے ہیں تو انھوں نے ایک شخص عباس بن طریف قیسی سے نکاح کر لیا۔ اس پر کچھ عرصہ گزرا تھا کہ صیفی واپس آ گئے۔ اب معاملہ حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا گیا تو صیفی دوسرے شوہر کے حق میں دست بردار ہو گئے۔

حضرت صیفی بن فسیل کو ۵۱ یا ۵۲ ہجری میں ان کے بعض رفقا کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔ (۱)

۴۱۔ ابوسلمہ زطیؒ :

ان کا تعلق برصغیر کے ان جاٹوں سے تھا جو عرب کے بعض علاقوں میں سکونت پذیر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بصرے کے سرکاری خزانے کی نگرانی پر جو لوگ متعین تھے، وہ برصغیر کے وہ جاٹ اور سیابجہ تھے، جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور بصرے میں اقامت گزیں تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد چالیس اور ایک کے مطابق چار سو تھی۔

ابوسالمہ زطی ان پہرے داروں اور محافظوں کے سردار تھے۔ بلاذری کے الفاظ ہیں۔

وكان على السيابجة يومئذ ابوسالمة الزطی وكان رجلاً

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۴۷۱۔۔۔ تاریخ طبری ج ۵ ص ۱۷۱۔۔۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان ص ۲۷۲، ۲۷۳۔

صالحاً.[1]

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بصرے کے خزانے کے ہندی محافظوں کے سردار ابوسالمہ زطی تھے جو ایک صالح آدمی تھے۔

۱۔ فتوح البلدان ص۳۶۹۔

تیسرا باب

برصغیر میں اہل حدیث کا تیسرا کارواں

محمد بن قاسم اور ان کے رفقائے کرام

برصغیر یعنی قارۃ الہند میں جس تیسرے کارواں کا آئندہ سطور میں ذکر کرنا مقصود ہے' وہ کارواں محمد بن قاسم کا ہے۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مختلف اوقات میں سرزمین برصغیر میں تقریباً بیالیس تابعین کی تشریف آوری کا ثبوت کتب رجال سے ملتا ہے' لیکن ہم نے تذکرہ اکتالیس تابعین کا کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بابرکت فہرست کے بہت بڑے رکن اور عظیم قائد محمد بن قاسم کا ذکر ہم ایک الگ اور مستقل باب میں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اس رفیع الشان جماعت کے بیالیسویں رکن ہیں جو ایک بہت بڑے کاروان جہاد اور ہزاروں کی تعداد پر مشتمل قافلہ حدیث کے ساتھ اس ملک میں وارد ہوئے اور پھر اس ملک کی دینی اور تہذیبی حالت بالکل بدل گئی اور واقعات ایک نئے قالب میں ڈھل گئے۔

آیئے اب محمد بن قاسم کے کوائف حیات اور ان کی عملی تگ و تاز کا مطالعہ کرتے ہیں' لیکن اختصار کے ساتھ۔۔۔۔ اس مرد مجاہد اور کاروان حدیث کے سپہ سالار عالی مرتبت کے تفصیلی حالات ہم نے اپنی ایک کتاب ''برصغیر میں اسلام کے اولیں نقوش'' میں بیان کیے ہیں۔ یہاں وہی باتیں بیان کی گئی ہیں جو پیش نگاہ کتاب کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔

محمد بن قاسم ثقفی' طائف کے قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے اور عراق کے شہر بصرہ کے رہنے والے تھے۔ ۶۵ ہجری کے پس و پیش ان کی ولادت ہوئی۔ وہ صحابہ کرام اور تابعین کا زمانہ تھا' جسے اسلامی تاریخ میں خیر القرون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمد بن قاسم کا

شمار تابعین یعنی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عالی مقام شاگردوں میں ہوتا ہے' اگرچہ ہمیں تفصیل نہیں ملتی' لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے صحابہ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ ان کے عہد مبارک میں جو صحابہ کرام بصرہ میں اقامت گزیں تھے' ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت گزار خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہے۔ تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بہ اختلاف روایات ۹۱ یا ۹۲ یا ۹۳ ہجری میں بصرہ میں وفات پائی اور بصرہ ہی حضرت محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا مسکن تھا۔

محمد بن قاسم کو بارگاہِ الٰہی سے جن اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ گوناگوں سے نوازا گیا تھا' وہ تھے صالحیت' تقویٰ شعاری' علم وعرفان' بہادری' کشور کشائی' فنونِ حرب میں مہارت اور جنگی صلاحیتوں سے بہ درجہ کمال آگاہی۔ ان صفات سے ابتدائے عمر ہی میں اللہ نے ان کو بہرہ مند فرما دیا تھا۔

بنوثقیف کی خدمت اسلام

عراق کا گورنر اس زمانے میں حجاج بن یوسف تھا' اس کا تعلق بھی طائف کے قبیلہ بنو ثقیف سے تھا اور جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتوں میں مبتلا کیا تھا' ان میں طائف کے لوگ بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے نبی ﷺ وہاں تشریف لے گئے تو انھوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے جس کی وجہ سے آپ کے جسم سے خون بہنے لگا تھا۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ ان لوگوں کا ذہن یکسر بدل گیا اور انھوں نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی' جہاد کی صورت میں بھی' تبلیغ کی صورت میں بھی اور تدریس قرآن وحدیث کی صورت میں بھی۔۔۔!

سب سے پہلے عہدِ فاروقی میں جو صحابہ کرام بحری بیڑے کے ذریعے ۱۵ ہجری میں وارد ہند ہوئے تھے وہ قبیلہ بنوثقیف کے معزز ارکان تھے' جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا' وہ تین بھائی تھے' حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی' حکم بن ابوالعاص ثقفی اور مغیرہ بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہم۔ یہ وہ صحابہ کرام تھے جن کی قیادت میں اہل حدیث کا اولیں

قدم رکھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ صحابہ پر مشتمل تھا۔ اس مقدس گروہ نے ۱۵ ہجری میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں قارۂ ہند کا رخ کیا تھا اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں اس سرزمین کے بہت سے حصوں کو پامال کر ڈالا تھا۔ جن علاقوں کو انھوں نے فتح کیا' ان میں حسب حال امارتیں قائم کرتے گئے تاکہ مفتوحہ مقامات باقاعدہ طور سے نظم ونسق کی سلک میں منسلک ہوتے جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق وہ خیر القرون تھا اور اس دور کے لوگ یعنی صحابہ وتابعین اور تبع تابعین جہاں جاتے' قرآن وسنت کے احکام ان کے ساتھ جاتے تھے۔ سندھ اور ہند کے علاقوں میں بھی یہ ذخیرہ ان کے ساتھ رہا اور وہ لوگوں کو اس کی تبلیغ فرماتے رہے۔ انھوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور درس وتدریس کے حلقے قائم کیے۔ درس و تدریس کے وہ حلقے موجودہ حلقوں کی طرح صرف ونحو اور فقہ واصول کی کتابوں ہدایہ' شرح وقایہ اور نور الانوار وغیرہ کی تدریس کے حلقے نہ تھے بلکہ خالص قرآن وحدیث کی تعلیم کے حلقے تھے۔

محمد بن قاسم کے حملے کا پس منظر

۶۵ھ میں جب کہ اموی خلیفہ مروان بن حکم کا آخری زمانہ تھا' عمان کے قبیلے بنو سامہ کے دو شخص جو کہ حقیقی بھائی تھے' علاقۂ سندھ کے اس حصے پر پوری طرح غالب اور قابض ہو گئے تھے' جسے مسلمان کچھ عرصہ پہلے فتح کر چکے تھے۔ یہ تھے معاویہ بن حارث علافی اور محمد بن حارث علافی۔۔۔ انھوں نے مرکزی حکومت سے بغاوت کی راہ اختیار کر لی تھی اور مرکز کے احکام وہدایات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ۶۵ھ سے ۷۹ھ تک تقریباً چودہ سال یہی صورتِ حال رہی۔ علافی برادران کی بغاوت کا آغاز مروان بن حکم کے دورِ خلافت میں ہوا تھا۔ انہی دنوں مروان کا انتقال ہو گیا تو عبدالملک بن مروان تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کے دور میں بھی کافی عرصہ معاویہ بن حارث علافی اور محمد بن حارث علافی کا مرکزی حکومت سے انکار وبغاوت کا سلسلہ جاری رہا۔

حجاج بن یوسف عراق اور مشرقی ممالک کا گورنر تھا۔ اس حیثیت سے سندھ اور ہند

کے معاملات اس کے سپرد تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی جری وشجاع اور فہیم و دانا حاکموں کو سندھ کے مفتوحہ علاقوں کے انتظامی امور کو صحیح خطوط پر چلانے کے لیے بھیجا، مگر حالات درست نہ ہوئے اور متعدد لائق اور قابل تریں آدمی قتل کر دیے گئے۔

علافی برادران اور ان کے ہم نواؤں کو درحقیقت راجا داہر کی امداد حاصل تھی۔ اسی کی اعانت اور پشت پناہی کی بنا پر وہ سندھ کے مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے اور مرکز کی نافرمانی کر رہے تھے۔

حجاج بن یوسف نے راجا داہر کو بار بار خطوط لکھے اور کئی پیغام بھیجے کہ وہ ان باغیوں کی مدد نہ کرے، مگر وہ اس سے باز نہ آیا اور مرکزی حکومت سے بغاوت کرنے والوں کی برابر مدد کرتا رہا۔ راجا داہر کے اس طرزِ عمل سے حجاج بن یوسف کو سخت صدمہ پہنچا۔

ایک اور فتنہ

علافیوں کا زور تو حجاج بن یوسف کی کوششوں سے ٹوٹ گیا، لیکن اس کے فوراً بعد برصغیر کے اسلامی مقبوضات میں ایک اور فتنہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ ۸۰ھ میں والیٔ عراق حجاج بن یوسف نے عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو بجستان کا امیر مقرر کیا، جس نے بڑی فتوحات حاصل کیں اور اس نواح کے حکمرانوں کو ہر میدان میں شکست دی۔ اس کی فتوحات کا دائرہ برصغیر کے بعض مقامات تک پھیلتا چلا گیا۔ ۸۱ھ میں عبدالرحمٰن نے عراق کے معلمین وقرائے کرام کی ایک بڑی جماعت کو اپنے ساتھ ملایا۔ ان لوگوں نے پہلے حجاج بن یوسف کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، پھر خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مخالفت میں علم جہاد لہرایا۔ مخالفین کی فوج کے بہت سے لوگ بجستان، مکران اور سندھ کے غیر مسلم حکمرانوں کی پناہ میں آ گئے تھے اور ان کی انگیخت پر مرکزی حکومت کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ ۸۰ھ سے ۸۵ھ تک پانچ سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ حجاج بن یوسف کو اس کا شدید قلق تھا اور سندھ کے راجوں مہاراجوں نے جو روش اختیار کر لی تھی، وہ حجاج کے مزاج وفطرت کے قطعی خلاف تھی، جس کا اسے انتہائی رنج تھا۔

کارواں قارۃ الہند میں وارد ہوا تھا۔

محمد بن قاسم بھی اسی قبیلے کے رکن رکین تھے۔ حجاج بن یوسف بھی اسی قبیلے کا فرد تھا جو بنوامیہ کے زمانے میں عراق کا گورنر مقرر رہا اور اس نے ہندوستان سمیت متعدد ملکوں اور علاقوں میں فوجیں بھیجیں اور انھیں فتح کیا اور ان میں اسلام پھیلایا۔

محمد بن قاسم بنوامیہ کی فوج میں

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا محمد بن قاسم ابتداے عمر ہی میں فوجی اصول وقواعد سے باخبر ہوگئے تھے۔ اس دور میں فارس کے مختلف علاقوں میں کردوں نے مسلمانوں کے خلاف شدید ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ ۸۳ ہجری میں جب کہ محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ اٹھارہ برس کی تھی، حجاج بن یوسف نے ان کو فارس کی مہم پر روانہ کیا اور کردوں کی سرکوبی کا حکم دیا۔ انھوں نے نہایت سرگرمی، انتہائی بہادری اور جنگی حکمت عملی سے یہ خدمت انجام دی اور کرد قبائل کی ہنگامہ آرائیاں ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

سندھ کی طرف روانگی

اس سے دس سال بعد عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کی جانب سے ۹۳ ہجری میں فارس ہی سے انھیں سندھ کی طرف روانہ ہونے اور اس علاقے پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم ملا۔ عراق کی گورنری کے علاوہ اسلامی قلمرو کے تمام مشرقی ملکوں کی نگرانی حجاج بن یوسف کے سپرد تھی اور ان علاقوں میں فوجی کارروائی کا ذمے دار وہی تھا اور اسی کے حکم سے اس نواح میں عساکرِ اسلامی حرکت میں آتے تھے۔ اب اس کے حکم سے محمد بن قاسم نے سندھ کا رخ کیا۔

گزشتہ صفحات میں یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے ابتدائی دور ہی میں برصغیر پاک و ہند کے بہت سے لوگ اسلام سے آشنا ہوگئے تھے اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت نے ان کو اپنے دائرۂ اثر میں لینا شروع کر دیا تھا۔ اسلام کا اولیں کارواں جس کا جہاز بحر ہند کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور جس نے سب سے پہلے برصغیر کی دہلیز پر

راجا داہر کے آدمیوں کا کشتیوں پر حملہ

اسی زمانے میں ایک اور حادثہ رونما ہوا' جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کچھ عرصے سے عرب کے چند مسلمان خاندان تجارت کے سلسلے میں سرندیپ (سیلون) میں فروکش تھے۔ ان کے آبا واجداد وفات پا گئے تو سرندیپ کے غیر مسلم حکمران نے ان کی عورتوں اور بچوں کو اپنی خاص کشتیوں کے ذریعے واپس عرب بھیجنے کا انتظام کیا۔ ان کا مال و اسباب بھی کشتیوں میں لاد دیا گیا تھا۔

سرندیپ کے راجا نے نہایت اکرام واعزاز کے ساتھ اپنے قابل اعتماد اور خاص درباری آدمیوں کی نگرانی میں ان لوگوں کو روانہ کیا تھا۔ اس سے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے' ایسا نہ ہو کہ وہ سرندیپ پر حملہ کر دیں اور اس کی حکمرانی ختم ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ عین ممکن ہے ان یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے واپس نہ بھیجنے کی بنا پر مسلمان خلیفہ اس کے ملک میں فوجی کارروائی کرے۔ اس نے حجاج بن یوسف اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے لیے قیمتی ہدایا وتحائف بھی ان کشتیوں میں بھیجے تھے۔

یہ کشتیاں سرندیپ سے روانہ ہو کر ساحل سمندر کے قریب قریب سفر کرتی ہوئی خلیج فارس کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ وہاں یہ لوگ خشکی پر اتریں گے اور پھر حاکم سرندیپ کے تحائف سمیت حجاج کی خدمت میں کوفے پہنچ جائیں گے۔ لیکن راستے میں بادِ مخالف کے طوفان نے ان کشتیوں کو دھکیل کر سندھ کی بندرگاہ دیبل میں لا ڈالا۔ ان کو دیکھتے ہی وہاں بحری ڈاکو اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر آ گئے اور ان کو گھیر لیا۔ حملہ کر کے عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا' ان کا سامان لوٹ لیا اور خلیفہ عبدالملک بن مروان اور حجاج بن یوسف کی طرف جو تحائف بھیجے گئے تھے' وہ ان سے چھین لیے۔

جہاز میں عرب کے قبیلے بنی یربوع کی ایک عورت بھی سوار تھی۔ جب جہاز کو لوٹا اور عورتوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا' اس عورت نے نہایت دردناک آواز میں حجاج بن یوسف کی دہائی دی اور پکارا ''یا حجاجاہ''!

(اے حجاج! تو کہاں ہے، ہماری مدد کو آ۔۔)

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حجاج کو کسی نے اس پکار کے بارے میں بتایا تو اس نے جواب دیا:

''لبیک''!

میں اپنی ان تمام فکری و عملی توانائیوں اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہیں، حاضر ہوں۔

یہ حادثہ راجا داہر کے علاقے میں ہوا تھا اور جن بحری قزاقوں نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا اور لوٹا تھا، وہ داہر کی رعیت تھے۔ جب یہ خبر عراق پہنچی اور اس کی تفصیل حجاج بن یوسف کے علم میں آئی تو وہ سخت پریشان ہوا اور راجا داہر کو پیغام بھیجا کہ جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، انھیں سزا دی جائے۔ راجا نے حجاج کے پیغام پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہ میں ان کو گرفتار کر سکتا ہوں، نہ کوئی سزا دے سکتا ہوں۔

حجاج ایک ملک کے بااختیار حکمران کی طرف سے اس قسم کے جواب کی توقع نہ رکھتا تھا۔ وہ یہ جواب سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ یہ عبدالملک بن مروان کا دورِ حکومت تھا۔ حجاج نے دربارِ خلافت سے داہر پر براہ راست حملے کی اجازت طلب کی، مگر بعض مصالح کی بنا پر اجازت نہ ملی۔ پھر حجاج نے ڈاکوؤں اور حملہ آوروں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لیے ایک مہم روانہ کی، جو کامیاب نہ ہو سکی۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا، ڈاکوؤں کو ختم کرنے یا ان کی گوشمالی کے لیے جو کوششیں کی گئیں وہ ناکام رہیں اور ہر مرتبہ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے بعد اس مہم کو سرانجام دینے کے لیے اس کی نظر محمد بن قاسم پر پڑی جو اس وقت فارس کے علاقے میں مصروف کار تھے۔

یہ تھے وہ اسباب جنھیں محمد بن قاسم کے سندھ پر فیصلہ کن حملے کا پس منظر کہنا چاہیے۔

محمد بن قاسم کے بارے میں یہاں چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔

۱۔ مشہور ہے کہ محمد بن قاسم رشتے میں حجاج بن یوسف کے حقیقی بھتیجے تھے۔ یہ صحیح نہیں، وہ حقیقی بھتیجے نہ تھے، رشتہ داری میں بھتیجے ہوں گے۔

۲۔ کہا جاتا ہے کہ حجاج کی بیٹی زینب سے محمد بن قاسم کی شادی ہوئی تھی۔ روایات سے یہ بات بھی پایۂ صحت کو نہیں پہنچتی۔

۳۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ محمد بن قاسم نے جب ہند اور سندھ کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کی، اس وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ سال تھی، یہ قطعاً غلط ہے۔ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں، یاقوت حموی نے معجم البلدان میں، بلاذری نے فتوح البلدان میں اور دیگر مستند مورخین نے لکھا ہے کہ ۸۳ھ میں فارس اور شیراز کی ولایت محمد بن قاسم کے سپرد کی گئی اور انھوں نے کردوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔۔۔ فتح سندھ و ہند کا واقعہ اس سے دس سال بعد ۹۳ھ میں رونما ہوا۔ اگر ۹۳ھ میں ان کی عمر سترہ سال مان لی جائے تو ۸۳ھ میں جب انھوں نے فارس کے علاقے کی زمام ولایت ہاتھ میں لی اور کردوں سے برسرِ پیکار ہوئے، ان کی عمر صرف سات سال تھی، اور یہ قطعی طور سے غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب وہ ولایت فارس کے لیے روانہ ہوئے، اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ بعض شعرا نے ان کی بہادری اور شجاعت سے متاثر ہو کر ان کے محاسن و مفاخر بیان کیے تو کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ حملۂ سندھ و ہند کے وقت وہ سترہ سال کے تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس وقت وہ ستائیس اٹھائیس برس کے تھے۔

۴۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے چند سو فوجیوں کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا تھا۔ اس میں بھی کوئی صداقت نہیں۔ واقعات اس کی تردید کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سندھ پر حملے کے وقت ان کی بری اور بحری فوج کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ چند سو آدمیوں کے ساتھ اتنے دور دراز علاقے پر حملہ کرنے کا کوئی حکومت یا فوج تصور بھی نہیں کر سکتی۔

بری اور بحری فوج

سندھ پر حملہ کرنے کے لیے بری فوج کے علاوہ بحری فوج بھی روانہ کی گئی تھی، جس کا بحری بیڑا بہت مضبوط تھا۔ اس کا انتظام بحری معاملات کے ماہرین کے سپرد کیا گیا تھا جو

اس کی نقل و حرکت کے تمام پہلوؤں کی نگرانی کرتے تھے۔ محمد بن قاسم نے جب فارس سے سندھ کی طرف یلغار کی تو بہت بڑی فوج ان کی کمان میں تھی' اس کے علاوہ چھ ہزار نفوس پر مشتمل شامی سپاہ ان کے ہم رکاب تھی' اور بھی بہت سے رضا کار اور سپاہی ان کے لشکر میں شامل تھے۔ اس ضمن میں بلاذری کے الفاظ لائق تذکرہ ہیں۔

وضم ستة الاف من جند اهل الشام و خلقاً من غيرهم. (۱)

یعنی فارس کی فوج کے علاوہ شام کے چھ ہزار فوجیوں کو محمد بن قاسم کی کمان میں روانہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے لوگ ان کے لشکر میں شامل کیے گئے۔

تمام جنگی ساز و سامان انھوں نے قیامِ شیراز کے زمانے میں تیار کیا۔ چھوٹی بڑی چیزوں کو جمع کرنے' فوج کو تربیت دینے اور برصغیر کے حالات و کوائف سے اچھی طرح مطلع ہونے کی غرض سے وہ چھ مہینے شیراز میں مقیم رہے۔ اس کے بعد مکران کی طرف روانہ ہوئے اور کنیر کے مقام پر پہنچے جو حدِ مکران سے پانچ دن کی مسافت پر تھا۔ کنیر سے مکران کے مرکزی شہر فنز پور کا عزم کیا۔ دو دن میں اس شہر میں آئے اور اس پر علم فتح لہرایا۔ وہاں سے چل کر چار دن میں ارمائیل کے مقام پر آئے اور اسے فتح کیا۔ مکران کا جو حصہ اس سے چند سال پہلے فتح ہو چکا تھا' اس کے امیر محمد بن ہارون نمیری تھے' وہ بھی اپنی فوج اور ساتھیوں سمیت محمد بن قاسم کے ہم رکاب ہو گئے' مگر راستے ہی میں محمد بن ہارون کا انتقال ہو گیا اور انھیں قنبل کے مقام میں دفن کر دیا گیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ارمائیل کو ارمئیل بھی کہا جاتا ہے جو مکران اور دیبل کے وسط میں سمندر سے تھوڑی دور واقع تھا۔ اب اسے ارمن بیلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور قلات ڈویژن میں ضلع لس بیلہ کا صدر مقام ہے' کراچی سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے۔

فنز پور اور ارمائیل کے شہر محمد بن قاسم نے اچھی خاصی جنگ کے بعد فتح کیے اور فتح کے بعد کئی مہینے وہاں مقیم رہے۔ ان علاقوں میں اپنے امیر اور والی مقرر کیے اور ان کے

۱۔ فتوح البلدان ص ۴۲۴

انتظامات کو مضبوط و مستحکم رکھنے کے لیے ان کے نام احکام جاری کیے۔

اب محمد بن قاسم نے عساکرِ اسلامی کو دیبل کی طرف حرکت کرنے کا حکم دیا جو ارمائیل سے چار دن کی مسافت پر اس زمانے کا بہت بڑا شہر تھا اور ساحل سمندر پر واقع تھا۔ یہی وہ شہر تھا' جہاں سے بحری ڈاکوؤں نے ان کشتیوں کو لوٹا تھا' جن پر سرندیپ کے راجا نے مسلمان عورتوں اور بچوں کو سوار کر کے عراق کی طرف روانہ کیا تھا۔ محمد بن قاسم نے ۹۳ھ کو رمضان کے مہینے میں جمعۃ المبارک کے دن اس شہر کی حدود میں قدم رکھے۔ اس وقت بہت بڑا لشکر ان کے ساتھ تھا' جس کے ایک حصے کی قیادت ابوالاسود جہم بن احر جعفی کر رہے تھے' جو فارس کی جنگوں میں شان دار خدمات سرانجام دے چکے تھے اور محمد بن قاسم ان کے جنگی کارناموں سے بہت متاثر تھے' ہزاروں افراد پر مشتمل بری فوج کے علاوہ تربیت یافتہ بحری بیڑا بھی ساتھ تھا' جس میں فوج' سامانِ جنگ' بہترین اسلحہ' رسد اور بہت سی ضروری چیزیں موجود تھیں۔ اس وقت محمد بن قاسم اٹھائیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور وہ تجربہ کار جرنیل' بہادر جنگ جو اور صاحب تدبیر سپہ سالار اور امیر تھے۔

یہ اہل حدیث کا تیسرا کارواں تھا جو محمد بن قاسم کی قیادت میں آیا اور اس نے سندھ و ہند کا بہت سا علاقہ فتح کر کے وہاں قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں بلند کیں۔

چوتھا باب

برصغیر میں اہل حدیث کا چوتھا کارواں

تبع تابعین

اب تک اہل حدیث کے وہ تین کارواں ہماری نظروں سے گزر چکے ہیں جو یکے بعد دیگرے خیرالقرون میں برصغیر میں تشریف لائے اور انھوں نے یہاں خالص کتاب و سنت کی تبلیغ کی۔ اب اس عہدِ بابرکت کا چوتھا کارواں ہمارے سامنے ہے جو اٹھارہ تبع تابعین پر مشتمل ہے۔ یہ بزرگان بلند مرتبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے شاگردوں (یعنی تابعین) کے فیض یافتہ ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کی حیات مبارکہ کے ان واقعات سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا ہمارے موضوع سے تعلق ہے۔

۱۔ اسرائیل بن موسیٰ بصریؒ:

ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری وہ تبع تابعی تھے جو دراصل باشندے تو بصرہ کے تھے، مگر ہند میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ انھوں نے حسن بصری، ابوحازم اشجعی، محمد بن سیرین اور وہب بن منبہ سے روایتِ حدیث کی جن کا شمار جلیل القدر تابعین کی جماعت میں ہوتا تھا۔ خود اسرائیل بن موسیٰ بصری سے سفیان ثوری، ابن عیینہ، یحییٰ بن سعید قطان اور دیگر حضراتِ کرام نے حدیث پڑھی۔

ابن حبان نے ان کو ثقہ راویانِ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے۔

كان يسافر الى الهند.

ہندوستان میں آمد و رفت رکھتے تھے۔

صحیح بخاری میں ان کے سلسلۂ سند کی ایک حدیث چار مقامات پر درج ہے:

وله في صحيح البخاري فرد حديث مكرر في اربعة مواضع.

ابوحاتم اور یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔

اسرائيل صاحب الحسن ثقة

یعنی امام حسن بصری کے شاگرد اسرائیل بن موسیٰ ثقہ راوی ہیں۔

ابوحاتم ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ **لا باس به.**

امام نسائی کا فرمان ہے۔ **ليس به بأس**

سمعانی نے الانساب میں ان کے انتسابِ ہند کے متعلق لکھا ہے۔

ابو موسىٰ اسرائيل بن موسىٰ الهندى بصرى كان ينزل الهند فنسب اليها.

یعنی ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ ہندی دراصل بصرہ کے باشندے تھے۔ چوں کہ ہندوستان میں ان کا آنا جانا تھا' لہٰذا ہند کی طرف منسوب کیے گئے۔ (۱)

۲۔ کرز بن ابوکرز عبدی:

کرز اصلاً کوفے کے رہنے والے تھے' لیکن وہاں سے ایران کے شہر جرجان چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ محمد بن فضیل اپنے باپ (فضیل) سے بیان کرتے ہیں کہ وہ (یعنی فضیل) کرز سے ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے' وہ ٹاٹ کے مصلے پر کمبل اوڑھے بیٹھے تھے اور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔

شبرمہ کہتے ہیں ایک مرتبہ کرز حارثی کے ساتھ ہم سفر کر رہے تھے اور بصرے جا رہے تھے۔ راستے میں جہاں کوئی ایسا قطعہ زمین آتا جو کرز کی نگاہوں میں خوب صورت معلوم ہوتا' وہاں وہ نماز پڑھنا شروع کر دیتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگلے سفر پر روانہ ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کرز حارثی مستجاب الدعوات تھے' جو چیز اللہ سے مانگتے مل جاتی۔ انھوں نے اللہ سے یہ دعا بھی مانگی کہ انھیں اتنی ہمت اور طاقت عطا فرما دی جائے کہ وہ قرآن مجید پڑھنے میں مشغول رہیں۔

۱۔ الانساب سمعانی' ورق ۵۹۳ زیر لفظ الہندی۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۱۔۔۔ نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۲۳۔

خلف بن تمیم کہتے ہیں ایک مرتبہ کرز حارثی ہمارے ہاں کوفہ میں آئے۔ قراء کوفہ کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں بھی ان کی اقامت گاہ پر گیا۔ کافی دیر ہم لوگ حاضر خدمت رہے۔ اس اثنا میں میں نے ان کی زبان سے صرف دو باتیں سنیں۔ ایک یہ کہ:

صلوا علی نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم، فان صلاتکم تعرض علیه.

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا کرو۔ تمھارا درود بارگاہِ پیغمبر میں پیش کیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ تھی۔

اللھم اختم لنابخیر.

(اے اللہ ہماری عاقبت بہتر فرمادے۔)

کرز حارثی تبع تابعین کی جماعت کے جلیل القدر رکن تھے۔ انھوں نے نعیم بن ابی ہند اور ربیعہ بن زیاد سے حدیث روایت کی اور کرز سے سفیان ثوری، ابن شبرمہ، فضیل بن غزوان، ورقا بن عمر اور عبید اللہ وصافی نے درس حدیث لیا۔

حافظ ذہبی ان کو تابعی اور حافظ ابن حجر تبع تابعی قرار دیتے ہیں۔ ابن حبان نے ان کو ثقہ روایانِ حدیث میں گردانا ہے اور کہا ہے کہ یہ نہایت عبادت گزار محدث تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت (۴۵ھ) میں جو فوج قلات کی طرف روانہ کی گئی، کرز حارثی اس میں شامل تھے۔ اس جنگ میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ کامیابی کے بعد واپس گئے تو حضرت معاویہ نے ان کو دوبارہ قلات بھیج دیا تھا۔[1]

حضرت کرز رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کتب رجال میں مذکور ہیں۔

۳۔ معلّٰی بن راشد بصریؒ:

معلّٰی بن راشد نبال ہذلی بصری کی کنیت ابوالیمان تھی۔ یہ تبع تابعین کی عالی مرتبت جماعت کے وہ مردِ مجاہد تھے، جنھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت

۱۔ التاریخ الکبیر ج ۲ ص ۲۲۸۔۔۔ الاصابہ ج ۳ ص ۳۰۲۔۔۔ جمہرۃ انساب العرب ص ۲۹۵۔۔۔ الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۱۷۰۔۔۔ تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۱۱۔ العقد الثمین ص ۱۰۳ تا ۱۰۵۔

میں ۵۰ ہجری کو قلات کی جنگ میں حصہ لیا۔

خلیفہ بن خیاط نے ۵۰ ہجری کے واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں معلّٰی بن راشد کے متعلق جو الفاظ نقل کیے ہیں' ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔ وہ کہتے ہیں۔

> ہم سنان کی کمان میں قلات کے محاذِ جنگ پر آئے تو ہم نے دیکھا کہ سامنے دشمن کی بہت بڑی فوج کھڑی ہے۔ سنان نے یہ صورتِ حال دیکھ کر ہم سے کہا' تم خوش رہو' تمھیں دو چیزوں میں سے ایک چیز ملنے والی ہے۔ جنت یا مالِ غنیمت ۔۔۔! پھر سنان نے سات پتھر اٹھائے اور فوج کو روک لیا۔ کہا جب تم دیکھو کہ میں نے حملہ کر دیا ہے تو تم بھی حملہ کر دو ۔۔ پھر جب آفتاب آسمان کی تہہ سے باہر آیا تو سنان نے دشمن کی طرف ایک پتھر پھینکا اور اللہ اکبر کہا۔ پھر ایک ایک پتھر پھینکتے گئے' یہاں تک کہ ساتواں پتھر باقی رہ گیا۔ جب آفتاب ڈھل گیا تو ساتواں پتھر پھینکا اور کہا "حم لا ینصرون" پھر فوراً اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور دشمن پر حملہ کر دیا' ہم نے بھی حملہ کر دیا۔ دشمن کی فوج نے اپنے کندھے ہم کو دے دیے یعنی ہمارے آگے بھاگ کھڑی ہوئی اور ہم چار فرسخ تک اس کو قتل کرتے گئے۔ اس طرح دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے ہم ایک قلعہ بند فوج کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے ہم سے کہا' خدا کی قسم تم وہ لوگ نہیں ہو' جنھوں نے ہمارے ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ ہمیں قتل کرنے والوں میں سے تو ایک آدمی بھی تم میں نظر نہیں آتا۔ وہ تو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور سفید عمامے باندھے ہوئے تھے۔ دشمن کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ہم نے آپس میں کہا' یہ اللہ کی مدد ہے۔

حافظ ابنِ حجر تہذیب التہذیب میں لکھتے ہیں کہ معلّٰی نے اپنی دادی ام عاصم کے علاوہ میمون بن سیاہ' حسن بصری اور زیاد بن میمون ثقفی سے روایت کی۔ خود معلّٰی نے بھی مسندِ حدیث آراستہ کی۔ ان سے یزید بن ہارون' عبداللہ بن صالح عجلی' روح بن عبدالمؤمن' ابوبشر بن بکر بن خلف اور نصر بن علی جہضمی وغیرہ محدثین نے سماعِ حدیث کا

شرف حاصل کیا۔

ابن حبان نے معلیٰ کو ثقہ روایانِ حدیث میں گردانا ہے اور امام نسائی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ لیس به باس.

۴۔ جنید بن عمرو العدوانی المکیؒ:

اہل مکہ کے ممتاز و مشہور قاری تھے۔ ثقہ اور کثیر الحدیث راوی تھے۔ آل زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے' انھوں نے حمید بن قیس سے روایت کی اور خود ان سے محمد بن عبداللہ بن قاسم نے درس حدیث لیا۔

جنید بن عمرو وہ تبع تابعی تھے' جو فتح سندھ کے موقعے پر محمد بن قاسم کے ساتھ واردِ برصغیر ہوئے۔ محمد بن قاسم ساوندری کے مقام پر پہنچے تو ہراور میں قیام کیا۔ ہراور سے جنید بن عمرو کو فوج کے ایک دستے کا کمان دار بنا کر مخالفین اسلام کے خلاف جہاد کے لیے بھڑوچ روانہ کیا۔ (۱)

۵۔ محمد بن زید عبدیؒ:

(ایک روایت کے مطابق زیاد) عبدی فتح سندھ کے زمانے میں محمد بن قاسم کے امرا و معاونین میں سے تھے۔ انھوں نے ابوشریح' سعد بن جبیر' ابراہیم نخعی اور ابوالاعین سے روایتِ حدیث کی۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ محمد بن زید نہیں' بلکہ محمد بن زیاد ہیں۔ (۲)

۶۔ محمد بن غزان کلبیؒ:

عرب کے قبیلے بنو کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ممتاز محدث امام اوزاعی سے روایتِ حدیث کی۔ ابوزرعہ انھیں منکر الحدیث قرار دیتے ہیں۔ عمر بن محمد عن سالم عن ابیہ کی سند

۱۔ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۸۶۔۔۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۱۴۱۔۔۔ معارف ابن قتیبہ ص ۲۳۱۔۔۔ الجرح والتعدیل ج ۱ ص ۱۲۸۔۔۔ رجال السند والہند ص ۳۷۳۔

۲۔ کتاب الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۲۵۶۔۔۔ لسان المیزان ج ۶ ص ۶۹۰۔۔۔ رجال السند والہند ص ۴۹۱۔

سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔

عن الاوزاعی عن یحییٰ عن ابی سلمة عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ

کی سند سے دریا کے پانی کے بارے میں مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔

ھو الطھور ماء ہ والحل میتته.[1]

یعنی دریا کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

ابن عساکر بیان کرتے ہیں کہ محمد بن غزان نے دریا کے پانی کے بارے میں اوزاعی سے جو حدیث روایت کی ہے وہ منکر ہے۔

علامہ طبری نے تاریخ طبری میں ۱۲۶ ہجری کے واقعات میں محمد بن غزان کا ذکر کیا ہے کہ جب محمد بن قاسم کا بیٹا عمر بن محمد سندھ کا والی تھا' اس زمانے میں محمد بن غزان بھی یہیں تھے' ان پر بہت بڑی رقم کا الزام عائد کیا گیا تھا جو یہ قسط وار ادا کرتے تھے۔

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ خود محمد بن غزان کو سندھ کا والی مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے عمر بن محمد کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا تھا۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے' جس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔[2]

۷۔ ابوعیینہ ازدیؒ:

ابوعیینہ بن محمد بن ابوعیینہ بن مہذب بن ابوصفرہ ازدی۔ انھوں نے اعمش سے حدیث روایت کی ہے۔ ان کے بیٹے کا نام محمد بن ابوعیینہ تھا جنھوں نے اپنے باپ (ابوعیینہ) سے علم حدیث پڑھا۔

اولادِ مہلب میں سے تیرہ آدمی تھے جو سندھ میں قیام پذیر تھے' ان میں ایک ابوعیینہ تھے جو تبع تابعی تھے۔ ان تیرہ آدمیوں کو قندابیل سے پکڑا گیا اور قیدی کی حیثیت سے اموی خلیفہ یزید بن عبدالملک کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر اس کے حکم سے ان کو قتل کر دیا گیا تھا۔[3]

۱۔ ترمذی' ابوداؤد' نسائی

۲۔ تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۷۲۔۔۔لسان المیزان ج ۵ ص ۳۳۸۔۔۔رجال السند والہند ص ۴۹۹' ۵۰۰

۳۔ لسان المیزان ج ۵ ص ۷۷' ۳۲۷۔۔۔رجال السند والہند ص ۵۵۷

مہلب کی بیٹی ہند نے یزید بن عبدالملک سے اپنے بھائی ابوعیینہ کے لیے جان بخشی کی درخواست کی تھی جو منظور کر لی گئی تھی اور ابوعیینہ کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔

۸۔ سندی بن شماس السمان بصریؒ:

ان کا ذکر امام بخاری نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر میں کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کہتے ہیں، سندی بن شماس، بصرہ کے رہنے والے تھے، جنھوں نے عطا بن رباح اور محمد بن سیرین سے حدیث روایت کی اور خود سندی سے موسیٰ بن اسماعیل اور موثرہ بن الاشرس نے روایت کی۔ سندی بن شماس السمان وہ تبع تابعی تھے، جن کا تعلق سندھ سے تھا اور پھر بصرے چلے گئے تھے۔ (۱)

شاید لوگ ان کا اصلی نام بھول گئے ہوں گے اور باپ کا نام ذہنوں میں محفوظ رہ گیا ہوگا، اس لیے اسی اعتبار سے اپنے حلقۂ تعارف میں یہ سندی مشہور ہو گئے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے ملک میں چلا جائے تو اپنے پہلے اور آبائی وطن کی نسبت سے شہرت حاصل کر لیتا ہے، مثلاً ترک ہے تو ترکی، عرب سے تعلق رکھتا ہے تو عرب، ہندوستان کا رہنے والا ہے تو ہندی، آبائی علاقہ تبت ہے تو تبتی، کشمیر ہے تو کشمیری وغیرہ کی وطنی نسبت ہی اس کا اصل نام قرار پا جاتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انھیں سندی کسی اور وجہ سے کہا جاتا ہو۔

۹۔ عبدالرحیم دیبلی سندھیؒ:

یہ دراصل عرب کے قبیلۂ بنو ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ان کے آباو اجداد میں سے بنو ثقیف کے کوئی بزرگ حملۂ سندھ کے زمانے میں فوجی کی حیثیت سے محمد بن قاسم کے ساتھ وارِدِ سندھ ہوئے اور دیبل شہر فتح ہوا تو وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ دیبل ہی میں عبدالرحیم کی ولادت ہوئی۔ بنو ثقیف کے فرد ہونے کی وجہ سے انھیں ثقفی اور دیبل اور سندھ سے تعلق کی بنا پر دیبلی سندھی کہا جانے لگا۔ حافظ ابن حجر لسان المیزان ان

۱۔ التاریخ الکبیر ج ۲ ص ۱۱۷۔۔۔ کتاب الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۲۱۸۔۔۔ العقد الثمین ص ۲۲۲۔

میں لکھتے ہیں:

قال العقیلی قال جدی قدم علینا من السند شیخ کبیر کان یحدث عن الاعمش.

یعنی عقیلی کہتے ہیں، میرے دادا نے بیان کیا کہ ہمارے ہاں (بصرہ میں) سندھ سے ایک بہت بڑے شیخ آئے جو اعمش سے روایتِ حدیث کرتے تھے۔

ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں علمِ حدیث کی تعلیم کے سلسلے میں سندھ کا علاقہ بہت زرخیز علاقہ تھا، جہاں سے حصولِ علم کے بعد عبدالرحیم بصرے گئے اور وہاں کی مجالس محدثین میں ''شیخ کبیر'' کہلائے۔

عبدالرحیم دیبلی علاقہ سندھ کے ائمہ حدیث میں سے تھے اور تبع تابعی تھے۔ ابن حبان، بیہقی اور عقیلی وغیرہ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

۱۰۔عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعیؒ:

یہ ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو بن یحمد دمشقی ہیں جو حافظ الحدیث تھے اور علم حدیث میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ یہ محدث کبیر امام اوزاعی کی نسبت سے مشہور ہیں جو ۸۸ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کا مقامِ ولادت بعلبک ہے۔ بچپن میں والد وفات پا گئے تھے، حالتِ یتیمی میں ماں کی گود میں پرورش پائی اور فقر و فاقے کی حالت میں شعور کی منزل کو پہنچے۔ عطا بن رباح، زہری اور دیگر بہت سے محدثین سے روایت حدیث کی۔ محمد بن سیرین کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بستر مرض پر دراز تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان سے سماعِ حدیث کیا۔

حصولِ علم حدیث کے بعد خود امام اوزاعی مسندِ درس پر متمکن ہوئے۔ ان سے حضرت عبداللہ بن مبارک، شعبہ بن سعید القطان، ولید بن مسلم، یحیٰی بن سعید القطان اور خلقِ کثیر نے علم حدیث پڑھا۔

۱۔ لسان المیزان ج ۴ ص ۴۱۰۔۔۔ تاریخ بغداد ج ۸ ص ۸۱۵۔۔۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیھا من الصحابۃ والتابعین ص ۲۳

امام اوزاعی عمر کے آخری دور میں بیروت تشریف لے گئے تھے' پھر وہیں فوت ہوئے۔ انھیں ''امام الہند والشام'' کہا جاتا ہے۔

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ کان من سبی السند۔

یعنی اوزاعی کا شمار اسیرانِ سندھ میں ہوتا ہے۔

ان کے واقعات تاریخ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اس عظیم محدث و فقیہہ کا تعلق برصغیر کے علاقے سندھ سے تھا۔ (۱)

انھیں ''اوزاعی'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب یہ علاقۂ سندھ سے ملکِ شام میں گئے تو دمشق کے قریب ایک گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے' جس کا نام ''اوزاع'' تھا' اس بنا پر انھیں اوزاعی کہا جانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل نام عبدالعزیز تھا' بعد میں خود ہی اپنا نام عبدالرحمٰن رکھا اور اسی نام سے شہرت پائی۔

اس عظیم المرتبت محدث و فقیہہ نے باختلاف روایات ۲۔ صفر ۱۵۷ھ یا ۱۵۸ ہجری کو کم وبیش بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ موت اس طرح واقع ہوئی کہ بیروت کی ایک سرائے میں مقیم تھے' کہ اس کے حمام میں گئے' پاؤں پھسلا اور گر گئے۔ پھر بے ہوش ہو گئے اور اسی حالت میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

۱۱۔ عبدالرحمٰن بن السندیؒ:

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں عراک بن خالد بن یزید کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

معلوم ہوتا ہے' یہ سندھ سے حصولِ علم کے لیے دمشق گئے تو لوگوں کو ان کے نام کا تو

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۸ تا ۲۴۲۔۔۔ وفیات الاعیان ج ۲ صفحہ ۳۰۰۔ ۳۱۱۔۔۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۸ تا ۱۷۲۔

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۷۱

پتا چل گیا کہ عبدالرحمٰن ہے، مگر عرب چونکہ باپ کا نام بھی بولتے اور لکھتے ہیں، اس لیے ان کو جب ان کے باپ کے اصلی نام کا علم نہ ہو سکا تو سندھی ہونے کی بنا پر انھیں عبدالرحمٰن بن السندی کہا جانے لگا اور لوگوں کی زبانوں پر ان کی نسبت ابوت سندھی قرار پا گئی۔

۱۲۔ عمرو بن عبید بن باب السندیؒ:

ان کی کنیت ابوعثمان تھی اور معتزلی تھے۔ قبیلہ بنوتمیم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حضرت حسن بصری سے بہت سی احادیث روایت کرتے ہیں۔ لیکن محدثین کے نقطۂ نظر سے لیس بشئ فی الحدیث۔

عمرو بن عبید سندھی کے دادا (باب) دراصل کابل کے رہنے والے تھے، وہاں سے سندھ آئے اور باب السندی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعدازاں یہ خاندان بصرہ میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔

عمرو بن عبید سندھی نے ۱۴۰ھ یا ۱۴۲ھ میں مکہ اور بصرہ کے راستے میں دوران سفر وفات پائی۔ نمازِ جنازہ سلیمان بن علی نے پڑھائی اور مران میں دفن کیے گئے۔[1]

۱۳۔ فتح بن عبداللہ سندھی:

ان کی کنیت ابونصر ہے۔ پہلے آلِ حسن بن الحکم کے غلام تھے، پھر آزاد کر دیے گئے تھے۔ "الانساب" میں ایک عجیب و غریب روایت بیان کی گئی ہے۔ اس روایت سے ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی کی صاف بیانی اور حق گوئی کا پتا چلتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ جو سمعانی نے نقل کیے ہیں، مندرجہ ذیل ہیں۔

حدثنی عبدالله بن الحسین قال کنا یوماً مع ابی نصر السندی وفینا کثرة حوالیه ونحن نمشی فی الطین، فاستقبلنا شریف سکران، قد وقع فی الطین، فلما نظر الینا، شمه ابونصر، وقال نافق یا عبد، انا کما تری، وانت تمشی وخلفک هؤلاء. فقال له

۲۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۲۷۳۔۔۔ مروج الذہب ج ۳ ص ۳۱۴۔۔۔ المعارف ابن قتیبہ ص ۱۱۲۔۔۔ العقد الثمین ص ۲۲۴۔

ابونصر ایها الشریف تدری لم هٰذا...؟ لانی متبع اٰثار جدک وانت متبع آثار جدی.[1]

یعنی عبداللہ بن حسین کہتے ہیں کہ ایک دن ہم ابونصر سندھی کے ساتھ دھول اور کیچڑ سے اٹی ہوئی زمین میں جا رہے تھے اور ان کے بہت سے مداحین و متاثرین ساتھ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک شہزادہ مدہوشی کی حالت میں زمین پر خاک اور کیچڑ میں لت پت پڑا ہے۔ اس نے ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ابونصر نے منہ قریب کر کے اسے سونگھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ شہزادے نے ابونصر سے کہا:

او غلام! میں جس حالت میں پڑا ہوں، تم دیکھ رہے ہو، لیکن تم ہو کہ اطمینان سے چلے جا رہے ہو اور اتنے لوگ تمھارے پیچھے جا رہے ہیں۔ ابونصر نے بے باکی سے جواب دیا: شہزادے! تمھیں معلوم ہے، اس فرق مراتب کی کیا وجہ ہے؟ وجہ یہ ہے کہ میں نے تمھارے آبا و اجداد کی پیروی شروع کر دی ہے اور تم میرے آبا و اجداد کے نقش قدم پر چل پڑے ہو۔

ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی، دوسری صدی ہجری کے دیارِ سندھ و ہند کے ان عالی قدر حضرات میں سے تھے، جنھیں تبع تابعین کہا جاتا ہے۔[2]

۱۴۔ قیس بن بسر بن سندی البصری:

قیس بن بسر کے دادا کے والد عبداللہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ قیس کا تعلق علاقہ سندھ سے تھا اور وہ تبع تابعین کی برگزیدہ جماعت کے فرد تھے۔

۱۔ الانساب ورق ۳۱۳۔

۲۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین ص ۲۰۲۔

۱۵۔ ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی مدنی:

نجیح بن عبدالرحمٰن سندھی مدنی مشہور محدث اور معروف تبع تابعی تھے۔ ان کی کنیت ابومعشر تھی۔ جن تابعین کرام سے ابومعشر نے حدیثِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سماعت کی' ان کا ذکر حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں' ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں' خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اور سمعانی نے الانساب میں کیا ہے۔

اصحابِ حدیث کی کثیر جماعت سے روایتِ حدیث کی جن میں حضرت سعید بن مسیب اور حضرت محمد بن المنکدر ایسے محدثین شامل ہیں۔

محدثانہ نقطۂ نظر سے مختلف ماہرینِ رجال نے ابومعشر کے بارے میں مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔

ان کی زبان میں ہکلاہٹ تھی اور کعب کو قعب کہتے تھے۔

اس سندھی محدث اور تبع تابعی کا رنگ سرخ' آنکھیں نیل گوں اور جسم بھاری بھرکم تھا۔

عباسی خلیفہ مہدی ۱۶۰ھ میں ان کو اپنے ساتھ عراق لے گیا تھا اور ایک ہزار دینار عطا کیے تھے۔ وہ ان سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ان سے لوگوں کو تعلیم دینے کی درخواست کی تھی۔

ابومعشر رمضان ۱۷۰ھ میں فوت ہوئے۔ اسی سال ہارون الرشید تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کا جنازہ پڑھایا اور ان کی موت پر حزن و ملال کا اظہار کیا۔ بغداد کے مقبرۃ الکبیرہ میں دفن کیے گئے۔ (۱)

۱۶۔ محمد بن ابراہیم بیلمانیؒ:

ان کا تعلق بھی برصغیر سے تھا اور یہ بیلمان کے رہنے والے تھے۔ ان سے عبیداللہ

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۹ تا ۴۲۲۔۔۔ الانساب بذیل لفظ سندی ورق ۳۱۳۔۔۔ تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۲۳۴۔۔۔ معجم البلدان ج ۳ ص ۲۶۔

بن ربیع نجرانی نے روایتِ حدیث کی۔ (۱)

۱۷۔ محمد بن حارث بیلمانیؒ:

یہ دراصل بیلمان کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنے والد حارث بیلمانی سے روایتِ حدیث کی اور پھر ان سے محمد بن حارث حارثی نے روایت کی۔ (۲)

۱۸۔ یزید بن عبداللہ قرشی سندھیؒ:

یزید بن عبداللہ قرشی بیسری سندھی کی کنیت ابوخالد ہے، اس لیے انھیں ابوخالد بیسری بھی کہا جاتا ہے۔ مروج الذہب میں مسعودی نے لکھا ہے کہ لفظ ''بیسر'' کی جمع ''بیاسر'' ہے۔ دورِ اول میں جو مسلمان ہندوستان میں پیدا ہوئے، انھیں ''بیاسرہ'' کہا جاتا تھا، اس کا واحد ''بیسر'' ہے اور اس کی نسبت بیسری ہے۔ یزید بن عبداللہ قرشی کی ولادت چوں کہ علاقہ سندھ میں ہوئی تھی، اس لیے یہ سندھی بھی کہلائے اور بیسری بھی!

یزید بن عبداللہ نے سفیان ثوری اور ابن جریج وغیرہ حضرات سے احادیثِ رسول روایت کیں۔ پھر خود یزید بن عبداللہ سے علی بن ابوہاشم، ابوداؤد طیالسی اور محدثین کی ایک جماعت نے سماعِ حدیث کی۔

ایک حدیث کی سند میں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مندرجہ ذیل الفاظ فرمائے، یزید بن عبداللہ بیسری راوی ہیں۔

عن علی قال، قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تبرز فخذک ولاتنظر الی فخذحی ولامیت. (۳)

یعنی حضرت علی رضی اللہ کہتے ہیں، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی ران ظاہر نہ کرو اور نہ کسی زندہ اور مردہ شخص کی ران کی طرف دیکھو۔

مشہور صحابی حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے، اس کی سند میں

۱۔ العقد الثمین ص ۱۱۹۔

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۰۴ و ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

۳۔ ابوداؤد، ابن ماجہ

یزید بن عبداللہ قرشی سندھی ایک راوی ہیں۔

عن ابی جحیفة قال، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم جالسوا العلماء و سائلوا الکبراء و خالطوا الحکماء.(۱)

یعنی حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: علما کی مجلس میں بیٹھا کرو، بڑوں سے سوال پوچھا کرو اور دانش مندوں سے ملا جلا کرو۔

ابن حبان نے یزید بن عبداللہ سندھی کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اصلاً سندھی تھے۔ ذکرہ ابن حبان فی الثقات فقال اصله من السند.

یزید بن عبداللہ سے روایتِ حدیث کرنے والوں میں ایک راوی محمد بن ابوبکر مقدسی ہیں، جنھیں اصحابِ رجال نے "مستقیم الحدیث" قرار دیا ہے۔(۲)

یہ ہیں اہل حدیث کے وہ چار کارواں جنھوں نے اسلام کے بالکل ابتدائی عہد میں برصغیر کا عزم کیا۔ یہ کارواں صحابہ کرام، تابعین ذی احترام اور تبع تابعین عالی مقام پر مشتمل ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں جن کی مسلسل کوششوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پاک کا ذخیرہ یہاں آیا اور اس سرزمین کے باشندے اس سے مستفیض ہوئے۔ مختلف فقہی مسالک یہاں بہت بعد میں آئے، اس لیے کہ ان مسالک کا ظہور بہت بعد میں ہوا۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ مسالک کہاں تھے؟ ان کا تو ائمہ فقہ کی طرف انتساب بھی ان ائمہ کرام کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بہت بعد میں ہوا۔

جب تاریخی اعتبار سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ برصغیر میں اہل حدیث پہلی صدی ہجری ہی میں آ گئے تھے، جب کہ فقہی مسالک کا دنیا میں نام و نشان بھی نہ تھا تو آیئے اب آئندہ سطور میں اہل حدیث کے متعلق دیگر ضروری امور کو مرکزِ بحث ٹھہراتے ہیں۔

۱۔ سیوطی فی جامع الصغیر۔۔۔ طبرانی فی الکبیر

۲۔ لسان المیزان ج ۶ ص ۲۹۰۔۔۔ کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۲۷۱۔۔۔ مروج الذہب ج ۳ ص ۳۱۴۔

پانچواں باب

مختلف قدیم ادوار کی کتابوں میں اہل حدیث کا تذکرہ

یہ کتاب جس موضوع پر مشتمل ہے' اس کی روشنی میں یہ سوال نہایت اہم ہے کہ اگر اہل حدیث قدیم دور سے چلے آ رہے ہیں تو قدیم مصنفین میں سے کسی لائق تکریم مصنف نے اپنی کسی کتاب میں اہل حدیث کا تذکرہ کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو کن کن عالی قدر حضرات نے کیا ہے اور کس انداز میں کیا ہے؟ اس ضمن میں اس فقیر نے ایک خاکہ مرتب کیا تھا اور اس خاکے کی روشنی میں چند صفحات لکھے تھے کہ حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مرحوم و مغفور کی تصنیف "تاریخ اہل حدیث" موصول ہوئی' جو مکتبہ قدوسیہ اردو بازار' لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب جس طرح اپنے مندرجات کے اعتبار سے بے حد اہمیت کی حامل ہے' اسی طرح مکتبہ قدوسیہ نے اس کی اشاعت میں اپنی روایت کے مطابق انتہائی حسن ذوق کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ کتاب میں حضرت مولانا مرحوم نے اس بات کا بھی تذکرہ فرمایا ہے کہ اہل حدیث کا ذکر قدیم دور کی کن کتابوں میں آیا ہے اور کس فاضل مصنف نے ان کا ذکر کس اسلوب میں کیا ہے' چنانچہ اس فقیر نے دیگر تصنیفات کے علاوہ اس سلسلے میں حضرت مولانا سیالکوٹی کی تحریر فرمودہ معلومات سے بھی استفادہ کیا ہے' جس کا اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کیا جاتا ہے۔

علم شریعت مختلف شعبوں پر مشتمل ہے' مثلاً تفسیر' حدیث' فقہ' اصول' کلام اور تاریخ وغیرہ۔ ان میں سے ہر شعبے کی قدیم و جدید تصانیف میں اہل حدیث کا ذکر بے حد احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان تصانیف کے مصنفین کے نزدیک یقیناً ایک ایسی جماعت موجود تھی' جس کے ارکان کی تحقیقات و تنقیدات کے سب محتاج تھے۔ بعض مقامات پر اس جماعت کا ذکر لفظ اہل حدیث سے ہوا ہے' بعض جگہ انھیں اصحاب

حدیث لکھا گیا ہے۔ بعض کتابوں میں اہل اثر قرار دیا گیا ہے اور بعض حضرات نے انھیں محدثین کے لقب سے تعبیر کیا ہے۔ مقصد ان تمام القاب سے سب کا یہی ہے کہ چوں کہ اس جماعت کو احادیث پیغمبر اور آثار نبویہ سے خاص شغف و تعلق ہے، اس لیے ان کو ان پُرشکوہ القاب سے یاد کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا اور ان پر "از مصطفیٰ شنیدن واز دیگراں بریدن" والی بات صادق آئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی چیز کے نام کا مقصد اس کا دوسروں سے تمیز و تعارف ہوتا ہے۔ صدر اول اور قرن ثانی میں مسلمان صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جماعت سے عبارت تھے۔ مختلف مسلکی فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے، صرف کتاب اللہ اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تقید تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس واطہر کے سوا کسی شخصیت کو شریعت میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ یعنی کوئی دوسرا فرقہ سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ کسی سے تمیز ہونے کے لیے الگ نام کی ضرورت پڑتی۔ اس کے بعد جب ائمہ مجتہدین کا دور آیا اور ان کے اقوال وارشادات کو حجت گردانا گیا اور مختلف مذاہب کی بنیادیں قائم ہوگئیں تو جن لوگوں نے طرزِ اول اور زمانہ سابق کی طرح کسی شخصیت کو دین میں داخل کرنے کے بغیر صرف کتاب وسنت سے حصول دین کو اپنا دستور قرار دیے رکھا اور اپنے عمل واعتقاد کی بنا فقط قرآن وحدیث پر رکھی، وہ اہل حدیث، اصحاب حدیث، اہل اثر اور محدثین کہلائے۔ اس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمائی ہے۔ باقی سب لوگ یا تو اپنے اپنے امام ومقتدیٰ کی طرف منسوب ہوئے، جس کی شخصیت کو انھوں نے دوسرے فرقوں میں حدِ فاصل قرار دیا تھا اور اس شخصیت کے مجتہدات کو مسائل واحکام کے لیے اصل وسند مانا، مثلاً حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کہلائے۔ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہوئے۔ اور یا پھر اس مسئلے کی طرف منسوب ہوئے، جس میں انھوں نے اصحاب حدیث سے اختلاف کیا، مثلاً قدریہ مسئلہ تقدیر کے منکر ہونے کی وجہ سے قدریہ کہلائے، جبریہ جبر محض کے قائل ہونے کی بنا پر جبریہ کے نام سے موسوم ہوئے اور مرجئہ اعمال کو

ایمان سے جدا کرنے اور محض ایمان پر نجات کی امید ورجا رکھنے کے سبب مرجئہ کے نام سے پکارے گئے۔

ائمہ مجتہدین سے قبل، عہد صحابہ میں بھی ایک عظیم اختلاف پیدا ہوا تھا، جس کی بنیاد امور سیاست تھی، لیکن بعد کو وہ اختلاف مذہبی اور اعتقادی شکل اختیار کر گیا اور امت میں اس کی وجہ سے ایسا تہلکہ بپا ہوا جو روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ اختلاف یہ تھا کہ شیعہ درحقیقت اس گروہ کا نام تھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حامی تھا اور خارجی اس طائفے کو کہا جاتا تھا جو تحکیم کے سلسلے میں حضرت علیؓ سے الگ ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد حالات نے ایسی تبدیلی اختیار کی کہ معتقدات میں یہ دونوں گروہ یعنی شیعہ اور خارجی اہل سنت کے مقابلے میں آ گئے اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ''اہل سنت'' کا لقب انہی اور ان جیسے دیگر بدعی فرقوں کے مقابلے میں وضع کیا گیا تھا۔

متداول کتب حدیث میں سب سے قدیم کتاب موطا امام مالک ہے۔ حضرت امام مالک کی ولادت مدینہ طیبہ میں ۹۳ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے زمانے میں ہوئی اور انھوں نے مدینہ طیبہ ہی میں ۱۷۹ھ کو خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے زمانے میں وفات پائی۔ اس وقت عرب کے علاوہ شمالی افریقہ بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور سپین وغیرہ یورپ کے بعض ملکوں پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا اور امام مالک کا فیض حدیث تمام ممالک اسلامی میں پہنچ چکا تھا، چنانچہ موطا کا آخری نسخہ جو عام طور پر اہل علم میں متداول ہے، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کا روایت کردہ ہے جو امام مالک کے بلاواسطہ شاگرد تھے اور سپین کے باشندے تھے۔ لیکن موطا میں فرقہ بندی کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ اس میں کسی فرقے کی تردید کے انداز میں مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

اب ذیل میں ان مصنفین کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جنھوں نے اپنی تصانیف میں اہل حدیث کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لائق شاگردوں میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بے حد شہرت پائی جو ۱۵۰ ہجری میں پیدا اور ۲۰۴ ہجری میں فوت ہوئے۔ اس وقت تبع

تابعین کا زمانہ ختم ہوگیا تھا۔ امام شافعی کا سفرنامہ ''رحلۃ الشافعی'' کے نام سے امام سیوطی نے تالیف کیا تھا' جو انھوں نے اپنے شاگرد ربیع بن سلیمان مصری کو املا کرایا تھا۔ لکھتے ہیں۔

یلقانی الرجال واصحاب الحدیث منهم احمد بن حنبل وسفیان بن عیینه و اوزاعی (صفحه ۱۴)

یعنی مجھے عام لوگ بھی ملتے تھے اور اصحاب حدیث بھی ملتے تھے' جن میں احمد بن حنبل' سفیان بن عیینہ اور اوزاعی شامل ہیں۔

یہاں امام شافعی نے تین اصحاب حدیث کے نام لیے ہیں اور وہ ہیں امام احمد' امام سفیان اور امام اوزاعی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام احمد بن حنبل بغداد کے رہنے والے ہیں' امام سفیان بن عیینہ کا تعلق کوفہ سے ہے اور امام اوزاعی ملک شام کے باشندے ہیں' اور یہ تینوں مقامات ایک دوسرے سے طویل مسافت پر واقع ہیں اور ان تینوں میں اہل حدیث موجود ہیں' جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد ہی میں اس جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ دور دراز علاقوں میں پھیل گئے تھے۔

۲۔ حافظ ابن حجر نے بھی اپنی تصانیف میں جماعت اہل حدیث کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقامات پر ان کے لیے اصحاب الحدیث کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور بعض مقامات پر اہل الحدیث کے۔ پھر ان کا تذکرہ ''اہل الرائے'' (یعنی اصحاب کوفہ) کے مقابلے میں کیا ہے اور دونوں کے طریق عمل اور انداز اجتہاد کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ امام شافعی کے جامع الفقہ والحدیث ہونے کے بارے میں رقم فرماتے ہیں۔

فاجتمع له علم اهل الرای وعلم اهل الحدیث.

یعنی ان کی ذات میں اہل رائے اور اہل حدیث دونوں کے علوم جمع ہو گئے تھے۔

حافظ ابن حجر کی ولادت ۷۷۰ھ میں اور وفات ۸۵۴ھ میں ہوئی۔

۳۔ جامع ترمذی میں تو متعدد مقامات پر اہل الحدیث اور اصحاب الحدیث کا ذکر

آیا ہے۔۔۔۔امام ابوعیسیٰ ترمذی کا سال ولادت ۲۰۹ھ اور سال وفات ۲۷۹ھ ہے۔

۴۔ حنفی فقہ کی کتابوں میں بھی اہل حدیث کا ذکر ایک مستقل جماعت کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ سید امین ابن عابدین شامی ردالمختار شرح الدرالمختار کی تیسری جلد کے صفحہ ۲۹۳ اور ۲۹۴ میں رقم فرماتے ہیں۔

> حکی ان رجلا من اصحاب ابی حنیفة خطب الی رجل من اصحاب الحدیث ابنته فی عهد ابی بکر الجوز جانی فابی الا ان یترک مذهبه فیقرأ خلف الامام ویرفع یدیه عندالانحناء ونحو ذالک فاجابه فزوجه.

> (یعنی روایت ہے کہ قاضی ابوبکر جوز جانی کے عہد میں ایک حنفی نے ایک اہل حدیث سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو اہل حدیث نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس صورت میں رشتہ دے سکتا ہے کہ وہ اپنا (حنفی) مذہب چھوڑ دے اور امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے اور رکوع جاتے وقت رفع یدین کرے اور اسی طرح اہل حدیث کے دیگر مسائل پر بھی عمل کرے۔ چنانچہ اس حنفی نے اس شرط پر عمل کرنے کا اقرار کیا اور اہل حدیث نے اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی۔)

یاد رہے قاضی ابوبکر جوزجانی تیسری صدی ہجری کے قاضی ہیں جو ابوسلیمان کے شاگرد تھے اور ابوسلیمان بلاواسطہ امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد تھے۔ (الفوائد البہیہ صفحہ ۱۴)

اس واقعہ سے صاف پتا چلتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی مستقل طور سے ایک جماعت موجود تھی، جس کا نام اہل حدیث تھا اور ان کے امتیازی مسائل میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا اور رکوع کو جاتے وقت رفع یدین کرنا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی اہل حدیث کے یہ امتیازی مسائل ہیں اور گزشتہ دور میں بھی وہ ان مسائل پر عامل تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل حدیث نیا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ وہ جماعت ہے جو شروع ہی سے چلی آرہی ہے اور اس کے کچھ امتیازی مسائل ہیں جن پر یہ جماعت عامل تھی اور عامل ہے۔

۵۔ امام مسلم بن قتیبہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں معتزلہ جہمیہ، روافض اور اہل الرائے وغیرہ فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک عنوان اصحاب الحدیث کے متعلق قائم کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے ہر اس جگہ سے حق تلاش کیا جہاں سے مل سکتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی وجہ سے انھیں قرب الٰہی حاصل ہوا، اور اللہ کی طرف سے اس میں ایسی برکت پیدا کی گئی کہ لوگ سنت نبوی کے مطیع و منقاد ہو گئے اور مختلف رجال کے اقوال کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے مطابق فیصلے ہونے لگے۔ ابن قتیبہ ۲۱۳ھ کو بغداد یا کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۶ھ کو بغداد میں وفات پائی۔

اس سے واضح ہوا کہ امام ابن قتیبہ کے زمانے میں اور ان سے پہلے اصحاب حدیث موجود تھے جو اقوال رجال کے بجائے ارشادات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عمل پیرا تھے۔ یعنی انھیں تقلید سے کوئی تعلق نہ تھا اور وہ احادیث نبوی کو لائق عمل و التفات گردانتے تھے۔ موجودہ اہل حدیث کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔

۶۔ اب ایک ایسے علم کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے، جسے مذہبی اختلافات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں جماعت اہل حدیث کا ذکر موجود ہے۔ تاریخ فرشتہ میں سلطان محمود غزنوی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

> سلطان محمود نیز ابوالطیب سہل بن سلیمان صعلوکی را کہ از ائمہ اہل حدیث بود برسم رسالت پیش ایلک خاں فرستادہ۔

(تاریخ فرشتہ، جلد اول، مقالہ اول صفحہ ۱۲۳)

> یعنی ایلک خاں نے جب ماوراء النہر کا علاقہ فتح کیا تو اس کی اطلاع اس نے از راہ مسرت سلطان محمود غزنوی کو دی، سلطان نے اس خوشی میں اس کے پاس بہ طور سفیر ابوالطیب سہل بن سلیمان صعلوکی کو بھیجا جو اس دور کے ائمہ اہل حدیث میں سے تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ سلطان محمود غزنوی نے حنفی مذہب ترک کر دیا تھا۔ وہ ۳۵۷ھ

میں پیدا ہوا' اور اس نے ۳۴ سال حکومت کی۔

اس سے پتا چلا کہ اہل حدیث چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان میں موجود تھے۔

۷۔ تاریخ ہی کا ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمایئے۔ علامہ بشاری مقدسی نے ۳۷۵ھ میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ وہ اپنے سفرنامہ میں علاقہ سندھ کے شہر منصورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہاں کے ذمی بت پرست ہیں۔ مسلمانوں میں اکثریت اہل حدیث کی ہے۔'' (تاریخ سندھ' جلد اول' صفحہ ۱۲۴)

اس سے بھی ثابت ہوا کہ اہل حدیث چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان میں بہ کثرت موجود تھے۔

اب کیا ارشاد ہے ان محققین کا' جنھوں نے یہ تحقیق انیق فرما رکھی ہے کہ اہل حدیث کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔؟ کیا ان حضرات عالی قدر کی تاریخ دانی اور حساب دانی کا فیصلہ یہی ہے کہ پہلی' دوسری' تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے لے کر پندرھویں صدی ہجری تک کی درمیانی مدت کو ڈیڑھ دو سو سال ہی کہا جائے گا؟ سبحان اللہ! قربان جایئے اس حساب دانی کے اور صدقے جایئے تاریخ پر اس عبور کے!

۸۔ علامہ ابن خلدون عمرانیات کے ماہر اور تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے بہت بڑے مصنف ہیں' وہ مقدمہ ابن خلدون میں صحابہ کے بعد کے دور سے متعلق فرماتے ہیں۔

وانقسم الفقه فيهم الى طريقتين طريقة اهل الراى والقياس وهم اهل العراق وطريقة اهل الحديث وهم اهل الحجاز وكان الحديث قليلا فى اهل العراق لما قدمنا (مقدمه صفحه ۲۷۲' فصل فى علم الفقه)

(یعنی ان میں فقہ دو طریقوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک طریقہ اہل رائے و قیاس کا ہے اور وہ اہل عراق ہیں۔ دوسرا طریقہ اہل حدیث کا ہوا' اور وہ اہل حجاز ہیں۔ اہل عراق میں علم حدیث کم تھا' جس کی وجہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔)

اس کے بعد وہ اسی فصل میں لکھتے ہیں۔

ولم یبق الا مذھب اھل الرای من العراق واھل الحدیث من الحجاز (مقدمہ صفحہ ۲۷۳)

(یعنی اہل رائے کا مذہب عراق کی وجہ سے اور اہل حدیث کا حجاز کی وجہ سے دنیا میں باقی رہا۔)

۹۔ اب اس سلسلے میں حضرت پیر سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان سنیے جو ۴۹۱ھ میں پیدا اور ۵۶۱ھ میں بغداد میں فوت ہوئے۔ وہ اپنی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین کے بعض مقامات میں ''اہل اثر'' اور بعض میں ''اہل حدیث'' کا ذکر کرتے ہیں اور اہل بدعت کی علامات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فعلامۃ اھل البدعۃ الوقیعۃ فی اھل الاثر.

(صفحہ ۱۹۸۔ مطبوعہ مرتضوی، دہلی)

(یعنی اہل بدعت کی علامت یہ ہے کہ وہ اہل حدیث کی بدگوئی کرتے ہیں۔)

یہاں ''اہل الاثر'' سے مراد اہل حدیث ہیں۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو ۱۰۶۷ھ میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، حضرت پیر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ان عربی الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے:

''پس نشان اہل بدعت عیب کردن است در اہل حدیث۔''

غنیۃ الطالبین (مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی کے صفحہ ۱۹۸) ہی میں پیر صاحب رقم فرماتے ہیں کہ اگرچہ لوگ انھیں کئی ناموں سے پکارتے ہیں، لیکن درحقیقت اس جماعت کا ایک ہی نام ہے، اور وہ ہے اہل حدیث، ان کے الفاظ یہ ہیں: **ولا اسم لھم الاسم واحد وھو اصحاب الحدیث.**

۱۰۔ امام فخرالدین رازی ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے۔ انھوں نے تفسیر کبیر میں بہ ذیل آیت **وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا**، اہل حدیث کا ذکر کیا ہے۔

۱۱۔ حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۶۶۱ وفات ۷۲۸ ہجری) کے علم و

فن اور خدمات گوناگوں کی وسعتوں سے ہر لکھا پڑھا شخص آگاہ ہے۔ انھوں نے اپنی گراں قدر تصنیف ''منہاج السنۃ'' کے مختلف مقامات پر جہمیہ' قدریہ' معتزلہ' خوارج اور کرامیہ وغیرہ فرقوں کی تردید کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں اہل الحدیث اور اصحاب الحدیث کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کے دور میں اہل حدیث بہ حیثیت جماعت کے موجود تھے' جو جہمیہ' قدریہ' معتزلہ اور خوارج وغیرہ فرقوں کے شدید مخالف تھے۔ بعض مسائل کی تعبیر میں خود اہل حدیث میں کچھ اختلاف پایا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت امام منہاج السنۃ میں رقم طراز ہیں۔

ثم بعد ذالک اختلاف اهل الحديث وهم اقل الطوائف اختلافاً في اصولهم لان ميراثهم من النبوة من ميراث غيرهم فعصمهم حبل الله الذى اعتصموا به (جلد ثانی صفحہ ۲۱)

(اس کے بعد اہل حدیث کا باہمی اختلاف ہے جو تمام فرقوں کی بہ نسبت بہت کم ہے' کیوں کہ ان کی علمی وراثت جو خزانۂ نبوت سے انھیں ملی ہے' دوسروں کی وراثت سے نہایت عظیم الشان ہے۔ ان کو اللہ کی رسی (قرآن مجید) نے بچا لیا' جس سے یہ متمسک ہیں۔)

حضرت امام کے نزدیک اہل حدیث کی بہت بڑی خصوصیت وراثت نبوت اور قرآن مجید سے تمسک ہے' یعنی قرآن و حدیث پر عمل پیرا ہونا ان کا خاص وصف ہے جو انھیں دوسروں سے متمیز کرتا ہے۔

منہاج السنہ ہی میں وہ ایک شیعہ عالم علامہ علی کے اعتراض کے ضمن میں اہل حدیث کی ایسے پیرایۂ بیان میں تعریف کرتے ہیں کہ اس جماعت کے علم و عمل کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

من المعلوم لكل من له خبرة ان اهل الحديث من اعظم الناس بحثا عن اقوال النبى صلى الله عليه وسلم وطلبا لعلمها وارغب الناس فى اتباعها وابعد الناس عن اتباع الهوى (جلد ثانی صفحہ ۱۷۸)

(یعنی جس شخص کو کچھ بھی خبر ہے' اسے معلوم ہے کہ اہل حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے متعلق سب سے زیادہ تحقیق کرنے والے' ان کے علم کے طالب' ان کی پیروی میں سب سے زیادہ رغبت رکھنے والے اور خواہشات کی اتباع میں سب سے زیادہ دور ہیں۔)

۱۲۔ علامہ سعدالدین تفتازانی (ولادت صفر ۷۲۲ھ۔ وفات ۲۲ محرم ۷۹۲ھ) مشہور مصنف اور صاحب تحقیق عالم تھے۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے ایک نہایت اہم کتاب اصول فقہ کی کتاب توضیح کی شرح تلویح ہے جو درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے اور طلبا کو پڑھائی جاتی ہے۔ اسے توضیح تلویح کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں علامہ تفتازانی اہل حدیث کا ذکر بھی کرتے ہیں اور شافعیہ کا بھی۔ اجماع کی بحث میں فرماتے ہیں:

وعلیه عامة اهل الحدیث والشافعیة.

(یہی اہل حدیث اور شافعیہ کا نقطہ نظر ہے۔)

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ قدیم دور کی کتابوں میں جہاں اہل حدیث یا اصحاب حدیث اور محدثین کے الفاظ آئے ہیں' اس سے شافعیہ مراد ہیں۔ لیکن یہاں ان کے اس قول کی تردید ہوگئی ہے۔ علامہ سعدالدین تفتازانی نے اہل حدیث کا ذکر شوافع کے مقابلے میں مستقل طور سے الگ کیا ہے' جس سے واضح ہوتا ہے کہ تفتازانی کے زمانے میں شوافع وغیرہ مقلدین کے علاوہ ایک دوسری جماعت بھی باقاعدہ صورت میں موجود تھی اور اس جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس جماعت کا دستورالعمل قرآن وحدیث تھا۔

علامہ سعدالدین تفتازانی شرح مقاصد میں شیعہ حضرات کی دلیل حدیث غدیر خم کی تحقیق میں لکھتے ہیں:

قد قدح فی صحته کثیر من اهل الحدیث (شرح مقاصد جلد ثانی طبع مصر۔ صفحہ ۲۹۰)

(اس کی صحت میں اکثر اہل حدیث نے نکتہ چینی کی ہے۔)

۱۳۔ علامہ کمال الدین ابن ہمام متاخرین حنفیہ سے تعلق رکھتے تھے اور درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کا سال ولادت ۷۹۰ ہجری اور سال وفات ۸۶۱ ہجری ہے۔ فتح القدیر شرح ہدایہ ان کی مشہور تصنیف ہے جو کسی زمانے میں مطبع نول کشور (لکھنؤ) سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی جلد اول کے صفحہ ۲۲، ۹۰، ۱۱۵، اور ۲۸۲ پر انھوں نے اہل حدیث کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے زمانے میں اہل حدیث موجود تھے۔

۱۴۔ علامہ سید محمد امین بن عابدین شامی حنفی نے شرح ردالمختار میں احناف وغیرہ فقہا کا اہل حدیث سے الگ ذکر کیا ہے۔ خوارج کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

وحكم الخوارج عند جمهور الفقهاء والمحدثين حكم البغاة وذهب بعض المحدثين الى كفرهم وقال ابن المنذر ولا اعلم احداً وافق اهل الحديث علىٰ تكفير هم .

(ردالمختار جلد ثالث صفحہ ۴۷۸)

(یعنی خارجیوں کا حکم جمہور فقہا اور محدثین کے نزدیک باغیوں کا سا ہے اور بعض محدثین انھیں کافر قرار دیتے ہیں۔ ابن المنذر کا کہنا ہے کہ میرے علم میں کوئی شخص بھی خوارج کی تکفیر کے متعلق اہل حدیث کا ہم آہنگ نہیں ہے۔)

گزشتہ سطور میں ابتدائے اسلام سے لے کر علامہ شامی تک کی تصانیف سے ہم نے ثابت کیا ہے کہ ان میں اہل حدیث کا تذکرہ کثرت سے کیا گیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ڈیڑھ دو سال کا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ جماعت شروع ہی سے چلی آ رہی ہے اور یہی اصل اسلام ہے اور اہل حدیث کا یہی نقطۂ نظر ہے۔

چھٹا باب

اہل حدیث اور ان کا نقطۂ نظر

علامہ ابوالحسن اشعری چوتھی صدی ہجری کی ایک جلیل القدر شخصیت ہیں، جن کا سلسلہ نسب نو واسطوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ وہ ۲۶۰ھ (۸۷۴ھ) کو بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۵ھ (۹۳۷ء) کے پس و پیش بغداد میں وفات پائی۔ ان کی بہت سی تصنیفات میں سے ایک نہایت اہم تصنیف ''مقالات الاسلامیین'' ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی جلد اول میں انھوں نے اہل حدیث اور ان کے افکار و عقائد کا تذکرہ انتہائی جامعیت کے ساتھ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ''اہل سنت'' کہا جاتا ہے۔۔۔ وہ لکھتے ہیں کہ اہل حدیث یا اہل سنت جن چیزوں کو افکار و نظریات کا بنیادی نقطہ قرار دیتے ہیں اور جس محور کے گرد ان کے عقاید و مسلمات گھومتے ہیں، وہ ہیں۔۔

- اللہ کا اقرار کرنا، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کو صحیح قرار دینا، اس کے رسولوں کو ماننا، جو احکام اللہ کی طرف سے نازل ہوئے اور احادیث کا جو ذخیرہ ثقہ راویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا اور پھر اسے امت تک پہنچایا، اس کی حقانیت کا اقرار کرنا اور ان میں سے کسی چیز کی بھی تردید نہ کرنا۔
- ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ ایک ہے اور بے نیاز ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے، نہ بیوی۔ قرآن کہتا ہے۔

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌo اَللّٰهُ الصَّمَدُo لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْo وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ o (الاخلاص)

(اے پیغمبر! کہہ دو، اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، وہ نہ کسی کا باپ ہے، نہ بیٹا

اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔)

- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔ جنت برحق ہے' جہنم بھی برحق ہے۔ قیامت ضرور آئے گی' اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرے گا۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّارَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ. (الحج:۷)

(بلاشبہ قیامت آنے والی ہے اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اللہ ان سب کو جو قبروں میں مدفون ہیں' اٹھائے گا۔)

- اللہ کے بارے میں اہل حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عرش پر ہے۔ یہ عقیدہ قرآن کی اس آیت پر مبنی ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طٰہٰ:۵)

(رحمان جس نے عرش پر قرار پکڑا۔)

- وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے دو ہاتھ ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ:
- وہ کس طرح کے ہیں۔ دو ہاتھوں کے بارے میں وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص:۷۵)

(جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔)

- ان کے عقیدے کے مطابق اللہ کے ہاتھوں میں بے حد کشادگی پائی جاتی ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (المائدہ: ۶۴)

(بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں۔)

- اللہ کی دو آنکھیں بھی ہیں' لیکن ان آنکھوں کی کیفیت کا کسی کو علم نہیں۔ آنکھوں کا

ذکر قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔

تَجْرِي بِاَعْيُنِنَا (القمر: ۱۵)

(وہ کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے رواں تھی۔)

- آنکھوں کے علاوہ اہل حدیث کے نقطہ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ کا چہرہ بھی ہے۔اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ. (رحمن: ۲۷)

(اے پیغمبر! تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو کہ عظمت واکرام والا ہے۔)

- ان کا کہنا ہے کہ اللہ کی ذات اعلیٰ وارفع میں علم کی صفت پائی جاتی ہے' جس کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ. (النساء: ۱۶۶)

(اے پیغمبر! اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے اسے اپنے علمی کمال کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَمَاتَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَاتَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ. (فاطر: ۱۱)

(کسی عورت کا حاملہ ہونا اور جننا سب اللہ کے علم میں ہے۔)

- ان کے عقاید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ میں سمع و بصر کی صفات بھی پائی جاتی ہیں اور وہ سمیع وبصیر ہے۔

اِنَّهٗ هُوَالسَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (بنی اسرائیل: ۱)

(بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔)

- وہ طاقت وقوت کا بھی مالک ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً.

(حم السجدہ: ۱۵)

(کیا انھیں یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا' وہ قوت میں ان سے

کہیں بڑھا ہوا ہے۔)

- وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ زمین میں خیر وشر وغیرہ جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے اور تمام امور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں۔ انسان وہی کچھ کرتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ قرآن اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَمَا تَشَآؤُنَ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ. (تکویر: ۲۹)

(اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے، مگر وہی جو اللہ چاہے۔)

چنانچہ یہی اہل حدیث کہتے ہیں۔

مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَايَشَاءُ لَايَكُوْنُ.

(جو اللہ چاہتا ہے، وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا، نہیں ہوسکتا۔)

- اللہ کے سوا یہ لوگ کسی کو خالق نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ہر شے کا خالق اور ہر چیز کو پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے۔

- ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنی اطاعت اور فرماں برداری کی توفیق سے نوازا ہے۔ اس نے کافروں کو ذلت سے دوچار کیا ہے اور مسلمانوں کو اپنے لطف وکرم کا مستحق گردانا اور انھیں نیکی کی استعداد بخشی، ان کی اصلاح فرمائی اور ہر معاملے میں ان کو ہدایت اور رہنمائی کی نعمت سے نوازا ہے۔

- ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خیر وشر کے تمام معاملات اللہ کی قضا وقدر کے تابع ہیں۔ قضا وقدر پر یہ پورا ایمان رکھتے ہیں، اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے۔ خوش کن واقعات سے ہو یا ناخوش گوار امور سے، یہ بہرحال اسے دل وجان سے مانتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں۔

- یہ اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں کہ انھیں اپنے نفع ونقصان پر قدرت حاصل نہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نفع ونقصان کا سلسلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمام امور میں یہ لوگ اللہ پر توکل رکھتے ہیں اور ہر وقت اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتے اور اسی کے محتاج ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

- قرآن کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ غیر مخلوق ہے۔
- یہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار ہوگا اور اسی طرح ہوگا جس طرح کہ ہم چودھویں رات کا چاند دیکھتے ہیں۔ لیکن اس دیدار کا شرف صرف ایمان داروں کو حاصل ہوگا' کافروں کو نہیں ہوگا۔ کافر اس کے دیدار سے محروم رہیں گے' جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

  كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ. (تطفیف: ۱۵)

  (ہرگز نہیں۔ ان (کافروں) کو اس دن پروردگار کے دیدار سے روک دیا جائے گا)
- ایمان کے معنی ان کے نزدیک یہ ہیں کہ اللہ کو مانا جائے' اس کے فرشتوں اور اس کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کو تسلیم کیا جائے۔ تقدیر پر ایمان لایا جائے' اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے' خوش کن واقعات سے ہو یا تلخ حقائق سے۔ تقدیر پر ایمان لانے کا انداز اس طرح کا ہونا چاہیے کہ جو مصیبت ٹل گئی' وہ کبھی پیش آنے والی نہ تھی اور جو پیش آ گئی' وہ ٹل نہیں سکتی تھی۔
- ایمان کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ توحید کو مانا جائے' یعنی اس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔
- یہ لوگ اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب (یعنی دلوں کو پھیر دینے والا) ہے۔
- یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شفاعت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے' جو کبائر کے مرتکب ہوئے ہیں۔
- ان کے نزدیک عذاب قبر برحق ہے' حوض کوثر برحق ہے' پل صراط برحق ہے' موت کے بعد زندہ ہونا برحق ہے اور اللہ کی بارگاہ میں حساب ہونا برحق ہے۔ قیامت کے روز اللہ کے حضور کھڑا ہونا برحق ہے۔
- ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان انسان کے قول و عمل سے عبارت ہے اور ایمان میں کمی

بیشی ہوتی رہتی ہے۔

- کبائر کے مرتکب لوگوں کے لیے یہ جہنمی ہونے کی گواہی نہیں دیتے اور نہ یہ موحدین میں سے کسی کے لیے جنت کو حتمی قرار دیتے ہیں۔ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔وہ کسی کو جہاں چاہے رکھے۔چاہے تو عذاب میں مبتلا کر دے اور چاہے تو معاف فرمادے۔
- ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موحدین میں سے بہت سے لوگوں کو جہنم سے نجات دلا دے گا' جیسا کہ متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مروی ہیں۔
- دینی امور ومعاملات سے متعلق یہ لوگ مجادلت ومنازعت سے انکار کرتے ہیں۔
- جبر وقدر کے مسائل سے متعلق بحث وتمحیص سے یہ لوگ ہمیشہ اپنے آپ کو بچا کر رکھتے ہیں۔
- یہ لوگ ہر اس بات کو مبنی برصحت قرار دیتے ہیں جو صحیح احادیث سے مروی ہے یا جس بات کا ثبوت ان آثار سے ملتا ہے جو ثقہ راویوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں' جن کا ہر راوی عادل ہے اور عادل ہی سے اس نے یہ آثار نقل کیے ہیں اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوا۔
- یہ لوگ دینی مسائل میں یہ کہنے کے عادی نہیں ہیں کہ یہ کیوں ہوا اور کیوں کر ہوا۔ یعنی دین میں یہ ''لم'' اور ''کیف'' کو صحیح نہیں قرار دیتے۔
- ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے انسان کو شر کے ارتکاب کا حکم نہیں دیا بلکہ شر سے روکا ہے۔اس نے ہر معاملے میں خیر کو اپنانے کا حکم دیا ہے۔تاہم ان کے نزدیک خیر و شر اللہ کے ارادہ تکوینی میں ضرور داخل ہے۔
- یہ لوگ صحابہ کرام کے فضائل تو بیان کرتے ہیں' لیکن ان کے باہمی مشاجرات کے بیان سے دامن کشاں رہتے ہیں۔ان کے نزدیک صحابہ اور خلفاے راشدین میں اولیں مقام حضرت ابوبکر کا ہے۔پھر حضرت عمر کا' ان کے بعد حضرت عثمان کا اور پھر

حضرت علی کا ہے۔ رضی اللہ عنہم۔

- یہ لوگ اس بات کو صحیح قرار دیتے ہیں جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت کا طالب ہو۔
- کتاب و سنت کو یہ لوگ حجت تسلیم کرتے ہیں' جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. (النساء: ۵۹)
(کسی معاملے میں تم اختلاف کرنے لگو تو اسے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا کرو۔)

- یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے حی (زندہ) قرار دیتے ہیں۔ اسے عالم' قادر' سمیع (سننے والا) بصیر (دیکھنے والا) عزیز' عظیم' جلیل' کبیر' کریم' مرید (ارادہ کرنے والا) اور جواد (فیاض) مانتے ہیں۔
- علم' قدرت' حیات' سمع' بصر' عظمت' جلال' کبریا' ان کے نقطۂ نظر کے مطابق سب صفات باری تعالیٰ کی ہیں۔
- ان کے نزدیک صحابہ کرام کو برسر حق ماننا ضروری ہے۔
- ان کا کہنا ہے کہ دینی امور میں بدعات سے دامن کشاں رہا جائے اور صرف انہی باتوں کو لائق اتباع قرار دیا جائے جن کے اتباع کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔
- ان کے نزدیک مشرکین کے مقابلے میں فریضہ جہاد ادا کرنا چاہیے۔ یہ جہاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے شروع ہوا ہے جو خروج دجال اور اس کے بعد تک جاری رہے گا۔
- یہ لوگ منکر نکیر' معراج نبوی اور رویا کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فوت شدہ مسلمانوں کے لیے اگر دعا کی جائے یا صدقہ دیا جائے تو اس کا انھیں ثواب پہنچتا

ہے۔

- جنت اور دوزخ ان کے نزدیک مخلوق ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی شخص طبعی موت مرے یا مارا جائے اور قتل کیا جائے، وہ سب اس ''اجل'' اور وقت مقررہ کے تحت ہوتا ہے جو پہلے سے اس کے لیے متعین ہے۔
- ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہر قسم کا رزق ہر جان دار کو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور یہ کہ انسان کے دل میں شیطان وسوسے ڈالتا، اسے شکوک میں مبتلا کرتا اور صراط مستقیم سے دور ہٹانے اور صحیح معاملات سے بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔
- ان کے نزدیک، چھوٹے بچے مرجائیں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وہ چاہے تو انھیں عذاب میں مبتلا کرے اور چاہے تو ان کے ساتھ کوئی اور معاملہ روا رکھے۔
- وہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ان سب چیزوں کا علم ہے جن سے انسان اپنی زندگی میں دوچار ہونے والا ہے۔ جو کچھ ظہور میں آنے والا ہے، وہ پہلے سے اللہ کے نزدیک لکھا ہوا ہے، اور تمام امور اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔
- ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بندے اللہ کے فیصلوں پر صبر کریں، اس کے احکام مانیں، جن باتوں سے اس نے روکا ہے، ان سے رکیں اور جن پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے، ان پر خلوص قلب سے عمل کریں، تمام مسلمانوں کے خیر خواہ رہیں، اللہ کی عبادت کو اپنا شعار بنائیں، کبائر سے مجتنب رہیں، زنا، چوری اور کذب بیانی وغیرہ کبیرہ گناہوں سے دامن بچا کر رکھیں۔ عصبیت، فخر وغرور، کبر ورعونت، خود پسندی اور دوسروں کی تحقیر سے بچیں۔
- اہل بدعت سے کنارہ کش رہیں۔ زیادہ تر وقت تلاوت قرآن اور آثار وسنن کے مطالعہ وتحریر میں صرف کریں۔ آیات الٰہی کو مرکز غور وفکر ٹھہرائیں۔ تواضع، فروتنی، حسن اخلاق، اعمال خیر اور خدمت خلق کو لازمہ حیات قرار دیں۔ کسی کو ایذا نہ پہنچائیں، غیبت نہ کریں، کھانے پینے میں احتیاط برتیں اور حلال وطیب چیزوں کی جستجو میں رہیں۔

یہ ہیں وہ چیزیں جن پر اہل حدیث خود بھی عمل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی ان کا عقیدہ ہے‘ یہی ان کی رائے ہے اور یہی ان کا نقطہ نظر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پورا اسلام اس میں آ گیا ہے اور مسلک اہل حدیث پورے اسلام سے تعبیر ہے۔ یہ کسی خاص فرقے‘ خاص جماعت اور حزب کا نام نہیں ہے۔ کامل اسلام اور مکمل دین کا نام ہے۔ اس میں کوئی جھول‘ کوئی الجھاؤ اور کوئی الجھن نہیں ہے۔ کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ ہر بات سیدھی اور ہر معاملہ صاف ہے۔ ہر حکم واضح ہے اور ہر مسئلہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آ جاتا اور ذہن میں اتر جاتا ہے۔ اسلام چوں کہ دین آسان ہے‘ لہٰذا ان چیزوں کو حیطہ فہم میں لانا بھی نہایت آسان ہے۔ الدین یسر.

اہل حدیث کوئی فرقہ نہیں‘ اصل اسلام ہے:

چوتھی صدی ہجری اور دسویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز محقق محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق نے ’’الفہرست‘‘ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو مختلف علوم وفنون پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کون سا علم کب عالم وجود میں آیا اور کن کن اصحاب علم نے اس کی ترویج واشاعت میں کیا خدمات سرانجام دیں۔ بہ اختلاف روایات ابن ندیم وراق نے ۳۹۰ھ (۱۰۰۰ء) کے لگ بھگ وفات پائی۔

علوم وفنون اور رجال کے سلسلے میں ’’الفہرست‘‘ کا شمار کتب حوالہ میں کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے چھٹے مقالے کا چھٹا فن ’’فقہائے محدثین اور اہل حدیث‘‘ پر محتوی ہے۔ اس مقالے میں پہلی‘ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے محدثین اور اصحاب حدیث کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس بزرگ نے کون سی کتابیں تصنیف کیں۔

یہ کتاب اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ ’’اہل حدیث‘‘ کوئی نیا مذہب یا نیا فرقہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ابتدائے اسلام سے ہے اور یہی درحقیقت اصل اسلام ہے‘ جس کی نسبت کتاب وسنت کی طرف ہے۔ باقی تمام مذاہب ومسالک افراد وائمہ کی طرف منسوب ہیں اور ان کے فقہی رجحانات وآرا کے آئینہ دار۔۔۔!

●

اہل حدیث اور اہل سنت:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام احمد اور لقب تقی الدین ہے۔ ان کی کنیت ابو العباس ہے۔ وہ ۱۰۔ ربیع الاول ۶۶۱ھ (۲۱/جنوری ۱۲۶۳) کو حران کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور علم و تحقیق میں یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے ۲۸۔ ذیقعدہ ۷۲۸ھ (۴/اکتوبر ۱۳۲۸ء) کو وفات پائی۔

امام ابن تیمیہ کی ایک مشہور تصنیف ''منہاج السنہ'' ہے۔ اس کتاب میں وہ اہل حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ان اهل الحديث من اعظم الناس بحثا عن اقوال النبى صلى الله عليه وسلم وطلبا لعلمها و ارغب الناس فى اتباعها وابعد الناس عن اتباع هو يخالفها.[۱]

(اہل حدیث کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے سب سے زیادہ متلاشی رہتے ہیں اور آپؐ کے فرامین کی اتباع ان کے نزدیک انتہائی مرغوب و محبوب ہے اور جو چیز اس کے خلاف ہو اُس سے دور بھاگتے ہیں۔)

اسی کتاب میں دوسری جگہ وہ اہل حدیث اور اہل سنت کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور تحریر فرماتے ہیں۔

واما اهل الحديث والسنة والجماعة فقد اختصوا باتباع الكتاب والسنة الثابتة عن نبيهم صلى الله عليه وسلم فى الاصول والفروع وماكان عليه اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم[۲]

(اہل حدیث اور اہل سنت والجماعت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اصول و فروع میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مرکز اتباع ٹھہراتے ہیں اور ان

۱۔ منہاج السنہ جلد ۲، صفحہ ۱۷۹۔ ۲۔ ایضاً صفحہ ۱۰۳۔

امور کی پیروی کرتے ہیں، جن پر صحابہ کرام عامل تھے۔)

ائمہ اربعہ سے پہلے کا مذہب:

امام ابن تیمیہ صاف الفاظ میں رقم فرماتے ہیں کہ اہل حدیث کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ائمہ اربعہ سے پہلے کا مذہب ہے اور صحابہ کرام اسی کے مطابق عمل کرتے تھے اور درحقیقت یہی لوگ اہل سنت ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وارشادات پر عمل پیرا ہیں۔ امام صاحب اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔

ومن اهل السنة مذهب معروف قبل ان يخلق الله اباحنيفة ومالكا والشافعي واحمد فانه مذهب الصحابة تلقوه عن نبيهم ومن خالف ذالک كان مبتدعا عند اهل السنة والجماعة.[1]

(اہل سنت کا یہ معروف مذہب ہے جو امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے اور یہی مذہب صحابہ رضوان اللہ علیہم کا ہے، جس کی تعلیم انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی، جو لوگ اس کے خلاف دوسری راہ اپنائیں گے، ان کا شمار اہل بدعت میں ہوگا۔)

کتاب وسنت کے اصل متبعین

اہل حدیث کے اوصاف بیان کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

فهم يومنون بكل رسول وبكل كتاب لايفرقون بين احد من رسل الله ولم يكونوا من الذين فرقوا دينهم و كانوا شيعا.[2]

(یہ لوگ ہر رسول اور اللہ کی ہر کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، نہ یہ اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان فرق کرتے ہیں اور نہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دین میں تفرقہ ڈالتے ہیں۔)

۱۔ منہاج السنۃ مطبوعہ المکتبۃ السلفیہ۔ لاہور ۱۳۹۶ھ۔ ۱۹۷۶ء

۲۔ نقض المنطق صفحہ ۳۳۔

امام ابن تیمیہ ''نقض المنطق'' میں اہل حدیث کے بارے میں امام اسماعیل بن عبدالرحمٰن صابونی (متوفی ۴۴۹ھ/۱۰۰۸) کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

ان اصحاب الحدیث المتمسکین بالکتاب والسنة یعرفون ربهم تبارک وتعالیٰ بصفاته التی نطق بها کتابه وتنزیله وشهدله بهارسوله علی ماوردت به الاخبار الصحیحة ونقله العدول الثقات ولا یعتقدون تشبیها لصفاته بصفات خلقه ولا یکیفونها تکییف المشبه ولا یحرفون الکلم عن مواضعه تحریف المعتزلة والجهمیة.

(اہل حدیث کا شیوہ یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت سے تمسک کرتے ہیں۔ اللہ کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اس نے خود اپنی کتاب (قرآن مجید) میں بیان فرمائی ہیں اور جن کا ذکر اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان صحیح احادیث میں کیا ہے جو عادل وثقہ راویوں سے مروی ہیں۔ وہ اس کی صفات کو اس کی مخلوق کی صفات سے تشبیہ نہیں دیتے۔ نہ ان کی کیفیات بیان کرتے ہیں اور نہ معتزلہ وجہمیہ کی طرح کلام میں تحریف کرتے ہیں۔)

ساتواں باب

اہل حدیث کے اصول وضوابط

مسلک اہل حدیث کے اصول وضوابط اور فروع واصول قرآن وسنت کے قصر رفیع پر استوار ہیں۔ یہی اس کے حاملین کے روح کی غذا اور یہی ان کے قلب وضمیر کی صدا ہے اور اسی سے اس کے ماننے والے فکر ونظر کی توانائی اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ زمانہ ہزاروں لاکھوں کروٹیں لے چکا ہے اور ہر صبح نئے سے نئے انقلاب کو اپنے دامن پر رونق میں لپیٹ کر لباس شب زیب تن کرتی ہے' لیکن قرآن کے احکام واوامر اور قواعد وقوانین اپنی جگہ اٹل ہیں۔ اس کے رنگ وروغن میں وہی سج دھج کارفرما ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کے حسن وزیبائی میں وہی نکھار' وہی رعنائی اور وہی دل آویزی ہے جو دور نزول میں اس کے ساتھ مختص تھی۔ بلکہ علوم ومعارف کی کثرت اور ارتقا وتقدم کی ہر لحظہ فراوانیوں نے اس میں مزید سامان موعظت پیدا کر دیا ہے۔ کارخانہ کائنات جس نہج پر چل رہا ہے اور یہ عالم رنگ وبو ترقی کی جن منازل کی طرف گام فرسا ہے' اس کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو وہ وقت دور نہیں جب پوری دنیا صرف قرآن و سنت ہی کو مرکز اطاعت قرار دینے لگے گی اور نبض عالم کی دھڑکنیں اسی میں مرکوز ہو کر رہ جائیں گی۔

قرآن مجید

قرآن مجید وہ اولین خزینہ نور اور معدن رشد وہدایت ہے' جس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک بول میں ہزاروں مشعلیں فروزاں ہیں اور جس کی ایک ایک آیت میں حکمت ودانائی کے لاتعداد گہر ہائے یک دانہ مستور ہیں۔ اس کی ہزاروں تفسیریں لکھی گئی ہیں اور ہزاروں لکھی جائیں گی۔

قرآن کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے جو اسے تمام کتب ساویہ سے ممتاز کرتی ہے کہ غیر مسلم اور اس کے شدید مخالف بھی اسے شائستہ التفات ٹھہراتے اور اس کی تفسیر و تبیین کے لیے قلم کو حرکت دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی نیتوں کی تہوں میں بغض وعناد کے جراثیم بھرے ہوئے ہیں اور اس کے اظہار کے لیے وہ موقع و محل کی تلاش میں رہتے ہیں۔

قرآن مجید وہ صحیفہ عظیم المرتبت اور کتاب مقدس ہے، جس میں اوامر و نواہی بھی ہیں اور واقعات و قصص بھی۔ معاملات بھی ہیں اور عبادات بھی۔ فضائل اسلام کی تفصیل بھی ہے اور معائب کفر و شرک کی وضاحت بھی۔ دنیوی زندگی کے فرائض بھی اس میں صراحت سے بیان کیے گئے ہیں اور بہ صورت انکار عالم آخرت میں جن نتائج و عواقب سے دوچار ہونا پڑے گا اس کی بھی پوری تصریح کی گئی ہے۔ اعمال صالحہ اور کردار خیر پر جو جزا مرتب ہوگی اس کا بھی ذکر ہے اور اعمال بد اور افعال قبیحہ کی سزا و عقوبت سے بھی آگاہ فرمایا گیا ہے۔ جنت کی مسرت آگیں حقیقت بھی اس میں مذکور ہے اور نار جہنم کی ہولناکیوں سے بھی ڈرایا گیا ہے۔ حکومت و سلطنت کی بھاری بھرکم ذمے داریوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور رعایا و محکوم سے حسن سلوک کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ متعدد مقامات پر مخالفین کو تحدی بھی کی گئی ہے اور بارگاہ خداوندی میں تسلیم و رضا کا سر جھکانے والوں کو بشارت و خوش خبری سے بھی نوازا گیا ہے۔

چھوٹے بڑے معاملات، امیر و مامور سے تعلقات، راعی و رعیت سے روابط، غلام و آزاد سے مراسم، مسلم اور غیر مسلم سے میل جول، جنگ و جہاد کی نوعیت، غرض اسلوب حیات کے تمام گوشوں کا قرآن مجید میں کسی نہ کسی طریقے سے ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی بات توضیح و تصریح سے بیان کی گئی ہے اور کوئی اجمال و اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ بعض امور سے متعلق اشارات و کنایات پر اکتفا کیا گیا ہے اور ان اشارات و کنایات کا پیرایۂ اظہار اس درجہ دل ربا و دل کش ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت بھی ہے اور وہ تمام خوبیاں بھی بہ درجہ اتم اس میں سمٹ آئی ہیں جو مخاطب کو اپنی طرف کھینچتی اور اس کے قلب

وضمیر پر اثر انگیزی کے نقوش مرتسم کرتی ہیں۔

قرآن مجید کی رفعت وعظمت کے بارے میں ان نہایت مختصر اشارات کے بعد اب آیے حدیث وسنت کی طرف کہ قرآن کے ساتھ اسے بھی شریعت کا ماخذ ومصدر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔

حدیث وسنت

حدیث وسنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وفرامین کا وہ مجموعہ روح پرور اور آپؐ کے اعمال وافعال کا وہ نقش حسیں ہے، جس کی حفاظت وصیانت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں شروع ہو گیا تھا اور پھر ایک خاص ترتیب وتسلسل کے ساتھ اہل الحدیث کے گروہِ پاک باز نے اسے جاری رکھا۔

اس طائفہ مقدسہ کی مسلسل جدوجہد سے تمام ذخیرۂ حدیث وسنت مدون ومرتب شکل میں آج بھی دنیا میں موجود ہے اور اس کے شروح وحواشی اور تعلیقات کے سلاسل بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی مساعی جمیلہ سے عالم وجود میں آچکے ہیں اور آرہے ہیں۔ آئندہ بھی جب تک یہ جہان رنگ وبو قائم ہے وجود میں آتے رہیں گے۔ شارحین حدیث نے ہر زبان میں اس پر کام کیا ہے اور نہایت محنت وہمت سے یہ بنیادی فریضہ انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں اور ہمیشہ دیتے رہیں گے۔

شریعت اسلامی میں حدیث وسنت کو نص قطعی کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے زندگی کے ہر موڑ پر ہم اس کے محتاج ہیں، ہر معاملے میں اسے مشعل راہ ٹھہراتے ہیں اور اس سے استدلال کرتے ہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک یہ حجت قطعی ہے اور اس کے مقابلے میں کسی اور کے قول وفعل کو محل استدلال ٹھہرانا ہرگز اہل حدیث کا نقطہ نظر نہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وفرامین اور عمل وکردار کا یہ نتیجہ نکلا کہ آپ کی حیات طیبہ کے نہایت مختصر عرصے میں ایک ایسا معاشرہ معرض ظہور میں آگیا تھا جو خیرات وحسنات کی فراوانی اور ظاہر وباطن کی پاکیزگی کی بنا پر اپنی مثال آپ تھا۔ پھر یہ معاشرہ

سیکڑوں اور ہزاروں افراد پر مشتمل نہیں تھا' آپؐ کے زمانے ہی میں کم وبیش ڈیڑھ لاکھ افراد کی عظیم الشان تعداد پر محیط تھا۔ مسلمانوں کے لیے وہ نہایت نامساعد حالات تھے' ان حالات میں ایسے پاکیزہ اطوار معاشرے کا پیدا ہونا ایک بہت بڑا معجزہ تھا۔ چشم فلک نے اس سے قبل ایسا رفیع المرتبت معاشرہ کبھی نہیں دیکھا تھا' جس کے تقدس وطہارت اور روحانی وقلبی عظمت ورفعت کی خود اللہ تعالیٰ نے شہادت دی۔ اندازہ کیجیے قرآن نے کس درجہ بے مثال الفاظ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔

رضی الله عنهم و رضوا عنه۔

اللہ کی خوش نودی انھیں حاصل ہوگئی اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

کروڑوں مربع میل میں پھیلی ہوئی زمین نیکی سے تہی داماں اور حق وصداقت کی صدائے سامعہ نواز سے قطعی محروم ہو چکی تھی۔ اسی معاشرے اور اسی پاک باز جماعت نے اس گلستان خیر کی آب یاری کی اور معارف وحقائق کا ایسا دبستان سجایا' جس کی ہمہ گیر مہک سے اس دور کے لوگ بھی فیض یاب ہوئے' اس کے بعد بھی آج تک ہو رہے ہیں اور رہتی دنیا تک حصول فیض کرتے رہیں گے۔

یہ پہلا کاروان خیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا تھا۔ دوسرا اس سے بالکل متصل اور ملا ہوا' ان کے تلامذہ عالی قدر تابعین کا اور پھر تبع تابعین کا تھا۔ یہی وہ رفیع الشان جماعت ہے جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم [1] کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔ یعنی بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے' پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد ہیں اور پھر ان کا جو ان کے بعد ہوں گے۔

تابعین وتبع تابعین اور ان کی صحبت ورفاقت سے مستفیض ہونے والے حضرات نے حدیث وسنت کی ترویج واشاعت میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک فرمان کو خود سمجھنے اور آئندہ نسلوں تک اسے پہنچانے کی غرض سے محفوظ کرنے کے لیے دور دراز کے مشکل تریں سفر کیے اور ہر وہ دروازہ کھٹکھٹایا جہاں سے انھیں حصول مقصد کی ذرا بھی توقع ہو سکتی تھی۔

۱۔ متفق علیہ

انھوں نے حدیث وسنت کو پھیلانے اور عام کرنے کی غرض سے مدارس قائم کیے اور وسیع پیمانے پر لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا۔ ارشادات پیغمبر کی حفاظت کے لیے قلم وقرطاس سے کام لیا اور انھیں بڑی بڑی کتابوں میں باقاعدہ عنوان قائم کر کے مرتب فرمایا۔ اس طرح اس کی نشر واشاعت کا دائرہ آگے بڑھا اور پھر بڑھتا ہی چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی توسیع واشاعت نے ایک ہمہ گیر اور انتہائی وسعت پذیر شکل اختیار کر لی اور فرامین پیغمبر کے تمام گوشے واضح اور نمایاں صورت میں لوگوں کے علم و مطالعے میں آئے۔

اہل حدیث کی دعوت

اہل حدیث کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان تمام اساطین حدیث وسنت اور ائمہ فقہ کی تگ و تاز کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کیا جائے، زندگی کے ہر موڑ پر انھیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا جائے، ان کی مساعی کی جہاں تک ممکن ہو تحسین کی جائے۔ پھر عقیدت و تحسین اور اعتراف کے صرف الفاظ ہی زبان سے ادا کرنے کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے جو پہلو ائمہ عظام کی وساطت وسعی سے ہم تک پہنچے ہیں، انھیں اپنی زندگیوں میں سمویا جائے، انھیں مدار عمل ٹھہرایا جائے اور ان سے ہم آہنگ ہو کر سفر حیات کی منزلوں کو طے کیا جائے۔

یہی اہل حدیث کی دعوت ہے اور یہی ان کا طریق عمل ہے۔ جو راہ کتاب وسنت کے مطابق ہے، وہ اہل حدیث کی راہ ہے اور جو اس سے متصادم ہے، وہ ان کی راہ نہیں ہے۔ ان کا انداز تبلیغ اور اسلوب کلام مثبت ہے، منفی نہیں ہے۔ کسی سے لڑنا اور گتھم گتھا ہونا، خود بھی پریشان ہونا اور دوسروں کو بھی مبتلائے اذیت کرنا قطعاً اہل حدیث کا شیوہ نہیں۔ ان کے نزدیک مثبت انداز ہی وہ انداز ہے، جس سے مسائل کی پیچیدہ گرہیں کھلتی اور پیش آئند مشکلات حل ہوتی ہیں۔ اصلاح احوال کا راز اسی میں مضمر ہے اور اسی سے ذہن کے دریچے کھلتے اور برائی کے کواڑ بند ہوتے ہیں۔

ائمہ فقہ اور اہل حدیث

یہاں ہم یہ حقیقت بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اہل حدیث کے قلب و ذہن کا کوئی گوشہ فقہ اور ائمہ فقہ کے متعلق قطعاً غبار آلود نہیں ہے۔ ان کے نزدیک فقہ و تقنین کی وہ وسعت پذیر مساعی اور گراں مایہ خدمات بہ درجہ غایت قدر و منزلت کی مستحق ہیں جو ائمہ فقہ نے مختلف حالات و ظروف کی روشنی میں اپنے اپنے انداز میں سرانجام دیں۔

وہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فراست فقہی، فطانت علمی اور اجتہادی صلاحیتوں کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتے ہیں اور جس نہج سے انھوں نے قصر فقاہت کو ہم کنار رفعت کیا، وہ ان کی ذہانت اور علم و دانش کی گہرائی و گیرائی کا بین ثبوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اہل حدیث کے مدارس میں ہمیشہ باقاعدہ فقہ حنفی داخل نصاب رہی ہے اور اس کی تعلیم و تدریس کو اہل حدیث کے ہاں ہر دور میں سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ ایک تسلسل ہے جو ابتدا سے اب تک جاری ہے۔

ان کے نزدیک امام ابوحنیفہ کسی ایک ہی فرقے کی میراث نہیں ہیں، بلکہ ان کا خزانہ علم ہر مکتب فکر کے لیے ہر آن وا ہے اور اس سے کسب ضو کرنا چاہیے۔ فروعات میں اظہار اختلاف کے باوجود اکابر اہل حدیث فقہ حنفیہ کے متون پر بہت سے علمائے احناف سے زیادہ وسعت نظر رکھتے ہیں۔ جو حضرات امام ابوحنیفہ کی وراثت کے مدعی بنے بیٹھے ہیں، وہ ان کے علم و فضل کو ایک ہی گوشے اور ایک ہی فرقے میں محدود کر رہے ہیں۔ یہ حضرت امام کی توقیر نہیں بلکہ ان کی فیض رسانیوں کے دائرے کی حد بندی کر دینا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ان فقید المثال علمی و فقہی خدمات کو بھی ہم کھلے دل سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں، جن کی بدولت پہلی دفعہ استناد حدیث کے متعدد گوشے نکھر کر سامنے آئے اور فکر و نظر کی طراوت کا باعث بنے۔ یہی وہ گوشے ہیں جنھوں نے فقہ و اصول کے ایک باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کی اور جن سے فقہیات میں کتاب و سنت سے استدلال و استنباط کی راہیں کھلیں۔

اسی طرح اہل حدیث کے نزدیک امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کی

خدمات جلیلہ اور مساعی جمیلہ بھی از حد لائق تعریف ہیں کہ انھوں نے حفاظت حدیث اور صیانت سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذمہ داریوں کو بھی بہ طریق احسن پورا کیا اور تعلیم و تدریس کی مسانید علیا کو بھی زینت بخشی۔ اس کے ساتھ ان کی عظمت کردار کا یہ پہلو بھی لائق صد افتخار ہے کہ انھوں نے جبر و ملوکیت کی چیرہ دستیوں کے خلاف ایسی عزیمت و استقلال کا مظاہرہ کیا اور ایسی قربانی اور جرات و جاں بازی کا ثبوت دیا کہ تاریخ اسے ہمیشہ اپنے سینے میں محفوظ رکھے گی اور لوگ اسے بہ طور مثال پیش کرتے رہیں گے۔

حق و صداقت کسی خاص فقہ میں محدود نہیں

فقہ کی اہمیتوں کو پوری طرح تسلیم کرنے کے باوجود اور ائمہ فقہ کی مساعی بوقلموں کو سزاوار مدح و ستائش ٹھہرانے کے باوصف، ہم حق و صداقت کے تمام پہلوؤں کو کسی ایک ہی مدرسہ فقہ میں محدود نہیں مانتے اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہر قسم کے مسائل شرعیہ اور ہر نوع کے امور دینیہ فقط کسی ایک نقطہ فکر کی فقہ میں محصور اور سمٹے ہوئے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ حق و صداقت کو تمام مسالک فقہ میں دائر و سائر مانا جائے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا جائے کہ کسی مسئلے میں حق، فقہ کے مسالک اربعہ سے باہر بھی جلوہ گر ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔

فقہ، ماخذ شرع نہیں

یہاں یہ یاد رہے کہ فقہ و تشریع کے چار ماخذ ہیں۔

(۱) کتاب اللہ۔

(۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) اجماع۔۔۔۔اور

(۴) قیاس۔

موالک کے نزدیک فقہ و تشریع کا ایک مبنی و ماخذ تعامل اہل مدینہ ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فقہ بجائے خود ماخذ شرع نہیں بلکہ اس کا قصر پُر شکوہ

جن بنیادوں پر استوار ہے وہ ہیں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس صحیح۔ اگر امام مالک کی رائے کو مان لیا جائے تو تعامل اہل مدینہ بھی اس میں شامل سمجھیے!

سوال یہ ہے کہ شرع کے بنیادی ماخذ (جو علی الترتیب قرآن، سنت، اجماع اور قیاس صحیح یا بقول مالکیہ تعامل اہل مدینہ ہیں) انھیں چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ کیوں اختیار کیا جائے؟

مذکورہ بالا ترتیب کے اعتبار سے ماخذ شرع کی اصل بنیاد کتاب و سنت ہی قرار پاتی ہے اور اسلام کے رخ زیبا کے نکھار کا بنیادی طور سے اسی پر انحصار ہے۔ اگر عروس وقت اپنے آپ کو اس سے مزین کر لے اور روح عصر اس کی صدائے جاں فزا کو آویزہ گوش بنا لے تو پیش آئند مسائل نہایت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں اور اصلاح احوال کے آثار تیزی کے ساتھ نظر و بصر کے زاویوں میں آ جاتے ہیں۔ آیئے کتاب و سنت کے پُرنور دروازے پر دستک دینے کی کوشش کریں اور اپنی زندگیوں کو اس صاف ستھرے قالب میں ڈھالنے کے لیے ساعی ہوں۔ یہی نجات کی اصل راہ ہے اور اسی سے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح وابستہ ہے۔

اصل ہدف کتاب و سنت

اہل حدیث کے بارے میں یہاں ہم چند مزید باتیں ضبط تحریر میں لانا چاہتے ہیں۔ اس مسلک کے حاملین کو مختلف ناموں سے پکارا اور موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصحاب الحدیث، اہل سنت، سلفی، اثری، برصغیر پاک و ہند کے بعض لوگ ''محمدی'' بھی کہلاتے ہیں۔

''اہل حدیث'' کی مروجہ اصطلاح کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اسلامی شریعت کا بنیادی سرچشمہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی خاص امام کی تقلید سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے اور یہی ان کے نزدیک صحیح ہے کہ اسلام کے دور اول میں صحابہ کرام قرآن و حدیث ہی کو پیمانہ عمل قرار دیتے تھے۔ تابعین اور تبع تابعین کے عمل و قول کا محور بھی یہی تھا۔

قرون اولیٰ سے لے کر اب تک ''اہل حدیث'' کی اصطلاح کا اطلاق ہمیشہ ان لوگوں پر ہوتا رہا ہے' جنھوں نے حدیث وسنت کو ہدف عمل ٹھہرایا اور معیار فکر قرار دیا ہے۔ ان کا یہ معمول اور طرۂ امتیاز رہا ہے کہ انھوں نے ہر دور میں احادیث پیغمبر کی حفاظت کی' ہر موقعے پر اس کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دیا اور ہر قسم کے حالات میں سنت کی اتباع اور ارشادات نبوت کو اپنی زندگی کا مقصد اولین قرار دیے رکھا۔ جو پھول چمنستانِ نبوت سے ملا اسے حرز جاں بنایا اور اس کی مہک کو پھیلانے کی ہر ممکن سعی کی اور جو چیز مخالف سمت سے آئی' اسے بلا توقف اور بلا خوف لومۃ لائم ترک کر دیا۔

ان کے عقائد و افکار وہی ہیں جو اسلاف سے منقول ہیں۔ اللہ کی توحید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی اتباع ان کا لازمہ حیات ہے۔ صفات الٰہی کے بارے میں ان کا مسلک' اسلاف کے تصورات کا پوری طرح عکاس ہے۔ یہ لوگ شرک خفی اور شرک جلی کو حرام سمجھتے اور بدعت کو ضلالت و گمراہی قرار دیتے ہیں۔ توہمات اور ضعیف الاعتقادی سے دامن کشاں رہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاے کرام ان کے نزدیک بشر ہیں اور معصوم ہیں اور بشریت ہی میں ان کی افضلیت پنہاں ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ کو ہے' اللہ کے سوا کوئی ہستی معاملات غیبی سے آگاہ نہیں۔ یہ برملا کہتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام وفات پا گئے ہیں۔ ان کی دنیوی زندگی ختم ہو گئی ہے۔ کوئی نبی اس عالم آب وگل میں حاضر و ناظر نہیں ہے۔ اعراس اور میلاد کی مجلسوں کا انعقاد ان کے نزدیک بدعات میں شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ ائمہ دین کو زہد و تقویٰ کی دولت سے مالا مال کیا تھا' علم و عمل سے خوب نوازا تھا اور بہت سے فضائل اور مکارم اخلاق ان کو عطا فرمائے تھے اور ان اوصاف و کمالات کی بنا پر وہ بہ درجہ غایت احترام و تکریم کے مستحق تھے اور مستحق ہیں' لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کے مقابلے میں کسی امام اور کسی عابد و زاہد کی بات کو حجت شرعی نہیں مانا جائے گا۔

ولادت سے لے کر وفات تک انسان جن مراحل سے گزرتا اور سفر حیات کے جن نشیب و فراز کو عبور کرتا ہے' ان سب سے متعلق اہل حدیث نمایاں خصوصیات و امتیازات

کے حامل ہیں۔ شادی بیاہ کے مواقع پر بھی وہ سنت نبوی کو پیش نگاہ رکھتے ہیں اور ان امور کو مشعل راہ ٹھہراتے ہیں جو احکام پیغمبر سے ہم آہنگ ہیں۔ غمی اور موت کے اندوہناک معاملات میں بھی ان کی نگاہ ارشادات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رہتی ہے۔ جو بات سنت کے مطابق ہے' اسے اپنانا اور جو سنت کے مخالف ہے اسے ترک کرنا ان کا شیوۂ زندگی ہے۔

سنت کو مدارِ عمل ٹھہرانے میں یہ لوگ انتہائی حریص اور ردّ بدعات میں نہایت بے باک ہیں۔ اس ضمن میں نہ یہ کسی کی مخالفت کی پروا کرتے ہیں اور نہ کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کو ان کے نزدیک کوئی اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ہدف صرف عمل بالحدیث اور انکار بدعات ہے۔ تمام رسوم و رواج کو یہ لوگ سنت پیغمبر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شے سنت کی میزان میں پوری اترتی ہے تو اسے فوراً قبول کر لیا جاتا ہے' اور اگر کسی چیز کا کوئی گوشہ سنت سے متصادم ہے تو بلا تامل اس سے اعراض کی راہ اختیار کر لی جاتی ہے۔

آٹھواں باب

اہل حدیث اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

برصغیر کی سرزمین علم وادراک اور فضل وتحقیق کے اعتبار سے ہمیشہ سرسبز وشاداب رہی ہے۔ اس کی زرخیز مٹی سے بے شمار اہل قلم اور اصحاب تصنیف پیدا ہوئے جنھوں نے ہر حال اور ہر دور میں علم کی شمع روشن رکھی اور درس وتدریس میں زندگی بسر کی۔ ان کی علمی کاوشوں اور تصنیفی سرگرمیوں کی تفصیلات تذکرہ ورجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ کئی ایسے خاندان عالم وجود میں آئے جن کے اسلاف واخلاف کی بے پناہ مساعی اور شب وروز کی تگ ودو سے نہ صرف برصغیر کے لوگوں نے استفادہ کیا بلکہ پوری علمی دنیا میں ان کی شہرت پھیلی اور تمام عالم اسلام ان سے فیض یاب ہوا۔ ان جلیل القدر خاندانوں میں ایک خاندان حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اس خاندان کے لائق احترام ارکان نے بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری (اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی) میں جو علمی اور عملی کارنامے سرانجام دیے' اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔

یہاں ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے ان افکار وتصورات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے حدیث وسنت کے متعلق اپنی مختلف تصانیف میں ظاہر فرمائے ہیں۔ لیکن پہلے ان کے نہایت مختصر حالات۔۔۔!

شاہ صاحب کی ولادت:

شاہ صاحب بروز چہار شنبہ' بوقت طلوع آفتاب ۴۔ شوال ١١١۴ھ (٢١۔ فروری ١٧٠٣ء) کو چھٹے مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر کے عہد آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے ٹھیک چار سال بعد ٢٨۔ ذیقعدہ ١١١٨ھ (٢١۔ فروری ١٧٠٧ء) کو عالم گیر نے وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی مغل حکومت کے زوال کا آغاز ہو گیا۔

شاہ صاحب کا مولد موضع پھلت ہے‘ جو ضلع مظفر نگر (بہار) میں ایک گاؤں ہے۔ علمی اعتبار سے اس گاؤں کو کافی عرصے تک شہرت و اہمیت حاصل رہی۔ جس زمانے میں شاہ صاحب نے شعور کی آنکھیں کھولیں‘ اس زمانے کو سیاسی لحاظ سے ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے عہد زوال سے تعبیر کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہبی اور علمی اعتبار سے مسلمانوں نے اس عہد میں بے حد ترقی کی منزلیں طے کیں اور اصلاح و تجدید کے عظیم الشان کارنامے سرانجام دیے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہندوستان میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے‘ اسی زمانے (۱۱۱۵ھ۔۱۷۰۳ء) میں اسلام کے دور جدید کے دوسرے عظیم مصلح اور مجدد ملت حضرت شیخ محمد بن عبدالوہاب کا ظہور سرزمین نجد میں ہوا۔ رحمۃ اللہ علیہم۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب اور شاہ ولی اللہ

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جس عہد میں ارض ہند کے شاہ ولی اللہ مدینہ منورہ میں طلب علم کی منزلیں طے کر رہے تھے‘ اسی عہد میں سرزمین نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب مدینہ طیبہ کے رفیع المرتبت اساتذہ سے تحصیل علم میں مشغول تھے‘ یعنی مستقبل کے یہ دونوں مجدد اور عظیم مصلح ایک ہی عہد اور ایک ہی وقت میں دیار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم میں علمی اور روحانی تربیت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان دونوں مجددین ملت کو ایک ہی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ نجد اور ہندوستان مسافت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور تھے‘ لیکن ان دونوں ملکوں کی علمی‘ عملی‘ دینی اور سیاسی فضا بالکل ایک سی تھی‘ اس لیے دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک ہی انداز سے اپنی تجدیدی مساعی کا آغاز کیا اور ایک ہی اسلوب سے اپنی سرگرمیوں کی رفتار کو آگے بڑھایا۔ پھر دونوں کو اپنی تبلیغی تگ و تاز کی راہوں میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی ایک ہی قسم کی تھیں۔

شاہ صاحب کا کاروان حیات

شاہ صاحب جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ۴؍ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱۔ فروری ۱۷۰۳ء) کو پیدا ہوئے اور اورنگ زیب عالم گیر نے ۲۸۔ ذیعقدہ ۱۱۱۸ھ (۲۱۔ فروری ۱۷۰۷ء) کو وفات پائی۔ یعنی انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے چار سال پہلے اس عالم ناسوت میں قدم رکھا اور ان کا کاروان حیات نو مغل بادشاہوں کے عہد سے گزرا جو بہ ترتیب حکمرانی حسب ذیل ہیں۔

(۱) محی الدین محمد اورنگ زیب عالم گیر۔ (وفات ۲۱۔ فروری ۱۷۰۷)

(۲) محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ اول: (وفات ۱۸؍ فروری ۱۷۱۲)

(۳) معزالدین جہاں دار شاہ۔ (قتل ۱۰۔ جنوری ۱۷۱۳)

(۴) فرخ سیر۔ (قتل ۱۷؍ فروری ۱۷۱۹)

(۵) رفیع الدرجات۔ (وفات ۲۷ مئی ۱۷۱۹ء)

(۶) رفیع الدولہ۔ (وفات ۲۷۔ اگست ۱۷۱۹)

(۷) محمد شاہ معروف بہ رنگیلا۔ (وفات ۱۶۔ اپریل ۱۷۴۸)

(۸) ابراہیم شاہ صرف ایک ماہ آٹھ دن حکومت کی۔

(۹) ابوالنصر احمد شاہ۔ (وفات ۳۱۔ دسمبر ۱۷۷۴)

اس طویل عہد میں ہندوستان جن ہیبت ناک واقعات اور خوں ریز حوادث سے دوچار ہوا، وہ برصغیر کی تاریخ حکمرانی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے حد ذہنی اذیت اور قلبی کوفت کا باعث ہیں۔ اس مدت میں یہ پورا خطہ ارض مختلف فتنوں اور مسلسل صدموں کی زد میں رہا۔ مرہٹوں کی بے پناہ سرکشی، سکھوں کے خون آشام مظالم، نادر شاہ کا قتل عام، سادات بارہ کا تسلط، ان کے ہاتھوں فرخ سیر کی گرفتاری اور پھر اس کی انتہائی بے بسی کی موت، ملک کی سیاست میں روہیلوں کی شرکت، دربار شاہی کے ایرانی و تورانی امرا کی باہمی

کش مکش، ارض ہند پر احمد شاہ ابدالی کے مسلسل حملے، مغربی طاقتوں کی ملکی سیاست میں بہ تدریج مداخلت، بنگال میں انگریزوں کا اقتدار اور مدراس کے بعض علاقوں پر ان کی حکومت کا قیام، یہ وہ واقعات تھے جو تقریباً سب کے سب شاہ صاحب کی نظروں کے سامنے نمودار ہوئے۔ شاہ صاحب ان تمام واقعات سے بہ درجہ غایت متاثر اور انتہائی مغموم تھے۔

ہم یہاں واقعات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، اختصار کے ساتھ یوں سمجھیے کہ اس وقت سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقتدار لب بام آ چکا تھا، قدیم مسلم معاشرے کی توانائیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ دم توڑ رہا تھا۔ پرانے سیاسی نظام کا قصر رفیع جو کم و بیش دو سو سال سے مغل حکمرانوں کے لیے مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا، انہدام پذیر ہو چکا تھا، ہر شعبہ حیات میں زوال اور ہر گوشہ زندگی میں انحطاط کے اثرات نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ لوگوں کی دینی حالت اور اخلاقی اقدار میں بھی کوئی استحکام نہ رہا تھا۔ ہر طرف طائف الملوکی، ہر جانب ابتری اور ہر سُو بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔

دہلی کے لال قلعے کا وہ جھنڈا جو شاہ جہان اور عالم گیر کے دور حکومت میں کابل سے لے کر راس کماری تک مغل حکومت کی عظمت کا نشان تھا، سرنگوں ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے کتاب و سنت سے انحراف اور دین سے اغماض کی راہیں اختیار کر لی تھیں۔

یہ تھے، نہایت اختصار کے ساتھ وہ حالات جو شاہ صاحب کے دور میں پیدا ہو چکے تھے اور جن سے ان کا کاروان زندگی گزر رہا تھا۔ ان حالات میں انھوں نے وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی شروع کیا اور تصنیف و تالیف کو بھی مرکز عمل قرار دیا۔

کتاب و سنت کی راہ

مصنف کی حیثیت سے ان کا شمار معمورۂ ارض کے جلیل القدر مصنفین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور ان کو کتاب و سنت کی صراط مستقیم پر گام زن ہونے کی تلقین فرمائی، اور یہی ان کے نزدیک فلاح اور کامیابی کی راہ ہے۔ چنانچہ وہ وصیت نامے میں لکھتے ہیں۔

وصیت اول ایں فقیر چنگ زدن است بکتاب و سنت دراعتقاد و عمل، و پیوستہ بہ تدبر

ہر دو مشغول شدن ہر روز حصہ از ہر دو خواندن۔ واگر طاقت خواندن نہ دارد ترجمہ ورقے از ہر دو شنیدن۔ ودر عقاید مذہب خدمات اہل سنت اختیار کردن واز تفصیل آنچہ سلف تفتیش نہ کردہ اند' اعراض نمودن' وبہ تشکیکات معقولیان خام التفات نہ کردن۔ ودر فروع پیروی علماے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ وحدیث کردن ودائما تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن' آنچہ موافق باشند در حیز قبول آوردن الا "کالاے بدبریش خاوند" دادن۔ امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغنا نیست' وسخن متقشفہ فقہا کہ تقلید عالمے را دستاویز ساختہ تتبع سنت را ترک کردہ اند نہ شنیدن ونظر بہ ایشاں التفات نہ کردن' وقربت خدا جستن بہ دوری ایشاں۔

یعنی اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد اور عمل دونوں میں کتاب وسنت (قرآن وحدیث) سے تمسک کیا جائے اور ان کے تدبر میں برابر مشغول رہا جائے اور دونوں کو روزانہ بالالتزام پڑھا جائے۔ اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتا ہو تو کسی دوسرے شخص سے دونوں کے کسی ورق کا ترجمہ ہی سن لیا کرے۔ عقاید میں قدماے اہل سنت کا مسلک اختیار کیا جائے' اسلاف کرام نے جس چیز کی کھود کرید نہیں کی' اس کے پیچھے نہ پڑا جائے' فروع فقہ میں ان علماے محدثین کی پیروی کی جائے جو حدیث وفقہ میں جامعیت رکھتے ہیں۔ فقہی مسائل کو لازماً کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھا جائے' جو بات اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ "کالاے بدبریش خاوند" والا معاملہ کیا جائے (یعنی اسے نظر انداز کر دیا جائے) یہ یاد رہنا چاہیے کہ امت "مجتہدات فقہا" کو کتاب وسنت کی بنیاد پر جانچنے سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ وہ متقشف فقہا جو کسی عالم کی بات کو دستاویز قرار دے کر اس کی تقلید کرتے ہیں اور سنت کی پیروی سے دور ہٹ گئے ہیں' ان کی بات نہ سنی جائے اور نہ انھیں قابل التفات گردانا جائے' بلکہ ان سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی خوش نودی اور اس کا قرب حاصل کیا جائے۔

شاہ صاحب کی عدم تقلید

شاہ صاحب مقلد تھے یا غیر مقلد اور یہ کہ تقلید کے بارے میں ان کا کیا نقطہ فکر تھا؟ اس پر تفصیلی بحث تو آگے آئے گی' یہاں ہم صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شاہ صاحب کسی ایک امام فقہ یا مجتہد کے مقلد نہ تھے۔ وہ اسی بات پر عمل کرتے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ سے ہم آہنگ ہوتی' اس ضمن میں وہ احناف یا شوافع میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

> ونحن ناخذ من الفروع ما اتفق عليه العلماء لاسيما هاتان الفرقتان العظيمتان الحنفية والشافعية وخصوصا فی الطهارة والصلوٰة فان لم يتيسرا لاتفاق واختلفوا' فناخذ بما يشهد له ظاهر الحديث ومعروفه. [1]
>
> (ہم فروعات میں ان مسائل پر عمل کرتے ہیں' جن پر علما کا اتفاق ہو' خصوصیت سے جن پر اہل سنت کی دو بڑی جماعتیں حنفی اور شافعی متفق ہوں۔ طہارت اور نماز سے متعلق مسائل میں ہم خاص طور سے اس کا التزام کرتے ہیں۔ اگر کسی بات پر ان دو بڑی جماعتوں کا اتفاق نہ ہو تو جو مسائل ظواہر حدیث کے موافق ہوں' ان کو مدار عمل ٹھہراتے ہیں۔)

نو اصول:

شاہ صاحب نے مختلف محدثین کے (جن میں عبدالرحمٰن بن مہدی' یحیٰ بن سعید قطان' یزید بن ہارون' اسحاق بن راہویہ' امام احمد بن حنبل' علی مدینی' ابوبکر بن ابوشیبہ وغیرہ مشاہیر و اکابر اہل حدیث شامل ہیں) مسائل و معاملات پر عمل کرنے کے بارے میں کچھ بنیادی اصول بیان فرمائے ہیں' جن کا ذکر انھوں نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے۔ تعداد میں یہ نو اصول بنتے ہیں' جنھیں اہل حدیث مسائل و معاملات میں پیش نگاہ

۱۔ تفہیمات الٰہیہ جلد ۲۔ ص ۲۴۲۔

رکھتے تھے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اگر کوئی حکم قرآن مجید میں صراحت سے مذکور ہو تو اہل حدیث کے نزدیک اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسری طرف ملتفت ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ اگر حکم قرآنی میں تاویل کی گنجائش ہو اور مختلف مفہوم پیدا ہونے کا احتمال ہو تو اس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا فیصلہ ناطق ہوگا اور قرآن کے اسی مفہوم کو صحیح قرار دیا جائے گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔

۳۔ اگر کسی حکم کے بارے میں قرآن خاموش ہے تو سنت پر عمل کیا جائے گا۔ وہ سنت تمام فقہا میں متعارف و معلوم ہو یا کسی خاص شہر' خاص علاقے اور خاندان سے مروی ہو۔ کسی نے اسے معمول بہا قرار دیا ہو یا نہ دیا ہو' ائمہ حدیث کے نزدیک اس سنت کو قابل حجت اور لائق استناد گردانا جائے گا۔

۴۔ کسی مسئلے کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مل جائے تو اس کے مقابلے میں کسی مجتہد اور امام کے قول کو ہرگز اہمیت نہیں دی جائے گی' نہ کوئی اثر لائق التفات ہوگا۔

۵۔ اگر پوری کوشش کے باوجود کسی مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ کرام کے ارشادات اور تابعین کے اقوال کو قابل عمل ٹھہرایا جائے گا اور اس میں کسی شہر' کسی علاقے یا خاندان کی قید یا تخصیص نہیں ہوگی۔

۶۔ اگر کوئی مسئلہ قرآن یا حدیث میں نہ ہو اور جمہور فقہا اس کے متعلق متفق ہوں تو ان کے اتفاق کو عمل کے لیے کافی سمجھا جائے گا۔

۷۔ اگر فقہا کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو تو ان فقہا کا قول قبول کیا جائے گا جو تقوے اور ضبط و حفظ میں زیادہ اچھی شہرت رکھتے ہوں یا وہ قول قابل قبول ہوگا جو زیادہ مشہور ہو۔

۸۔ اگر علم و فضل' ورع و تقویٰ اور ضبط و حفظ میں تمام فقہا ایک سے ہوں اور زیر بحث

مسئلے میں مختلف ائمہ سے متعدد اقوال منقول ہوں تو جس امام کے قول پر مناسب سمجھیں عمل کر لیا جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۹۔ اگر اس میں بھی اطمینان بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن و سنت کے عمومی اقتضا اور ارشادات پر عمل کیا جائے گا اور مسئلہ زیر بحث کے نظائر کو دیکھا جائے گا۔ پھر اس کی روشنی میں حکم کا استخراج کیا جائے گا۔ اس میں اصول فقہ کے مروج و مشہور قواعد پر اعتماد نہیں کیا جائے گا بلکہ اطمینان قلب اور ضمیر کے سکون کو قابل اعتماد گردانا جائے گا۔[1]

اہل حدیث کے یہ وہ اصول ہیں جن کو بیان کرنے سے پہلے شاہ صاحب نے فرمایا:

انا ابینها لک فی کلمات یسیرة[2]

(میں تمھارے لیے یہ اصول آسان اور مختصر پیرایہ اظہار میں بیان کرتا ہوں۔)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب تقلید کے قائل نہیں ہیں اور مسائل میں کتاب و سنت کو ہر حال میں مقدم رکھنے کے حامی ہیں اور اس ضمن میں ان کا رویہ نہایت سخت ہے۔ ان کے نزدیک ائمہ سلف اور مجتہدین فقہ کے قول و عمل کا درجہ کتاب و سنت سے بہت بعد میں آتا ہے۔ وہ شرعی معاملات میں کسی کی آرا و افکار اور تقلید کے جمود و تقید سے ذہنوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

استنباط مسائل کے دو طریقے

شاہ صاحب کے نزدیک اہل سنت دو طبقوں میں منقسم ہیں۔ ایک طبقے کو وہ ''اہل حدیث'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ایک کو ''اہل رائے'' کے نام سے۔۔۔! اہل حدیث کے طریق عمل کو وہ اہل رائے پر ترجیح دیتے اور زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ مصفیٰ (شرح موطا) میں تحریر فرماتے ہیں۔

باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاویٰ بر دو وجہ بودند۔ یکے آں کہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع می کردند و ازاں استنباط می نمودند و ایں طریقہ اصل راہ محدثین

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۹۔ ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۹۔

است۔ ودیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح وتہذیب آں کردہ اند یاد گیرند بے ملاحظہ ماخذ آں ہا۔ پس ہر مسئلہ کہ واردمی شد جواب آن از ہم قواعد طلب می کردند' وایں طریقہ اصل راہ فقہا است' وغالب برسلف طریقہ اولی بود' وبر بعض آخر طریقہ ثانیہ۔ (۱)

(یاد رکھنا چاہیے کہ سلف میں فتاویٰ اور مسائل میں استنباط کے دو طریقے مروج تھے۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ وہ قرآن وحدیث اور آثار صحابہ جمع کرتے تھے اور انھیں بنیاد قرار دے کر پیش آئند مسائل پر غور کرتے تھے۔ یہ محدثین کا طریقہ ہے۔۔۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ائمہ کے منقح ومہذب کیے ہوئے قواعد کلیہ کی روشنی میں' پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کیا جائے اور اصل ماخذ کو لائق اعتنا قرار دینے کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ یہ فقہا کا طریقہ ہے۔ سلف کا بہت بڑا طبقہ پہلے طریقے کا پابند ہے اور ایک طبقہ دوسرے طریق عمل کا۔۔۔!)

اب مندرجہ ذیل سطور میں چند وہ مسائل بیان کیے جاتے ہیں' جن میں اہل حدیث اور احناف کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب ان مسائل کے بارے میں اہل حدیث کی تائید کرتے ہیں اور اس سلسلے میں احادیث پر عمل کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ

ان مسائل کے ضمن میں سب سے پہلے امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ کو لیجیے' یہ اہل حدیث اور احناف کے درمیان مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ اہل حدیث فاتحہ خلف الامام کو ضروری قرار دیتے ہیں' جب کہ حضرات احناف سورہ فاتحہ نہ پڑھنے پر زور دیتے ہیں۔ شاہ صاحب اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

> وان کان ماموما وجب علیه الانصات والاستماع' فان جهر الامام لم یقرأ الاعند اسکاته وان خافت فله الخیر فان قرأ فلیقرأ الفاتحة قرأ ة لا یشوش علی الامام' وهذا اولی الا قوال

ا۔ مصفی ج ا ص ۴۔

عندی، وبه یجمع بین احادیث الباب. (۱)

(مقتدی کو چاہیے کہ امام کے پیچھے خاموشی سے سنے، اگر امام اونچی آواز سے پڑھے تو مقتدی سکتوں میں پڑھے۔ اگر امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی کو اختیار ہے، جس طرح چاہے پڑھے۔ لیکن سورہ فاتحہ اس طرح پڑھے کہ امام کی قرأت میں تشویش اور پریشانی نہ ہو۔۔۔ میرے نزدیک یہ نقطہ نظر اولیٰ ہے اور اس مسئلے کے متعلق جو احادیث مروی ہیں، ان میں توافق وتطابق کی یہ صحیح صورت ہے۔)

رفع یدین

حضرات احناف نماز میں رفع یدین کے قائل نہیں، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ رفع یدین کرنے کی احادیث ''اکثر'' اور ''اثبت'' ہیں۔ اسی طرح وہ وتر کی ایک رکعت کو بھی ''سنت'' قرار دیتے ہیں، جب کہ احناف کے نزدیک وتر کی تین رکعتیں ہیں، ایک نہیں۔ لیکن شاہ صاحب ان مسائل میں جھگڑا پسند نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں:

والحق عندی فی مثل ذالک ان الکل سنة ونظیره الوتر برکعة واحدة او بثلاث. والذی یرفع احب الی ممن لا یرفع، فان احادیث الرفع اکثر واثبت، غیر انه لا ینبغی لانسان فی مثل هذه الصور ان یتیر علی نفسه فتنة عوام بلده. (۲)

(میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا دونوں سنت ہیں۔ یہی معاملہ ایک رکعت یا تین رکعت وتر پڑھنے کا ہے۔ رفع یدین کرنے والا میرے نزدیک نہ کرنے والے سے بہتر ہے، کیوں کہ رفع یدین کی احادیث تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور زیادہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن انسان کو چاہیے کہ اس قسم کے مسائل میں اپنے شہر کے لوگوں کو اپنے خلاف ہنگامہ بپا کرنے کا موقع نہ

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج۲ ص۹۔ ۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ج۲ ص۱۰۔

دے۔)

وتر پڑھنا سنت ہے

فقہائے احناف وتر کو واجب قرار دیتے ہیں اور اہل حدیث اسے سنت ٹھہراتے ہیں۔شاہ صاحب بھی اس ضمن میں اہل حدیث کی تائید کرتے ہیں۔ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

والحق ان الوترسنة هو اوكدالسنن' بينه علی وابن عمرو عبادة بن الصامت رضی الله عنهم (۱)

(صحیح مسئلہ یہ ہے کہ وتر سنت موکدہ ہے۔حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے اور انھوں نے واضح طور سے اسے سنت موکدہ فرمایا ہے)

جمع بین الصلوٰتین

کسی عذر کی بنا پر جمع بین الصلوٰتین (یعنی دو نمازیں جمع کرنے) کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔فقہائے حنفیہ نہ جمع تقدیم کے قائل ہیں' نہ جمع تاخیر کے' لیکن اہل حدیث کی طرح شاہ صاحب جمع تقدیم کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور جمع تاخیر کو بھی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

ومنها الجمع بين الظهر والعصر والمغرب والعشاء. (۲)

(ایک مسئلہ نماز ظہر اور نماز عصر کو اور نماز مغرب اور نماز عشا کو جمع کر کے پڑھنے کا ہے' جو فقہائے احناف اور محدثین کے درمیان باعث اختلاف ہے)

فشرع لهم جمع التقديم والتاخير لكنه لم يواظب عليه ولم يعزم عليه مثل مافعل فی القصر. (۳)

(اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں کی اجازت دی

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۷۔ ۲۔ ایضاً ص ۲۴۔ ۳۔ ایضاً۔

ہے، لیکن نہ اس پر ہیشگی کا حکم دیا اور نہ اس کی اس طرح تاکید فرمائی، جس طرح کہ سفر میں نماز قصر کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔)

دیہات میں جمعہ پڑھنے کا مسئلہ

جمعۃ القریٰ یعنی دیہات میں جمعہ پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ علمائے احناف اور اہل حدیث کے درمیان یہ ایک مشہور اختلافی مسئلہ ہے۔ علمائے احناف دیہات میں جمعے کے قائل نہیں ہیں، جب کہ حدیث کی روشنی میں اہل حدیث کے نزدیک دیہات میں جمعہ پڑھنا ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ بھی دیہات میں جمعے کے وجوب کے قائل ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں۔

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الجمعة واجبة على كل قرية. (۱)

(یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جمعہ ہر گاؤں میں پڑھنا واجب ہے)

اس سے آگے فرماتے ہیں۔

ومن تخلف عنها فهوا لآثم. (۲)

(اور جو شخص جمعہ ترک کردے وہ گناہ گار ہے۔)

دیہات میں فرضیت جمعہ کے مسئلے میں شاہ صاحب اہل حدیث کے موید ہیں۔

تکبیرات عیدین کی تعداد

عیدین کی تکبیرات میں فقہائے حنفیہ اور اہل حدیث کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اہل حدیث کا مسلک اس باب میں وہی ہے جو اہل حرمین (ساکنان مکہ اور باشندگان مدینہ) کا ہے۔ یعنی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیریں کہی جائیں اور دو رکعتیں پڑھنے کے بعد خطبہ دیا جائے۔ شاہ صاحب بھی اسی طریق عمل کو ترجیح

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۰۔ ۲۔ ایضاً۔

دیتے ہیں۔ان کے الفاظ یہ ہیں۔

یکبر فی الاولی سبعا قبل القراءۃ وفی الثانی خمسا قبل القراءۃ و عمل الکوفیین ان یکبر اربعا کتکبیر الجنائز فی الاولی قبل القراءۃ وفی الثانیۃ بعدھا وھما سنتان، وعمل الحرمین ارجح ثم یخطب یامر بتقوی اللہ ویعظ ویذکر. (۱)

(پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے سات تکبیریں اور دوسری میں قراءت سے پہلے پانچ تکبیریں کہی جائیں (یہ عمل اہل حرمین کا ہے) لیکن اہل کوفہ کا عمل یہ ہے کہ تکبیرات جنازہ کی طرح پہلی رکعت میں قراءت سے قبل چار تکبیریں کہی جائیں اور دوسری میں قراءت کے بعد کہی جائیں۔اگرچہ یہ دونوں طریقے مسنون ہیں، لیکن اہل حرمین کا عمل زیادہ راجح اور قابل حجت ہے۔دو رکعتیں پڑھنے کے بعد خطیب خطبہ دے، جس میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین اور وعظ و نصیحت کی جائے۔)

ماءِ کثیر اور قلتین کے بارے میں شاہ صاحب کا مسلک

فقہائے حنفیہ اور فقہائے شافعیہ میں اس مسئلے سے متعلق سخت اختلاف ہے کہ "ماء کثیر" کیا ہے اور پانی کتنی مقدار میں ہو تو نجس ہو جاتا ہے اور کتنی مقدار میں ہو تو نجاست سے آلودہ نہیں ہوتا۔شوافع کا مسلک اس ضمن میں یہ ہے کہ پانی "قلتین" ہو تو نجاست سے محفوظ رہتا ہے اور احناف "عشر فی العشر" (یعنی دہ در دہ) کی مقدار کے پانی کو نجاست کی آلودگی سے مبرا گردانتے ہیں۔علاوہ ازیں اگر کنوئیں میں کتا، بلی، چوہا وغیرہ گر جائے تو احناف کے نزدیک پانی کے ڈولوں کی ایک خاص تعداد مقرر ہے، جن کا کنوئیں سے نکالنا واجب ہے، اگر اس تعداد میں ڈول نہ نکالے جائیں تو پانی نجس ہی رہتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔ان کا فرمان ہے کہ کنوئیں میں جانوروں کے مرنے سے پانی کی نجاست اور

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۳۱۔

طہارت کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی جاتی ہیں' ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ اقدس یا آپ کی حدیث مبارکہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بحث کو فقہا نے خواہ مخواہ طول دیا ہے۔

وقد اطال القوم فی فروع موت الحیوان فی البئر' والعشر فی العشر' والماء الجاری ولیس فی کل ذالک حدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم. البتہ. (۱)

(کنوئیں میں مختلف قسم کے حیوانات (کتا' بلی' چوہا وغیرہ) کے مرنے اور دہ دردہ اور ماء جاری سے متعلق مسائل میں فقہا نے جو طویل بحثیں کی ہیں' ان میں سے کسی مسئلے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قطعاً کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔)

اس سے آگے شاہ صاحب رقم فرماتے ہیں۔

وبالجملة فلیس فی ھٰذا الباب شئی یعتدبه ویجب العمل علیه وحدیث القلتین اثبت من ذالک کله بغیر شبه.(۲)

(بات یہ ہے کہ ان مسائل کے سلسلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے' جسے قابل اعتماد اور واجب العمل گردانا جائے۔ البتہ قلتین والی حدیث بلاشبہ زیادہ صحیح اور ثابت ہے۔)

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب ہر مسئلے میں کتاب و سنت کو پیش نگاہ رکھتے ہیں' خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے ہیں۔ اگر کوئی بات کتاب و سنت میں موجود نہ ہو تو کبار صحابہ و خلفا کے عمل کو دیکھتے ہیں' اس کے بعد ائمہ فقہ میں سے جس امام کے قول کو سنت رسول سے اقرب یا اوفق پاتے ہیں' اس پر عمل کرتے ہیں اور پھر سب کو تاکید فرماتے ہیں کہ اسی کو معمول بہا ٹھہرایا جائے۔ وہ حق کو کسی ایک ہی امام فقہ یا مجتہد کے قول و عمل میں منحصر نہیں سمجھتے۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۸۵۔ ۲۔ ایضاً۔

اصل راہ۔۔۔کتاب وسنت

ان کا انداز بیان' طرز استدلال اور اسلوب تحریر اس ضمن میں بالکل صاف ہے۔اس میں نہ کسی قسم کی الجھن ہے اور نہ کسی نوع کی پیچیدگی۔ان کے نزدیک مسائل پر غور کرنے اور عمل پیرا ہونے کی اصل راہ وہ ہے جس کی نشان دہی کتاب وسنت نے کی ہے' تقلید وتقید کی راہ کو اصل راہ نہیں گردانا جا سکتا۔اس ضمن میں اصحاب فکر اور اہل نظر کے لیے ان کا لہجہ بڑا سخت ہے' جس کا اندازہ تفہیمات الٰہیہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتا ہے۔

خضتم كالخوض فى استحسانات الفقهاء من قبلكم وتفريعاتهم. اماتعرفون ان الحكم حكم الله ورسوله ورب انسان منكم يبلغه حديث من احاديث نبيكم به' ويقول انما عملى على مذهب فلان لا على الحديث ثم اختال بان فهم الحديث والقضاء به من شان الكمل المهرة وان ائمة لم يكونوا ممن يخفى عليهم هذا الحديث فماتركوه الالوجه ظهر لهم فى الدين من نسخ اومر جوحية. (۱)

(تم نے پوری طرح اپنے سے پہلے کے فقہا کے استحسانات اور تفریعات کو مدار عمل اور مرکز توجہ ٹھہرا رکھا ہے' کیا تمھیں معلوم نہیں کہ درحقیقت حکم صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے۔تم میں سے بہت سے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پہنچ جاتی ہے' لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم تو فلاں امام کے مذہب پر عمل کرنے کے پابند ہیں' حدیث پر عمل کے پابند نہیں ہیں۔وہ اپنے ذہن میں یہ خیال جمائے بیٹھے ہیں کہ حدیث کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو حدیث میں پوری مہارت رکھتے ہیں اور اس موضوع سے متعلق مرتبہ کمال پر فائز ہیں۔ائمہ کرام سے کوئی بات مخفی نہ تھی' انھیں اس حدیث کا ضرور علم ہوگا۔انھوں نے اس پر عمل

۱۔ تفہیمات الٰہیہ ج ۱ص ۲۸۳۔

نہیں کیا اور اسے ترک کر دیا ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ یہ حدیث منسوخ ہوگئی ہے یا یہ ہوگی کہ یہ مرجوح ہے۔ اگر ان میں سے کوئی وجہ نہ ہوتی تو وہ ضرور اس پر عمل کرتے۔)

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ان حضرات سے شدید ذہنی اذیت اور فکری کوفت محسوس کرتے ہیں، جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کو ترک کر کے بربنائے تقلید اپنے ائمہ فقہ کے اقوال کے تتبع کا عزم کر رکھا ہے۔

چند الفاظ ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے بارے میں

شاہ صاحب کثیر التصانیف عالم تھے، ان کی ایک تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے متعدد اقتباسات گزشتہ صفحات میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ ان کی نہایت مہتمم بالشان کتاب ہے۔ حضرت نواب صدیق حسن خان اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ و حکم و اسرار آں بیان نمودہ تا آں کہ در فن خود غیر مسبوق الیہ واقع شدہ ومثل آں دریں دوازدہ صد سال ہجرت از ہیچ یکے از علمائے عرب وعجم تصنیفے بہ وجود نیامدہ، ومن جملہ تصانیف مولفش مرضی بودہ است، وفی الواقع بیش از اں است کہ وصفش تواں نوشت۔ (۱)

(یعنی اگرچہ یہ کتاب علم حدیث کے متعلق نہیں ہے، تاہم اس میں بہت سی احادیث کی شرح کر دی گئی ہے اور ان میں جو فلسفہ اور اسرار وحکمت پنہاں ہے، اسے اس نہج سے معرض بیان میں لایا گیا ہے کہ اپنے موضوع میں یہ منفرد حیثیت اختیار کر گئی ہے، اس سے قبل کوئی کتاب اس اسلوب سے نہیں لکھی گئی۔ یہاں تک کہ اسلام کے گزشتہ بارہ سو سال کے عرصے میں علمائے عرب وعجم میں کوئی شخص اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کر سکا۔ اس کے مصنف شہیر کی تصانیف میں یہ عمدہ ترین تصنیف ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب

۱۔ اتحاف النبلاء ص ۱۷

بے بہا معلومات پر مشتمل ہے' لہٰذا اس کی توصیف کے تمام پہلوؤں کو حیطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔)

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ آغاز کتاب میں حضرت مصنف نے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں کتاب تصنیف کرنے کی وجہ بیان کی ہے' نیز طبقات محدثین اور علم حدیث کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔

خدمت حدیث

شاہ صاحب نے اپنے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی بے حد خدمت کی ہے۔ انھوں نے حجاز مقدس میں اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور حدیث کے متعلقہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ تکمیل علم کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے اور اس علم کو خاص طور سے مرکز التفات ٹھہرایا۔

اس کی نشر و اشاعت کے لیے انھوں نے تحریری خدمت بھی انجام دی اور تدریسی بھی۔ تحریری خدمت یہ ہے کہ موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ یہ حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے' اس کے اسلوب سے شاہ صاحب نہایت متاثر تھے۔ ''وصیت نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ طالب علم کو جب عربی زبان میں قدرت حاصل ہو جائے تو اسے موطا امام مالک لازماً پڑھانا چاہیے۔ یہ علم حدیث کی اساس اور اصل ہے۔ اس کے پڑھنے سے طالب علم بے شمار علمی فیوض سے بہرہ اندوز ہو جاتا ہے۔

بعض حیثیتوں سے شاہ صاحب موطا امام مالک کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے موطا کی دو شرحیں سپرد قلم کیں۔ ایک فارسی میں اور دوسری عربی میں۔ فارسی شرح کو ''مصفّٰی'' کے نام سے موسوم کیا اور عربی شرح کا نام ''مسوّٰی'' رکھا۔ ان کے زمانے میں یہ دونوں زبانیں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں' اس لیے انھوں نے ان دونوں زبانوں کے ذریعے اس کتاب کے مضامین و مندرجات سے اہل علم کو متعارف کرایا۔

مسوی اور مصفی کے علاوہ انھوں نے شرح تراجم ابواب صحیح البخاری کے نام سے ایک

کتاب تصنیف کی جس میں بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ عوام میں اشاعت حدیث کے لیے بھی انھوں نے مختصر مگر بعض اہم کتابیں لکھیں، جن میں چہل حدیث، النوادر من الحدیث اور الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم خاص اہمیت کی کتابیں ہیں۔

خدمت قرآن

شاہ صاحب کی بوقلموں خدمات دینیہ میں ایک رفیع المرتبت خدمت، قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ان کے زمانے میں برصغیر کی دفتری زبان فارسی تھی اور مدارس میں زیادہ تر اسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن قرآن مجید کا فارسی زبان میں کوئی ترجمہ متداول نہ تھا۔ اس سے قبل قاضی شہاب الدین دولت آبادی (وفات ۸۴۶) نے سلاطین جون پور کے ابتدائی عہد میں ''بحر مواج'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر سپرد قلم کی تھی، جس میں ہر آیت کی تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ بھی درج تھا، لیکن یہ پورے قرآن کا ترجمہ نہ تھا، قرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ تھا، اس لیے اسے شہرت و قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ شیخ سعدی کی طرف بھی قرآن مجید کا ایک فارسی ترجمہ منسوب کیا جاتا ہے، لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجمہ انہی کا ہے اور پھر یہ ترجمہ اہل علم میں کبھی مروج نہیں ہوا۔

شاہ صاحب برصغیر کے اولیں عالم دین ہیں، جنھوں نے شروع سے آخر تک پورے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس سے قبل قرآن مجید حفظ تو کیا جاتا تھا، اس کی تفسیریں بھی لکھی گئیں، لیکن اس کے الفاظ کے معانی کو سمجھنے کے لیے سرزمین ہند میں فارسی ترجمہ شاہ صاحب نے کیا اور اس ترجمے نے بڑی شہرت پائی۔

اس ترجمے کی مزید تفصیل ان شاء اللہ راقم کی کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں بیان ہو گی۔ شاہ صاحب نے باسٹھ سال کی عمر پا کر ہفتے کے روز ظہر کے وقت محرم کی آخری تاریخ ۱۱۷۶ھ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) کو دہلی میں وفات پائی۔

❀❀❀

نواں باب

اہل حدیث کے فکر و عمل کے مختلف پہلو

جب کسی شخص کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتا ہے تو کسی طرف سے اس پر کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح جب کسی کو مالکی' شافعی یا حنبلی کہہ کر پکارا جاتا ہے تو اسے بھی کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں سمجھا جاتا' صرف یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے کہ یہ حضرات فقہی اعتبار سے ایک خاص نقطہ نظر کے حامل اور ایک خاص مکتب فکر کے پیرو ہیں اور مسائل کے استنباط و استدلال میں دینی لحاظ سے ایک متعین فرقے سے ان کا تعلق ہے۔ لیکن اس کے برعکس دیکھا گیا ہے کہ کسی شخص کے متعلق جب یہ پتا چلا کہ یہ اہل حدیث ہے تو اکثر لوگوں کے قلب و ذہن کی کیفیت بالکل بدل گئی' دماغ میں عصبیت و عناد کی ایک غیر معمولی لہر اٹھنے لگی اور نظر و بصر کے دائروں میں آتش غضب بھڑک اٹھی۔

یہ حالت صرف عوام ہی کی نہیں ہے' بڑے بڑے اصحاب دعوت و ارشاد اور ارباب علم و مسند کو دیکھا گیا ہے کہ ادھر اہل حدیث کا لفظ ان کے کان میں پڑا' ادھر قلم حرکت میں آ گیا' زبان کی رفتار تیز ہو گئی اور الزامات و تنقیدات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ جو منہ میں آیا کہہ ڈالا اور جو دل میں آیا اگل دیا۔ کیا بات غلط ہے اور کیا صحیح ہے' یہ سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس قلم ہے کہ سطح قرطاس پر بے محابا دوڑ رہا ہے اور زبان ہے کہ حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچے بغیر تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔

کبھی اہل حدیث کہلانے والوں کو ظاہریت کی طرف منسوب کیا گیا' کبھی یہ فرمایا گیا کہ یہ لوگ صرف الفاظ و حروف کی سرحدوں میں بند ہیں' ذوق و معنی کی وسعتوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ کبھی ائمہ اربعہ کے نافرمان کہہ کر دل کو تسلی دی گئی' کبھی اولیائے کرام

اور بزرگان دین کے منکر کا طعنہ دے کر جی کی بھڑاس نکالی گئی۔ کبھی نعوذ باللہ گستاخ رسول کا الزام عائد کیا گیا۔

حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ اہل حدیث ائمہ اربعہ کی جلالت قدر کا دل کی گہرائیوں سے اعتراف کرتے ہیں' مختلف مسائل میں ان کی علمی و فقہی کاوشوں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی تحریروں میں جابجا ان کے حوالے دیتے اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کے مقلد نہیں ہیں' پیش آئند مسائل میں آخری فیصلہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مانتے ہیں۔

بزرگان دین اور اولیاے کرام کی پاکیزہ زندگی' ان کے بلند ترین کردار' ان کے طریق تفہیم اور نہج تبلیغ کو بھی اہل حدیث انتہائی لائق تکریم گردانتے اور ان کی دینی خدمات کو بہ درجہ غایت اہمیت دیتے ہیں۔ اپنی تصنیفات میں ان کا تذکرہ کرتے اور اپنے مواعظ میں لوگوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ان کی تقویٰ شعاری' خشیت الٰہی اور جذبہ اطاعت رسول کو اپنی زندگیوں میں جذب کیا جاے۔

بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ائمہ اربعہ اور ائمہ حدیث وفقہ کو نشانہ طعن بناتے اور ان کی مساعی جمیلہ کو ہدف اعتراض ٹھہراتے ہیں۔ محروم القسمت ہے وہ گروہ جو اولیاء اللہ کا احترام نہیں کرتا اور ان کی بے لوث خدمات کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔۔۔ اہل حدیث نے اس قسم کی حرکت نہ کبھی کی ہے اور نہ کر سکتے ہیں۔ یاد رہے حدیث پر عمل کرنے والا کوئی شخص ہرگز کسی بزرگ یا امام کی تنقیص نہیں کر سکتا۔

اہل حدیث پر ایک نہایت بے جان اور گھٹیا الزام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی کا عائد کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مکرم ہی تو ہے جسے اہل حدیث کے نزدیک مرکز محبت اور منبع الفت کی حیثیت حاصل ہے اور جس کی ہر ادا' ہر قول اور ہر عمل کی اطاعت ان کا اولیں فریضہ ہے' جس مقدس ہستی کے کردار و گفتار کے ہر گوشے اور شوشے کی فرماں برداری ان کا لازمہ حیات ہے' اس سے گریز کی راہ تلاش کرنا' آپ کے فرمان کے کسی بھی حصے سے روگرداں ہونا اور اس کے مقابلے میں کسی امام فقہ کے قول و

فعل کا سہارا لینا اہل حدیث کے نقطہ نگاہ سے قطعاً غلط ہے۔ آپؐ کے طریق عمل اور آپؐ کی کسی سنت کو کوئی چھوٹی قرار دے یا بڑی، اہل حدیث اس پر ہر حال میں عمل پیرا ہوں گے۔ یہی ان کی زندگی کا نقطہ ماسکہ اور یہی ان کا مقصد اصلی ہے۔

ایجابی اور وسیع دعوت

ہم دیکھتے ہیں کہ نہ حنفی کو شافعی سے کوئی خفگی ہے اور نہ حنبلی یا مالکی کو حنفی پر طیش آتا ہے، لیکن اہل حدیث کے خلاف تنفر کی ایک مسموم فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ اہل حدیث کوئی محدود مسائل رکھنے والا فرقہ نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل دعوت ہے اور ایک ایجابی اور وسیع الاثرات پیغام ہے۔ اپنے انداز و نہج کا ایک منفرد سلسلہ ہے۔ یہ فرقہ نہیں، اصل ہے۔ یہ کسی مذہب کی شاخ نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ ہے۔ اسے فقہی اصطلاح میں ایک مکتب فکر سے تعبیر نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ دین کا ایک ہمہ گیر اور جامع تصور ہے۔ عقاید میں اس کے خاص تصورات ہیں اور اعمال میں اس کا وہ اسلوب ہے جو دور نبوت سے طے شدہ ہے۔ مختلف مسائل کو حیطۂ فکر اور فہم کی گرفت میں لانے اور ان کے استنباط و استدلال میں اس کی اپنی شرائط ہیں، جنھیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کیوں کہ وہ شرائط کتاب و سنت اور ارشادات سلف کے ہم آہنگ ہیں۔

اگر اہل حدیث صرف ایک ایسے گروہ کا نام ہوتا جس کے دائرۂ عمل میں چند فقہی مسائل ہی داخل ہوتے، تو ان کے خلاف خفگی و برہمی کا سلسلہ ہرگز دراز نہ ہوتا، لیکن یہاں تو معاملہ بالکل الٹ ہے۔ اہل حدیث چوں کہ خالص اور کامل اسلام کے داعی اور ترجمان ہیں، جس میں اللہ کی توحید اور اطاعت رسول کے تمام پہلو شامل ہیں اور ان میں اکثر پہلو وہ ہیں جو بہت سے لوگوں کے مفادات و رجحانات سے لگا نہیں کھاتے، لہٰذا ان کی مخالفت کو ضروری قرار دے دیا گیا اور ان کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا گیا۔

ایک مثال

ایک خاص دعوت اور ایک خاص مذہب کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اس مسئلے پر غور کیجیے کہ دنیا میں بہت سے مذاہب موجود ہیں جو اپنا الگ الگ ایک فلسفہ رکھتے ہیں۔ ان مذاہب میں یہودیت بھی ہے' عیسائیت بھی ہے' مجوسیت بھی ہے اور بدھ مت بھی ہے۔ ان مذاہب کے بارے میں تمام مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کر لیجیے' وہ کھلے دل سے بتائیں گے کہ یہودیت میں کون کون سے اوصاف و کمالات جمع ہیں۔ وہ اس بات کا تذکرہ نہایت فراخ حوصلگی سے کریں گے کہ مجوسیت کون سے لائق تعریف امور کا دل کش مجموعہ ہے' وہ بدھ مت کے متعلق انتہائی ادب و احترام سے اظہار خیال کریں گے اور اس میں جو فلسفہ و حکمت پنہاں ہے' اس کی حقانیت کے سامنے بلا تامل ان کی گردنیں جھک جائیں گی' اس سے آگے بڑھ کر جب وہ عیسائیت پر پہنچیں گے تو اس کی چوکھٹ پر تو یہ بہ درجہ غایت نیاز مندی کے ساتھ اپنا سر رکھ دیں گے اور اس وقت تک انھیں اطمینان قلب نصیب نہیں ہوگا جب تک کہ حضرت مسیح کو الوہیت کے مرتبے تک نہ پہنچا دیں اور ان کی تعلیمات کو حیات دنیوی کی آخری معراج اور اخروی زندگی کے لیے نجات کا بنیادی ذریعہ نہ قرار دے لیں' اور ان کے افکار و تصورات کو کامیابیوں کا مرکز اصلی نہ ٹھہرا لیں' لیکن جیسے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و فتوحات کی سرحدوں کا آغاز ہوا' اور آپ کی کامرانیوں کے بوقلموں اور وسعت پذیر میدانوں پر نگاہ پڑی' جبین قلم شکن آلود ہوگئی' ذہن پر تعصب کی تہیں جم گئیں اور چہرے پر بغض و عناد کی سیاہیاں پھیل گئیں۔

تمام مستشرقین کا یہی حال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر نگاہ پڑتے ہی ان کی تحریر کے تیور بدل جاتے ہیں اور ان کا طرز نگارش یک دم غضب ناک ہو جاتا ہے۔

اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ بدھ اور حضرت مسیح کے ساتھ ان کے دل میں عقیدت و احترام کے

بے پناہ جذبات کیوں موجزن ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض وعناد اور تنگ دلی کا مظاہرہ کس وجہ سے ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ بدھ اور حضرت مسیح نے اگرچہ بعض حکیمانہ خدمات سرانجام دی ہیں اور ان کے اقوال و اعمال فلسفیانہ نصائح پر مبنی ہیں' لیکن ان کی کوششوں سے قدیم معاشرے میں تبدیلی کے آثار نہیں پیدا ہوئے' نظم ونسق کے اجتماعی دائروں میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا' اور ان کی زندگی میں عملی اعتبار سے دنیا کسی انقلاب سے روشناس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو اپنانے کی تبلیغ کی ہے' اس میں صرف یہی نہیں کہ فلسفہ وحکمت کا ایک دل آویز گلستاں سجا ہوا ہے' بلکہ بہت جلد اس میں عملی انقلاب پیدا ہوا' ایک ایسا عظیم معاشرہ عالم وجود میں آیا' جس کی اس سے قبل سطح ارض پر کوئی مثال نہیں ملتی' عالم انسانیت کو آنحضرت ﷺ نے نئی قدریں عطا کیں' اصلاح احوال کی جدید راہوں کا تعین کیا اور صاف ستھری تعلیمات کا ایک درخشاں باب لوگوں کے سامنے کھل گیا' جس سے نہایت مختصر مدت میں معاملات کہیں سے کہیں پہنچ گئے' ہر سو خیر وصالحیت کی فضا پیدا ہوگئی اور فتوحات اسلامی کے دائرے دور تک پھیل گئے۔

واقعات کی رو سے اگر صورت حال یہی ہے اور یقیناً یہی ہے تو اہل حدیث یہ دعویٰ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ ان کی دعوت وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی اور جسے آپؐ کے صحابہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا عزم کیا اور اس میں وہ کامیاب رہے' رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اب بتائیے کہ ان کے ساتھ لوگ وہی سلوک کیوں روا نہ رکھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روا رکھا گیا۔ جب یہ توحید کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کریں گے اور اربابا من دون اللہ کی تفصیلات معرض بیان میں لائیں گے تو ان پر کیوں تنقید نہیں کی جائے گی؟ جب یہ فقط کتاب اللہ اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ وابستہ رہنے کا اعلان کریں گے تو اس حلقے سے تعلق رکھنے والے کیوں انھیں دلی انس کا مستحق گردانیں گے' جو ہر حال میں تقلید وجمود پر قائم رہنے کا تہیہ کر چکے ہیں؟ اسی طرح جب یہ جرأت

مندانہ لہجے میں بدعات ومحدثات کونشانہ تردید بنائیں گے اور مسلمانوں پر اس قباحت سے محفوظ رہنے کے لیے زور دیں گے تو وہ طبقہ ان سے کیوں کر اتفاق کر سکے گا، جس کی تحریروں اور تقریروں کا دارومدار ہی بدعات ورسوم پر ہے۔

گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ اہل حدیث چوں کہ متعین نہج حیات کا نام ہے اور اصل دین اور اساس اسلام سے تعبیر ہے، اعمال وعقاید میں ان کا تعلق براہ راست اسوۂ پیغمبر سے ہے، کتاب وسنت سے تمسک ان کا بنیادی زاویہ فکر ہے، بدعات ورسوم سے دامن کشاں رہنا ان کا محور حیات ہے، اس لیے بعض حلقوں کا ان کی مخالفت پر اتر آنا قدرتی امر ہے۔ اہل حدیث کو اس مخالفت پر نہ کبیدہ خاطر ہونا چاہیے اور نہ اس پر تعجب کا اظہار کرنا چاہیے۔ مثبت انداز میں اپنا سلسلہ تبلیغ جاری رکھنا چاہیے۔ کسی سے الجھنے اور بحث ونزاع میں اپنی طاقت خرچ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

فکر وعمل کے تین پہلو

اہل حدیث کے سامنے فکر وعمل کے تین پہلو ہیں اور یہی ان کے اصلاحی کارنامے ہیں، جن کی طرف انھوں نے ہمیشہ توجہ مبذول کیے رکھی۔

ایک الٰہیات کا پہلو ہے، جس میں انھوں نے بدعات کلامیہ کو ہدف بحث ٹھہرایا اور اعتزال وحشویت کی گم راہیوں کی نہ صرف نشاں دہی کی بلکہ اس کی سختی کے ساتھ تردید کی۔ سلف کے عقاید کو وضاحت سے بیان کیا اور اسلام کی سادہ اور پرکشش تعلیم سے لوگوں کو روشناس کرایا اور اس پر کار بندر ہنے پر زور دیا۔

دوسرے پہلو کا تعلق فقہیات سے ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ تقلید وتقید سے کنارہ کش ہوکر کتاب وسنت کو اپنا مطمح نظر قرار دیں اور اطاعت واتباع کا اصل سرچشمہ فقط فرامین الٰہی اور ارشادات پیغمبر کو ٹھہرائیں۔

تیسرا پہلو بدعات ورسوم سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے اور غیر اسلامی امور سے دامن بچا کر زندگی بسر کرنے کا ہے۔

یہ نہایت صاف اور سیدھی باتیں ہیں جن کی اہل حدیث تبلیغ کرتے اور جن پر عمل کی

دیواریں استوار کرنے کی عام مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں۔ اگر ان باتوں کو مدار عمل ٹھہرا لیا جائے تو اسلامی سلسلے سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات درست رخ اختیار کر لیتے ہیں اور فکر وعقیدے کی صحت و اصلاح کا اہم مسئلہ بالکل آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ قرآن نے مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ تم میں ایک جماعت بہرحال ان اوصاف کی حامل ہونی چاہیے جو مسلمانوں کی تصحیح فکر کے لیے ہر وقت کوشاں رہے' اور واقعہ یہ ہے کہ اہل حدیث کی یہی حیثیت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آل عمران:۱۰۴)

(اور تم میں ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور برائی کے ارتکاب سے روکے۔ یہی لوگ کامیابی سے ہم کنار ہونے والے ہیں)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت کو یہ مژدہ سنایا ہے۔

لاتزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق. [1]

(میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ برسر حق رہے گا)

قرآن کی اس آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو جہاں ایک دعوت کی حیثیت حاصل ہے' وہاں یہ ایک بنیادی ذریعہ ہدایت اور باعث رشد و خیر بھی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ فکر و عمل کی دنیا میں جب بھی کوئی بگاڑ پیدا ہوتا اور برائی سر اٹھاتی ہے' اللہ کا کرم اپنا رنگ دکھاتا اور رحمت الٰہی جوش میں آ جاتی ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی جماعت کو ظہور میں لاتا ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی اور دنیا میں حق و صداقت کا علم لہراتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار ابتلاؤں اور قسم قسم کی برائیوں کے باوجود اسلام زندہ ہے اور اس کے ہر حکم میں وہی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو چودہ سو سال قبل اس کا طرۂ امتیاز تھی۔

وہ جماعت خالص کتاب و سنت کی داعی بن کر میدان عمل میں اتر تی اور صاف

۱۔ صحیح مسلم' کتاب الامارة باب لاتزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق

ستھرے اسلام کی تبلیغ کرتی ہے' جس میں نہ بدعات و رسوم کا دخل ہوتا ہے اور نہ اس میں تقلید و جمود کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے۔

مختلف ادوار میں مختلف نام:

مختلف ادوار میں اس جماعت کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق ان کے فکر و عمل کی سمتیں بھی بدلتی رہی ہیں اور ان کے کارناموں میں بھی تغیر رونما ہوتا رہا ہے۔

کبھی ان کو محدثین کے نام سے پکارا گیا کہ انھوں نے حدیث و سنت کی جمع و تدوین کو اپنا فرض منصبی قرار دے لیا تھا اور اس اہم خدمت کی انجام دہی کے لیے یہ حضرات دور دراز کی مسافتیں طے کرنے لگے تھے۔ جہاں کسی چھوٹے بڑے ارشاد پیغمبر سے فیض یاب ہونے کی بھنک کان میں پڑی' وہاں جا پہنچے اور اس وقت تک چین نہیں لیا' جب تک اس ارشاد کو تحریر و کتابت میں نہیں لے آئے۔ اس کے حصول کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی اور بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا اور طویل عرصے تک جاری رہا۔

معتزلہ' جہمیہ' حشویہ اور شیعہ وغیرہ کے مقابلے میں انھیں اہل سنت کا جامع لقب عطا کیا گیا' اس کا مقصد یہ ہے کہ ان مذاہب اور ان کے افکار و تصورات سے انھیں امتیاز حاصل ہو جائے' اور یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں مسئلے اور فلاں معاملے میں اہل سنت کا شعار یہ ہے' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث اور شروح احادیث کی کتابوں میں تابعین اور محدثین کسی سلسلے میں اپنے مسلک اور نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ھذا من اھل السنۃ۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ اس کے بالمقابل کسی مسئلے کی تعبیر ان حضرات کی ہے' جن کا تعلق اہل سنت سے نہیں ہے۔

اہل حدیث کو سلف کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ عقیدہ و عمل میں یہ صرف صحابہ کرام' تابعین و تبع تابعین اور محدثین کے نقطہ نظر کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

انھیں اثری بھی کہا گیا ہے کہ یہ انہی آثار وفرامین پر عمل کناں ہیں جو حدیث وسنت سے ثابت اور اسلاف سے منقول ہیں۔

اس وضاحت سے مقصد اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ اہل حدیث عقاید واعمال کی تمام جزئیات اور اس کے تمام گوشوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی اتباع کا دم بھرتے اور صحابہ وتابعین کے زاویۂ فکر کو مبنی برصحت ٹھہراتے ہیں۔ ہر دور میں ان کا یہی اسلوب رہا اور یہ اسی اسلوب پر کاربند رہے۔

سلف کی رائے کو ترجیح دینے کی بنیادی وجہ

اسلاف کرام کے بارے میں یہ بات کامل یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ حضرات تاویل بالرائے کے قائل نہیں تھے اور مذہب کے متعلق اپنی خواہشات ونظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کتاب وسنت کا سہارا ہرگز نہیں لیتے تھے۔ دین ہی ان کا اوڑھنا بچھونا اور سرمایۂ حیات تھا۔ ان کی اقلیم ذہن اور مملکت فکر پر دین ہی کی حکمرانی تھی اور اسی کی رہنمائی میں وہ اپنا سفر حیات طے کرتے تھے۔ اسی کو نجات اخروی کا ذریعہ قرار دیتے تھے' اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہونا انھیں گوارا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صفات وعقاید اور اعمال واقوال میں سلف کے نقطۂ نظر کو صحیح مانتے اور اس ضمن میں ان کی بیان کردہ تشریحات کو ترجیح دیتے ہیں۔

سلف کے نقطۂ نظر کو ترجیح دینے کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ اس سے علم وعمل کی تاریخ میں ایک طرح کا تسلسل قائم رہتا ہے اور اس حقیقت کی نشان دہی ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر صحابہ کرام' تابعین عظام اور ائمہ ہدیٰ تک اہل حدیث کے افکار و تصورات کی صورت حال کیا رہی ہے۔ ان کے عقاید کس قالب میں ڈھلے ہیں' صفات میں کیا کیفیت رہی ہے' امت کن کن فکری اور عملی منزلوں سے گزری ہے اور اس راہ میں اگر کوئی مشکل مرحلہ پیش آیا ہے تو اس سے کس انداز میں نمٹا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں تاریخی تسلسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ دور ماضی میں حالات نے جو کروٹیں بدلیں' وہ کس نوعیت کی تھیں اور ہمارے اسلاف کا ان کے متعلق کیا زاویۂ فکر رہا اور اس سے کیا نتائج اخذ کیے۔

نبی ﷺ کی تعلیمات نے ابتدائی دور ہی میں ایک بہت بڑا معاشرہ پیدا کر دیا تھا اور وہ معاشرہ صحابہ کرام پر مشتمل تھا' جن کے رگ و پے میں دینی احکام رچے ہوئے تھے اور وہ ہر حال میں ان پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ یہی ہمارے اسلاف تھے اور یہ وہ نفوس قدسیہ تھے جن کے قلوب واذہان میں قرآن وحدیث نے پہلی دفعہ اپنا نشیمن بنایا' جن کی موجودگی میں شمع نبوت فروزاں ہوئی اور اس کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیلی' جنھوں نے اپنی آنکھوں سے جمال نبوی کا نظارہ کیا' جن کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا اور انھوں نے خود لسان نبوت سے قرآن کی سماعت کا شرف حاصل کیا اور اس کے مطالب کو سمجھا۔ جنھوں نے براہ راست ارشادات پیغمبر کو سنا اور جو آپ کے روح پرور اور دل نواز مواعظ سننے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ جن کی صبحیں اور شامیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر واحکام کی صدائیں سننے اور ان پر عمل کرنے کی فضاؤں میں بسر ہوئیں۔ جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور سالہا سال آپ کی صحبت و رفاقت میں رہے اور آپ کی خوش نودی کے حصول کے لیے سب کچھ راہ خدا میں لٹا دیا اور زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ کی مجلس پُرنور میں گزارنے کی سعی کی۔ پیش آئند مسائل میں اہل حدیث اسی واجب الاحترام گروہ کی تعبیرات وتشریحات کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

سلف کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے

سلف کا اطلاق سب سے پہلے یقیناً اسی گروہ پر ہوگا' جن کے دل پر آفتاب رسالت کی اولین کرنیں پڑیں اور جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نشینی اور رفاقت کا شرف حاصل کیا' اور یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں' جنھیں صحابہ رسول کے پر افتخار لقب سے پکارا جاتا ہے۔ ان کے بعد اس سعادت کے مستحق تابعین ہوں گے جو عقیدہ وعمل میں انہی راہوں پر چلے جن کی تعلیم انھوں نے اپنے اساتذہ (صحابہ کرام) سے حاصل کی تھی۔ یہ وہ عالی مرتبت لوگ تھے جنھوں نے کتاب وسنت کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور اسی کے سائے میں تزکیۂ نفس کی روح پرور منزلیں طے کی تھیں۔ تابعین کے بعد ان کے شاگردوں یعنی تبع تابعین کا زمانہ آیا۔

یہ سب وہ حضرات تھے جنھوں نے دین کو پھیلایا' اسلامی تعلیمات کو عام کیا اور جس دور اور جس مقام میں جس انداز میں خدمت دین کی ضرورت تھی' اسی انداز میں خدمت سرانجام دی۔ امام مالک نے مسجد نبوی میں اشاعت حدیث کی مسند بچھائی اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور پھر ان سے حاصل کردہ تعلیم کو مختلف علاقوں اور ملکوں میں مروج اور عام کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئے۔

امام احمد بن حنبل نے خلق قرآن کے مسئلے پر معتزلہ کی بہت بڑی جماعت کا مقابلہ کیا اور مسلسل تین عباسی خلفا سے نبرد آزما ہوئے۔ ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے مگر وہ اپنے موقف پر قائم رہے' جو ہر اعتبار سے صحیح موقف تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے' اللہ کی مخلوق نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں بعض لوگوں کو ممکن ہے' بہ ظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہو' مگر اس زمانے میں یہ بہت بڑا مسئلہ تھا اور اب بھی بہت بڑا مسئلہ ہے' اس کے لیے امام احمد کو بڑی ابتلاؤں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا' اور وہ ہر ابتلا اور ہر آزمائش میں کامیاب رہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں' جنھیں قرآن "عزم الامور" سے تعبیر کرتا ہے اور انھیں پوری ہمت اور طاقت سے سرانجام دینے والوں کو "اولوا العزم" قرار دیتا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ قید خانے میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جسم پر کوڑے پڑ رہے ہیں' اس حالت میں ان کے پاس بہت سے لوگ آئے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جان بچانے کے لیے کسی حد تک اپنے موقف میں لچک پیدا کر لیں۔ لیکن ان کا سب کے لیے ایک ہی جواب تھا۔

اعطونی شیئا من کتاب اللہ او من سنۃ رسول اللہ حتی اقول بہ.

(مجھے اللہ کی کتاب یا رسول اللہ کی سنت سے کچھ دکھاؤ تو میں اقرار کر لوں گا اور تمھاری بات مان لوں گا)

امام احمد کے عزم راسخ اور جذبۂ اتباع سنت نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ ان سے محبت کرنے والے کو بھی پابند سنت کہا جانے لگا اور اس عہد کے بڑے بڑے ائمہ کرام برملا

کہا کرتے تھے۔

اذا رایت الرجل یحب احمد بن حنبل فاعلم انه صاحب سنة.

(اگر کسی شخص کو دیکھو کہ وہ امام احمد بن حنبل سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو جان لو کہ وہ صاحب سنت ہے)

یہ بھی ایک معیار قرار دیا گیا تھا کہ مسلمان کو زندیق سے پرکھا جائے تو امام احمد کے نام سے پرکھا جائے۔ یعنی اگر وہ امام احمد کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرتا ہے تو مسلمان ہے اور اگر ان کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔

امام احمد کو جن عباسی خلفا کے دور میں مبتلائے اذیت کیا گیا' وہ تھے مامون الرشید' معتصم باللہ اور واثق باللہ۔! مامون الرشید اور معتصم باللہ نے ان کو شدید جسمانی آفات و مصائب میں مبتلا کیا۔ واثق باللہ نے انھیں جسمانی اذیتیں تو نہیں پہنچائیں' البتہ اس ذہنی اذیت سے دوچار کیا کہ ان کے نام شاہی فرمان جاری کر دیا کہ وہ خاموشی سے گھر میں بیٹھے رہیں' کسی سے کوئی میل جول نہ رکھیں۔ یعنی انھیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور زبان پر پابندی لگا دی گئی۔

اب چوتھے خلیفہ متوکل علی اللہ کا دور آیا' اس نے یہ تمام پابندیاں ختم کر دیں۔ لیکن اب ان کے نفس کے لیے آزمائش کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ یعنی ان کے قدموں میں مال و دولت کے ڈھیر لگا دیے گئے تھے اور تمام شاہی مراعات کے دروازے ان پر کھول دیے گئے تھے۔ یہ بھی انتہائی اذیت کا مرحلہ تھا' اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں بھی انھیں ثابت قدم رکھا اور انھوں نے خلیفہ وقت اور حکمرانوں کی شدید خواہش کے باوجود نہ مال و دولت کو ہاتھ لگایا اور نہ سرکاری مراعات قبول کیں۔

امام احمد کے علاوہ امام شافعی کو لیجیے جن کا طریق استنباط اور نہج استدلال حدیث پیغمبر کے عین ہم آہنگ تھا اور پہلے پہل حجت واستنباط حدیث کی طرح انہی نے ڈالی۔ ان کی فقہ ارشادات نبوت سے ماخوذ اور اعمال صحابہ کا حصہ ہے۔

پھر امام سفیان ثوری' سعید بن مسیّب' محمد بن سیرین' عبداللہ بن مبارک' امام زہری'

حسن بصری، عبدالرزاق بن ہمام، عمرو بن دینار، عبدالرحمٰن اوزاعی، اسحاق بن راہویہ، سفیان بن عیینہ، امام ابوحنیفہ، وکیع بن الجراح، یحییٰ بن سعید القطان۔ ان سے آگے امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، امام ابوداؤد وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے۔ یہ وہ حضرات ائمہ ہدیٰ ہیں جو اپنے اپنے انداز میں مختلف علاقوں میں جمع حدیث اور ترویج سنت میں اور مسائل فقہ کے استنباط میں مشغول ہیں اور بے شمار حضرات ان سے مصروف استفادہ ہیں۔

اس قافلے کے سالار اعظم رسول اللہ ﷺ تھے

آسمان علم وہدایت کے یہ وہ چند تابندہ ستارے ہیں، جن میں سے بعض کا شمار تابعین کی پرشکوہ جماعت میں ہوتا ہے، بعض کا جامعین حدیث کے مقدس گروہ میں اور بعض کا کتب حدیث کے مرتبین ومولفین کے طائفہ باکمال میں، اور یہی وہ اصحاب فضل ہیں، جنھیں سلف کہا جاتا ہے۔ اہل حدیث کا تعلق اسی کاروان رشد وہدایت سے ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس قافلہ خیر وصلاح کے سالار اعظم ہیں۔

اس قافلے کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اسوۂ حسنہ نے ترتیب دیا تھا۔ اس لیے اہل حدیث کے تصور سلفیت کی عمر بہت طویل ہے اور اتنی ہی طویل ہے جتنی کہ خود اسلام کی عمر ہے۔ سلف کی اس پاکیزہ خصال جماعت کی تصنیفی وتعلیمی سرگرمیوں کا دائرہ بے انتہا وسیع ہے۔ انھیں زہد وورع کی فراوانیاں بھی خوب میسر آئی ہیں اور ان کے ایثار وعمل کی حدود بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے ہر دور میں خلفا وملوک کی چیرہ دستیوں کا بہ درجہ غایت ہمت وجرات کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انھوں نے اللہ کی توحید کو پھیلایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی ترویج کو اپنا منصب اصلی قرار دیا اور اس سلسلے میں بے حد تکلیفیں جھیلیں۔ ان کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام امور بلا کسی صلہ وانعام کے سرانجام دیے اور خلعت ودربار سے ہمیشہ دور رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ضوافشاں دور سے لے کر اب تک حالات میں بے شمار تغیرات رونما ہوئے، عالم اسلام میں انقلاب وتحول کی لاتعداد لہریں اٹھیں اور لوگ بہت

سے عجیب وغریب واقعات سے دوچار ہوئے۔ لیکن یہ کاروان خیر وصلاح ہر دور اور ہر حالت میں راہ حق پر گامزن رہا۔ انھوں نے نہ کبھی کسی سے صلہ وانعام کی توقع رکھی' نہ سرکار دربار سے ربط وتعلق پیدا کیا اور نہ کبھی خلعت واکرام کے لیے کسی آستانہ فرماں روائی کا رخ کیا۔ جو کچھ کیا خالصتاً لوجہ اللہ کیا اور ان کا مقصد محض حصول رضائے خداوندی رہا۔

کلامی بحثوں سے دامن کشاں رہنے کی تاکید

یہ ہے اہل حدیث کے نزدیک سلفیت کا مفہوم اور یہ ہیں وہ نفوس قدسیہ جن پر سلف کے پرعظمت لقب کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ وہ عالی قدر حضرات ہیں' جن کی متعین خدمات ہیں اور انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام اپنی اصلی روح اور صحیح خدوخال کے ساتھ دنیا میں موجود ہے۔ تمام مذاہب تحریف کی زد میں آ گئے اور ہر دین کی بنیادی تعلیمات منقلب ہو گئیں' لیکن سلف کی اس مقدس جماعت کی ہمہ گیر مساعی اور بوقلموں خدمات کی بنا پر اسلامی احکام میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ هُوَالْفَوْزُ الْعَظِيمُ. (یونس: ۶۴)

(اللہ کے فرمان اٹل ہیں' کبھی بدلنے والے نہیں اور یہی سب سے بڑی فیروز مندی ہے جو کسی مسلمان کے حصے میں آ سکتی ہے۔)

اس کے سوا بہت سے گروہوں نے اللہ کے احکام سے روگردانی کی اور انھیں بدل ڈالا۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَالَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ. (البقرہ: ۵۹)

(جن لوگوں نے ظلم وشرارت کی راہ کو اپنایا' انھوں نے اللہ کی بتلائی ہوئی بات کسی دوسری بات سے بدل ڈالی۔)

سلف نے وہی راہ اپنائے رکھی اور اسی پر قائم رہے' جس کا اللہ اور رسول نے قرآن و حدیث میں حکم دیا تھا اور یہی اصل اور حقیقی راہ ہے۔ کتاب وسنت کے یہ فدائی ہمیشہ اسی راہ پر گام فرسا رہے۔ اللہ کی صفات اور احکام کے بارے میں انھوں نے نہ کبھی قیل وقال کو پسند کیا اور نہ کلامی اور بدعی طرز فکر سے کوئی سروکار رکھا۔ ہر دور میں اس سے مجتنب رہے

اور اسے لائق مذمت گردانا۔ اس ضمن میں امام شافعی کا مشہور قول ہے۔

مارایت احدا ارتدیٰ بالکلام فافلح.

(میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا، جس نے علم کلام سے شغف رکھا ہو اور پھر وہ دینی اعتبار سے کامیاب رہا ہو۔)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے قرآن کے بارے میں اور مسئلہ تقدیر کے متعلق سوال کیا۔ حضرت امام نے اس کا طرز کلام سن کر فرمایا۔

لعلک من اصحاب عمرو بن عبید، لعن اللہ عمروا فانه ابتدع هذه البدعة من الکلام، ولوکان الکلام علما نافعا لتکلم به الصحابة والتابعون رضی اللہ عنهم کما تکلموافی الاحکام والشرائع و لکنه باطل یدل علی باطل.

(تمھارا تعلق شاید عمرو بن عبید سے ہے، اللہ عمرو پر لعنت کرے، سب سے پہلے کلامی بدعتوں کی طرح اسی نے ڈالی ہے۔ اگر یہ کوئی فائدہ مند علم ہوتا تو صحابہ اور تابعین کرام اسی اسلوب میں اس کے متعلق وضاحت سے گفتگو کرتے، جس طرح کہ انھوں نے احکام و شرائع کے مختلف گوشوں کے متعلق کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ علم ہی باطل ہے اور باطل پر دلالت کرتا ہے)

اسی طرح کی باتیں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے کلامی بحثوں میں الجھنے کی سخت مذمت کی ہے اور اس موضوع پر گفتگو کرنے سے لوگوں کو روکا ہے، اس لیے کہ وہ اس کی مضرتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور اس کی وجہ سے انھیں شدید تریں آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ امرائے وقت اور خلفائے عہد ان کے سامنے کتاب و سنت کی اہانت کرتے اور بدعات کو صحیح قرار دیتے تھے۔ امام کے لیے ان کی اس قسم کی باتیں سننا اور برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔۔۔ وہ اعلان فرماتے ہیں۔

علیکم بالسنة والحدیث وما ینفعکم وایاکم والخوض فانه

لایفلح من احب الکلام.

(قرآن وحدیث سے وابستہ رہو اور وہ چیزیں سیکھو جو تمھارے لیے فائدہ مند ہوں۔ بحث ومناظرے سے دامن بچائے رکھو' جو شخص کلامی مباحث میں پڑا' وہ فلاح وکامرانی سے محروم رہا۔)

علامہ جوینی رحمۃ اللہ علیہ علم کلام کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اپنے عزیزوں اور عیادت کے لیے آنے والوں سے کہا۔

استشھدوا علی انی قد رجعت عن کل مقالۃ قلتھا اخالف فیھا السلف الصالح' وانی اموت علی مایموت علیہ عجائز نیسابور.

(تم لوگ اس پر گواہ رہو کہ میں نے ہر اس بات سے رجوع کرلیا ہے جو سلف صالح کے خلاف کہی گئی تھی۔ میں اس سادہ عقیدے پر مر رہا ہوں' جس پر نیساپور کی بڑی بوڑھی عورتیں مرتی تھیں۔)

کلامی مباحث سے اجتناب کی دو وجہیں

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ محدثین اور سلف کلامی مباحث سے کیوں دامن کشاں رہے اور کیوں لوگوں کو اس سے مجتنب رہنے کی تاکید کی؟

اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اس نوع کی بحثوں میں وہ لوگ حصہ لیتے تھے جن کی دینی عصبیت کم زور ہو چکی تھی اور وہ اسلامی احکام پر غور وفکر کے لیے زیادہ تر اعتماد عقل پر کرتے تھے اور ان کی عقلیت پسندی کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اس کے مقابلے میں کتاب وسنت کے بعض اہم مسائل بھی ان کی نظروں میں جچتے نہ تھے۔ اسلام کے متعین اور واضح عقائد واعمال سے وہ بالکل روگرداں ہو گئے تھے اور ان پر کھلے بندوں تنقید کرنے لگے تھے۔ ان کی تنقید آرائی کی وسعتیں یہاں تک ممتد ہو گئی تھیں کہ صحابہ کو بھی وہ نشانہ طعن بناتے اور ان پر کئی قسم کے الزامات دھرتے تھے۔ ان کے اپنے عمل وعقیدے کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہو چکی تھیں اور دوسروں کو بھی وہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم کرنے کا عزم کر چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سلف کے نقطہ نظر کی رو سے اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات کا مسئلہ سراسر دینی ہے۔ اس ضمن میں اسی بات کو قطعی اور حتمی قرار دیا جائے گا جو کتاب اللہ اور آثار پیغمبر وصحابہ میں موجود ہے۔ یہاں عقل وخرد کے دروازوں پر دستک دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اس موضوع سے متعلق صحیح علم وہی ہے جو اللہ کے فرامین اور ارشادات رسول اللہ سے ماخوذ اور صحابہ کے آثار واعمال پر مشتمل ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی صحیح بات ارشاد فرمائی ہے کہ دوسرے علوم ومعاملات میں عقل کی روشنی مفید مطلب ہو سکتی ہے لیکن صفات الٰہی کے سلسلے میں کام نہیں دے سکتی۔

فالرای لیل والحدیث نہار.

(یعنی رائے رات کی طرح تاریک اور حدیث وسنت دن کی مانند روشن ہے)

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات کا مسئلہ عقلی نہیں، خالص دینی ہے اور اسے دینی نقطہ نظر ہی سے مرکز فکر ٹھہرایا جائے گا۔ یہاں عقل کی رسائی کا کوئی امکان نہیں۔

موجودہ دور میں بھی لوگ اس پر عقلی نقطہ نگاہ سے گفتگو کرتے اور اسے موضوع بحث ٹھہراتے ہیں۔ مگر بجز مباحثہ ومجادلہ کے کوئی بات کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ وہیں پہنچ کر بات ختم ہو جاتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اسلام عقل کا حریف یا مخالف نہیں ہے، بلکہ وہ بار بار انسان کو عقل وشعور اور فہم وتدبر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وجود باری اور صفات الٰہی کے معاملے میں عقل کام نہیں دیتی، اسے انسانی فہم کی گرفت میں لانا ممکن نہیں۔ عقل کی سرحدیں اس میدان میں قدم رکھتے ہی سکڑ جاتی ہیں اور شعور کے دائرے یہاں تک پہنچتے ہی مٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ صحیح ہوگا جس کے ماننے پر محدثین وسلف زور دیتے ہیں۔ مسلک سلف کو ترک کر کے عقل آرائی یہاں کئی قسم کے فتنوں کو جنم دے گی اور ذہنوں میں وسوسے پیدا کرے گی۔ لہٰذا مسلک محدثین پر عمل پیرا ہونا نہایت ضروری ہے اور یہی طریق صواب ہے۔

اہل حدیث کے بارے میں ایک بہت بڑا مغالطہ

کچھ مدت سے اہل حدیث کے بارے میں یہ مغالطہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ یہ کوئی مکتب فکر نہیں ہے بلکہ حفاظ حدیث کی جماعت اور اس فن کے ماہرین کو اہل حدیث کہا جاتا ہے۔

یہ نقطہ نظر بالکل غلط ہے۔ بقول حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے اس مغالطے کو پھیلانے اور عام کرنے کے ''دو ہی سبب ہیں۔ قلت مطالعہ اور تعصب''[۱]

مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

''اہل حدیث وہ جماعت ہے جو اپنے افکار میں شخصی پابندیوں سے آزاد ہے۔''[۲]

یعنی محض فن حدیث کے حفاظ کا نام اہل حدیث نہیں۔ ان کے فہم واستدلال کے کچھ اصول ہیں، جن کا تعلق ائمہ کی تقلید سے نہیں بلکہ براہ راست کتاب وسنت سے ہے۔ اس ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ نے جو کچھ حجۃ اللہ البالغہ اور بعض دیگر تصانیف میں تحریر فرمایا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ:

- اہل حدیث کا اطلاق صرف فن حدیث کے ماہرین پر نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک متعین مکتب فکر ہے، جس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ہے۔
- یہ لوگ قیاس جلی اور نظائر کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں اور اجتہاد واستنباط کے قائل ہیں۔
- یہ اہل ظاہر سے الگ ہیں۔
- یہ کتاب وسنت کو بنیادی اہمیت دیتے اور صحابہ وسلف کے ارشادات سے استدلال کرتے ہیں اور اسے اپنے فہم واستدلال کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

۱۔ تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۸۷۔ ۲۔ ایضاً ص ۸۸

دسواں باب

فقہی مذاہب کی تاریخ اور ان کے عالم وجود میں آنے کے اسباب

اسلام کے دور آغاز میں اسلام کا دائرہ فقط حدود عرب تک محدود تھا اور عربوں کی معاشرت سادہ تھی۔ ان کی ضروریات کا دامن سمٹا ہوا تھا اور مسائل و وسائل کے دائرے محدود تھے۔ لہٰذا تقاضائے مصلحت یہی تھا کہ لوگوں کو ضروریات زندگی کی حد تک اصولی اور بنیادی امور سے مطلع کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان اساسی اور بنیادی اصولوں میں اتنی لچک اور وسعت بہر حال ملحوظ رکھی جائے کہ عندالنوازل اور بہ وقت ضرورت ان سے مسائل کا استنباط کیا جاسکے۔ زیادہ واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ اسلام کے عہد ابتدا میں ماخذ مسائل شرعیہ صرف دو تھے۔ اور وہ تھے (۱) کتاب اللہ اور (۲) سنت رسول اللہ۔

سوال سے صحابہ کا اجتناب

کوئی مسئلہ پوچھنے سے صحابہ کرام بہت اجتناب کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد نبوت تئیس سال پر مشتمل ہے۔ تیرہ سال آپؐ مکہ مکرمہ میں پیغمبر کی حیثیت سے تشریف فرما رہے' جسے مکی زندگی کہا جاتا ہے اور دس برس کا زمانہ مدینہ منورہ میں گزرا جو مدنی زندگی سے عبارت ہے۔ تئیس سال کے اس طویل عرصے میں جو مکے اور مدینے میں بسر ہوا' صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف چند ہی مسائل پوچھے' جن کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے' حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد آخر میں صحابہ کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار سے متجاوز ہو چکی تھی اور وہ عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلے

ہوئے تھے۔ لیکن وہ عمل کے عادی تھے' سوال کرنے اور بلاضرورت مسائل پوچھنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کے مطلب کی باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی بیان فرما دیا کرتے تھے یا قرآن مجید کے ذریعے انھیں بتادی جاتی تھیں۔

علم الفقہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد جب خلفاے راشدین کا زمانہ آیا تو عرب کے باہر اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کی حدود تیزی کے ساتھ پھیلنے لگیں۔ صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں اس نے اس درجہ وسعت اختیار کی کہ عراق' ایران' مصر اور شام وغیرہ کے متمدن اور زرخیز علاقے مسلمانوں کے زیرنگیں آ گئے۔ پھر جلد ہی اندلس' افریقہ' ترکستان' ہندوستان اور سندھ وغیرہ کے دور دراز مقامات پر ان کی فتح و نصرت کے علم لہرانے لگے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو نئے مسائل' نئے تمدن' نئے معاشرے' نئی تہذیب' نئی ثقافت اور نئی معاشرتوں سے واسطہ پڑا۔ آمدنی وخرچ کے نئے ذرائع سامنے آئے' نیا سلسلہ زراعت دیکھنے میں آیا' نئی اقتصادیات سے متعارف ہونے کا موقع ملا اور مختلف معاملات کی نئی سے نئی شکلیں ظہور پذیر ہوئیں۔ ان سے بہ طریق احسن عہدہ برآ ہونے کے لیے نظر و بصر میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور فکر وفہم کے زاویوں میں شدت سے احساس تبدیلی رونما ہوا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تابعین کے عہد آخر میں ائمہ عظام نے کتاب وسنت کو پیش نگاہ رکھ کر' اس کے مقرر کردہ حدود وقوانین کے مطابق ایک ایسا ضابطہ زندگی مرتب کرنے کی طرح ڈالی جو اس دور کے تقاضوں کو اچھی طرح پورا کر سکے۔ اس طرح وقت وضرورت کے مصالح ایک نئے علم کی تدوین کا باعث بنے' جسے بعد میں ''علم الفقہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اس وقت روم' عراق اور مصر بے حد ترقی یافتہ ملک تھے۔ مصر کی حالت تو یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے دو ہزار سال قبل وہاں کی عورتیں چھری کانٹے سے کھاتی تھیں' چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف کو اپنے دام محبت میں پھنسانا چاہا اور وہاں کے

اونچے گھرانوں کی خواتین کو اس کا پتا چلا تو انھوں نے اس کی اس حرکت کو نہایت معیوب گردانا اور اسے مطعون کیا۔ اس پر اس نے ان خواتین کو اپنے گھر کھانے پر بلایا اور کھانے کے لیے اس دور کی تہذیب اور طریقے کے مطابق انھیں چھریاں پیش کیں۔ قرآن اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ، فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ، فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّامَلَكٌ كَرِيْمٌ. (یوسف: ۳۰،۳۱)

(اور پھر جب اس معاملے کا چرچا پھیلا تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں کہ دیکھو عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی ہے کہ اسے رجھالے، وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی ہے۔ جب عزیز کی بیوی نے ان کی مکاری کی یہ باتیں سنیں تو انھیں بلوا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے مطابق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی (کہ کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو) یوسف سے کہا: ان سب کے سامنے نکل آؤ (جب یوسف نکل آئے اور) ان عورتوں نے اسے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور (بے اختیار) پکار اٹھیں، سبحان اللہ! یہ تو انسان نہیں ہے، ضرور ایک فرشتہ ہے۔ بڑے مرتبے والا فرشتہ۔)

قرآن مجید کی اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانے کی مصری معاشرت اس درجہ شائستہ تھی کہ ضیافت کی مجلسیں خاص طور پر آراستہ کی جاتی تھیں، نشست کے لیے مسندیں لگائی جاتی تھیں۔ کھانے کے لیے ہر شخص کے سامنے چھری رکھی جاتی تھی۔ مصر کے آثار قدیمہ اور یونانی مورخوں کے بیان کردہ واقعات سے پتا چلتا ہے کہ

وہاں کا معاشرہ بڑا متمدن اور مہذب تھا۔ آثار قدیمہ میں امرا کی مجلسوں کا جو مرقع دکھایا گیا ہے' اس سے قرآن کے ان الفاظ کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے' بلکہ اس مرقعے کو ان الفاظ کی عملی تفسیر سے تعبیر کرنا چاہیے۔

فقہ اسلامی کے ماخذ

فقہ اسلامی کے استدلال و استنباط کی تین بنیادیں ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) کتاب اللہ۔ (۲) سنت رسول اللہ۔ (۳) رائے و قیاس صحیح۔

فقہ اسلامی کے ان مآخذ ثلاثہ کی مختصر الفاظ میں وضاحت کی جائے تو بات یوں بنتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر آپؐ کے انتقال تک قرآن مجید کی آیات و سور کا نزول بہ تدریج ہوتا رہا۔ آغاز اسلام میں اولیں ضرورت توحید کی تبلیغ اور تردید شرک کی تھی' اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے عقیدہ و فکر کی اصلاح' تذکیر و موعظت اور ان کے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور جلا بخشنے کا سلسلہ تھا۔ اس لیے سب سے پہلے عقاید' تذکیر اور اخلاق سے متعلق آیات نازل ہوئیں۔ پھر دوسرا مرحلہ احکام و اوامر کا تھا' لہٰذا اس کے بعد آیات احکام کا نزول ہوا۔ آیات احکام مستقل طور پر بھی نازل ہوئیں اور ان واقعات کے جواب میں بھی اتاری گئیں جو وقتاً فوقتاً اس زمانے میں مسلمانوں کو پیش آتے رہے۔

قرآن کے احکام و اوامر پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی عمل کرتے اور صحابہ کو بھی ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم صادر فرماتے۔ پھر ضرورت کے مطابق ان کی وضاحت بھی فرماتے اور پیش آئند مسائل کے متعلق لوگوں کے سوالات کا جواب بھی دیتے۔ اللہ کی طرف سے جو احکام نازل کیے جاتے تھے' ان میں چوں کہ قلت تکلیف اور عدم حرج خاص طور سے ملحوظ تھا' اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی تبیین و توضیح میں اس کا خیال رکھتے۔

اقسام احکام

قرآن مجید اسلامی احکام کا اولیں ماخذ ہے اور یہ وہ صحیفہ نور ہے جو بہت سے مضامین کا بہ درجہ غایت روح پرور مجموعہ ہے۔ اس میں امم سابقہ کا ذکر بھی ہے' واقعات و قصص بھی

خاص اسلوب سے بیان کیے گئے ہیں اور پند وموعظت کا بھی نہایت دل نشین سلسلہ موجود ہے۔ علاوہ ازیں آیات احکام ہیں، جن کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے، اور یہ احکام دو اقسام میں منقسم ہیں۔

۱۔ وہ احکام جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے، نماز، روزہ، حج اور دوسری عبادات۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ، عشر، صدقات، خیرات اور جہاد وغیرہ۔

۲۔ حقوق العباد کے بارے میں احکام تین اقسام پر محیط ہیں۔

اول: وہ جو استقلال خاندان اور روابط معاشرہ سے متعلق ہیں مثلاً نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ۔

ثانی: وہ جو باہمی معاملات کی وضاحت کرتے ہیں، جیسے بیع وشرا، تجارت، اجارہ اور ہبہ وغیرہ۔

ثالث: وہ جو تعزیر اور انتظام مدن کے ضمن میں معرض بیان میں آئے ہیں۔ مثلاً قصاص، حدود، سیاسی معاہدات، جزیہ اور مفاد عامہ سے متعلق امور۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن مجید کے بعد احکام اسلامی کا دوسرا ماخذ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے۔ آپ کی اطاعت فرض اور آپؐ کے طریقے اور عمل کی اتباع قرآن میں ضروری قرار دی گئی ہے۔ دین کے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال و ارشادات کو ماننا ہر حال میں لازم ٹھہرایا گیا ہے اور اسے وحی کی حیثیت دی گئی ہے۔ صحابہ بلا حیل و حجت نبی ﷺ کے اعمال و فرامین پر عمل کرتے تھے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، ادھر اس کی بجا آوری ہوئی۔

عہد نبوت میں احکام کے بارے میں فرض، واجب، مستحب، مباح، حرام اور مکروہ وغیرہ اصطلاحات مروج نہیں تھیں۔ صحابہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتے یا جس طرح آپؐ کو عمل کرتے دیکھتے، اسی طرح خود بھی عمل کرتے۔ مثلاً آپؐ کو وضو کرتے دیکھا تو اسی طرح وضو کر لیا۔ یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ

افعال وضو میں کون سے افعال فرض ہیں' کون سے مسنون ہیں اور کون سے مستحب۔

صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل بھی بہت کم پوچھتے تھے۔ وہی مسائل پوچھتے تھے جو ان کے نزدیک انتہائی ضروری ہوتے یا کسی سلسلے میں کسی بات کی وضاحت وصراحت کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ اس قسم کے مسائل مسئولہ کی تعداد بہت کم ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کی خود ہی ہدایت فرما دیتے تھے' جن کی عام لوگوں کے لیے ضرورت محسوس فرماتے۔

صحابہ اور تابعین کی اجتہادی آرا

امور اسلامی کا تیسرا ماخذ کتاب وسنت کی روشنی میں رائے وقیاس صحیح ہے۔ اس کا ثبوت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اس واقعے سے ملتا ہے' جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے کچھ عرصہ پیشتر ۱۰ ہجری میں ان کو یمن کا قاضی مقرر کر کے بھیجا۔ اس موقعے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو کچھ فرمایا اور انھوں نے آپؐ سے جو کچھ عرض کیا' اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما اراد ان يبعث معاذا الى اليمن قال كيف تقضى اذا عرض لك قضاء؟ قال اقضى بكتاب الله. قال فان لم تجد فى كتاب الله؟ قال فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم . قال فان لم تجد فى سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا فى كتاب الله؟ قال اجتهد رائى ولاآلو. فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره وقال الحمدلله الذى وفق رسول رسول الله لما يرضى رسول الله. [1]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجنا چاہا تو فرمایا: کوئی فیصلہ طلب معاملہ تمھارے سامنے پیش کیا جائے تو کس طرح

۱۔ سنن ابوداؤد' کتاب الاقضیۃ۔ باب اجتہاد الرائی فی القضاء۔ نیز ملاحظہ ہو جامع ترمذی' کتاب الاحکام' باب ماجاء فی القاضی کیف تقضی۔

فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔
فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا: اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور کتاب اللہ دونوں میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟ بولے: پھر اپنی رائے سے کام لوں گا اور صحیح رائے قائم کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (از راہ مسرت) ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے رسول کے پیغام بر کو اس بات کی توفیق عطا فرمائی کہ جس سے اللہ کے رسول کی رضامندی وابستہ ہے۔)

اسی طرح امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عامل حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا۔

الفهم الفهم' فيما يختلج في صدرك مالم يبلغك في الكتاب والسنة. اعرف الامثال والا شباه' ثم قس الامور عند ذالك' فاعمد الى احبها عندالله واشبهها بالحق فيماترى. [1]

(فہم و ادراک سے کام لو ان مسائل کے متعلق جو کتاب و سنت میں نہ ہونے کی وجہ سے تیرے دل میں خلجان پیدا کریں۔ مسائل میں امثال و اشباہ کو پہچانو اور پھر ان پر قیاس کرو اور ان کی روشنی میں ان کے بارے میں ایسی رائے قائم کرو جو تمھیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے قریب تر نظر آئے۔)

اجتہاد

اجتہاد کا شریعت اسلامی میں ایک خاص درجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و

۱۔ سنن دار قطنی مع التعلیق المغنی (مولانا شمس الحق عظیم آبادی) مطبع فاروقی دہلی جلد ۲ ص ۵۲۱۔ نیز الفاظ کے کچھ تغیر کے ساتھ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین جلد اول ص ۷۲ طبع مصر۔

سنت سے حکم شرعی مستنبط کرنے میں چند قیود و شرائط کے ساتھ پوری پوری کوشش کی جائے۔۔۔۔اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ کتاب وسنت کی منصوص عبارت سے استخراج مسائل کیا جائے۔دوسری صورت یہ ہے کہ کتاب وسنت کے منصوص مسائل سے بذریعہ قیاس استخراج مسائل کیا جائے۔

عصر صحابہ میں استنباط وتخریج کا سلسلہ فقط انہی مسائل تک محدود تھا جو خارج میں پیدا ہوتے اور ظہور میں آتے تھے' امکانی تفریعات کو موضوع بحث نہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو صحابہ اسے ہدف غور وفکر قرار دیتے۔ پہلے اسے قرآن مجید میں تلاش کرنے کی سعی کی جاتی۔قرآن مجید سے اس کا سراغ نہ ملتا تو احادیث رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جاتا۔قرآن اور حدیث دونوں اس کے تذکرے سے خالی ہوتے تو مجلس صحابہ میں اس مسئلے کی نوعیت پر غور کیا جاتا اور کتاب وسنت کی روشنی میں کسی امر پر صحابہ متفق ہو جاتے تو اس اتفاق اور اجماع کو حجت شرعی سے تعبیر کیا جاتا اور یہ امر معمول بہ قرار پاتا۔

اجماع نہ ہونے کی صورت میں اہل افتا صحابہ اپنے اپنے اجتہاد اور رائے سے استنباط مسئلہ کرتے۔اختلاف کی صورت میں کسی ایک صحابی کی تخریج پر عمل کر لینے کو بھی کافی سمجھا جاتا۔ بالعموم لوگ اپنے اپنے شہر اور علاقے کے اہل افتا صحابہ اور ان کے تلامذہ یعنی تابعین کی پیروی کرتے۔اس طرح عہد صحابہ ہی میں استخراج مسائل کے چار اصول متعین ہو گئے تھے اور وہ تھے۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(۳) قیاس۔۔۔۔اور

(۴) اجماع۔

استنباط مسائل میں اختلاف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد عہد صحابہ میں فتوحات کا سلسلہ وسعت پذیر ہوا اور اس کے دائرۂ عمل نے پھیلاؤ اختیار کیا تو مسلمانوں کا

بہت سے ایسے امور سے سابقہ پڑا جن میں اجتہاد و استنباط کی شدید ضرورت تھی۔ بعض اس قسم کے معاملات بھی سامنے آئے جن کا عہد نبوی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے مواقع پر اہل علم کو استنباط، حمل النظیر علی النظیر اور قیاس وغیرہ سے کام لینا پڑا۔ ان معاملات میں سے نجران، سواد کے محاصل، شام اور الجزیرہ کا بندوبست، صحابہ کے وظائف، پانی اور زمین سے متعلق مسائل، قوانین جنگ وغیرہ بہت سے معاملات شامل ہیں، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔

فہم مسائل اور ان کی تعبیر و تشریح میں متعدد مقامات پر اہل علم کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے اور ایسا ہونا ضروری تھا۔

اصحاب فتویٰ صحابہ اور تابعین

دینی نوعیت کے پیش آئندہ واقعات و مسائل کے بارے میں کسی ماہر شریعت کے دینی فیصلے کو "فتویٰ" کہا جاتا ہے اور فتویٰ جاری کرنے والے ماہر شرع اور عالم دین کو مفتی اور مجتہد کے پر اعزاز لقب سے پکارا جاتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اصل فیصلہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا جاری فرمودہ ہو۔ اسی بنا پر اس شخص کے فیصلے کو مستند اور قابل تسلیم گردانا جاتا ہے، جس کے فیصلے کی اساس کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرار پاتی ہو۔ عہد نبوت میں اس قسم کے فیصلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نافذ فرماتے تھے۔ آپ کی حیات طیبہ میں صحابہ کرام کی ایک جماعت بھی اس خدمت کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اس مقدس جماعت میں سے بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلے کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور بعض کو فیصلے کے اصول سمجھائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین اور دیگر اصحاب فتویٰ صحابہ نے یہ عظیم خدمت انجام دینا شروع کی۔ جن مجتہدین صحابہ کے فتوے محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں، ان کی تعداد ایک سو انچاس ہے۔ ان عالی مرتبت لوگوں میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔۔۔ فتاوے کی نوعیت کے اعتبار سے ایک سو انچاس کی اس تعداد کو تین

حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ایک حصے کو مکثرین' دوسرے کو متوسطین اور تیسرے کو مقلین قرار دیا جاتا ہے۔

مکثرین صحابہ

مکثرین سے وہ اہل فتویٰ صحابہ مراد ہیں' جن میں سے ہر صحابی سے منقول و مروی فتاوے کا ضخیم مجموعہ اور کثیر مواد موجود ہے۔ وہ صحابہ سات ہیں' جن کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق' امیر المومنین حضرت علی' ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ 'عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمر' زید بن ثابت رضی اللہ عنہم۔

یہ ساتوں حضرات صحابہ قرآن و حدیث اور فہم مسائل میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

متوسطین صحابہ

متوسطین سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی وہ جماعت مراد ہے' جن میں سے ہر صحابی سے فتاوے کا کچھ حصہ مروی اور منقول ہے۔ یہ بیس صحابہ کرام ہیں' جن میں سے چند صحابہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عثمان بن عفان' ام المومنین حضرت ام سلمہ' انس' ابوہریرہ' معاذ بن جبل' ابوموسیٰ اشعری' عبدالرحمٰن بن عوف' زبیر بن العوام' طلحہ' عبادہ بن صامت' ابوسعید خدری' سلمان فارسی' معاویہ بن ابوسفیان اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم۔

مقلین صحابہ

ان صحابہ کو مقلین کہا جاتا ہے' جن سے فتوے بہت کم تعداد میں منقول ہیں۔ بعض سے تو صرف ایک یا دو فتوے منقول ہیں۔ ان سب کے فتاوے جمع کیے جائیں تو بالکل چھوٹے سے مجموعے پر محتوی ہوں گے۔ مقلین صحابہ کی تعداد ایک سو بائیس ہے۔ مندرجہ ذیل صحابہ مقلین کے زمرے میں شامل ہیں۔

ابوالدرداء' ابوذر غفاری' ابوایوب انصاری' ابوعبیدہ بن جراح' ابی بن کعب' جعفر بن

ابوطالب' حسن بن علی' حسین بن علی' ام المومنین حفصہ' ام المومنین حضرت صفیہ' ام المومنین ام حبیبہ' نعمان بن بشیر' ابومسعود' براء بن عازب' حذیفہ بن یمان' عمار بن یاسر' سعد بن معاذ' خالد بن ولید' عقیل بن ابوطالب' فاطمۃ الزہراء' عبدالرحمٰن بن ابوبکر' سعد بن عبادہ' عدی بن حاتم' عوف بن مالک' عبداللہ بن سلام' ام شریک' حبیب بن سلمہ' مقداد بن اسود' سہل بن سعد الساعدی' عبداللہ بن رواحہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ (۱)

مراکز فقہ وفتویٰ

عہد خلافت راشدہ میں اور اس کے بعد اسلامی فتوحات کے دائرے بڑھے اور آبادیوں کا سلسلہ پھیلا تو ضروریات کے پیش نظر حدود اسلامی میں مختلف مراکز فقہ اور مراکز افتا قائم ہوئے' جن میں اہم اور لائق تذکرہ سات مراکز تھے۔ وہ تھے مدینہ منورہ' مکہ معظمہ' کوفہ' بصرہ' شام' مصر اور یمن۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں فقہ وافتا کے ان مراکز سبعہ کا مختصر الفاظ میں تعارف کرادیا جائے۔

ا۔ مدینہ منورہ

زمانہ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لے کر خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت (۳۵ ہجری) تک مدینہ منورہ کو بلاد اسلامیہ کے عظیم مرکز دینی کی حیثیت حاصل رہی۔ خلفائے ثلاثہ۔۔۔ حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم۔۔۔ کے علاوہ صحابہ کرام میں سے حضرت علی' حضرت عائشہ صدیقہ' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ کے اکابر اصحاب فتویٰ حضرات تھے۔ (۲)

۱۔ مکثرین' متوسطین اور مقلین صحابہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے اعلام الموقعین جلد اول ص ۹ تا ۱۱۔

۲۔ والدین والفقه والعلم انتشر فی الارض من اصحاب ﷺ ابن مسعود و اصحاب زید بن ثابت و اصحاب عبدالله بن عمرو اصحاب عبدالله بن عباس. (اعلام الموقعین جلد اول' صفحہ ۱۶) یعنی دنیا میں دین' فقہ اور علم عبداللہ بن مسعود' زید بن ثابت' عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے شاگردوں کی وساطت سے پھیلا۔
ان حضرات کے تلامذہ میں سے ہر بزرگ اپنی جگہ علمی وفقہی اعتبار سے نہایت عظمت ورفعت کے مالک تھے۔

ان کے علاوہ طبقہ تابعین میں مدینہ منورہ کے مشہور اصحاب حدیث وفتویٰ حضرات میں سے عروہ بن زبیر' سعید بن مسیب مخزومی' ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام مخزومی' علی بن زین العابدین' عبداللہ بن عتبہ بن مسعود' سالم بن عمر' قاسم بن محمد بن ابوبکر' سلیمان بن یسار' محمد بن مسلم بن شہاب زہری' نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر' امام باقر محمد بن علی' جعفر صادق' یحییٰ بن سعید انصاری اور ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ حضرات تابعین تھے جو حدیث وفقہ میں بہت بڑے مرتبے کے حامل تھے اور علم وفضل اور تدین وتقویٰ کے اعتبار سے مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں جن کا کوئی حریف نہ تھا۔ انھوں نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا تھا اور پھر آگے خود ان کے شاگردوں کی فہرست بھی بہت وسیع تھی۔

۲۔ مکہ مکرمہ

حدیث وافتا کا دوسرا بڑا مرکز اس وقت مکہ مکرمہ تھا۔ یہی وہ شہر ہے جہاں آفتاب اسلام طلوع ہوا اور یہی وہ بلدۂ طیبہ ہے' جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور جو پہلی دفعہ دین اسلام کی درخشندہ کرنوں سے آشنا ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد کچھ عرصے کے لیے مدینہ منورہ سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کے مفتی اور معلم مقرر کر کے بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی زندگی کا آخری دور وہیں بسر کیا۔ اہل مکہ ان کے علم وفضل کی فراوانیوں سے بے حد مستفیض ہوئے۔ صحابہ کا اولین مرکز یہی شہر تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ پہلے پہل اسی شہر کے لوگوں کے پردہ سماع سے ٹکرائی تھیں' نزول قرآن کا آغاز اسی مقدس وادی میں ہوا تھا۔

تابعین میں سے مجاہد بن جبیر' عکرمہ مولیٰ حضرت عبداللہ بن عباس' عطا بن ابی رباح اور عبدالعزیز بن محمد بن مسلم زنجی رحمہم اللہ وہاں کے مشہور اہل الحدیث اور اصحاب فتویٰ حضرات تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے تابعین وہاں فروکش تھے' جن کی خدمت میں

حصول فیض کے لیے لوگ بے حد ذوق وشوق کے ساتھ حاضری دیتے تھے۔

۳۔ کوفہ

کوفے اور بصرے کی حیثیت ابتدا میں فوجی چھاونیوں کی تھی۔ یہ دونوں شہر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں آباد کیے تھے اور صحابہ کرام کی اچھی خاصی جماعت ان شہروں میں سکونت پذیر ہوگئی تھی۔ پہلے پہل کوفے میں حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو معلم و مفتی اور وہاں کا وزیر مقرر کر کے بھیجا تھا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں اقامت گزیں رہے اور اس شہر کے قرب و جوار کے باشندوں نے ان سے استفادہ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی وہاں رہے۔

کوفہ ۳۵ سے ۴۰ ہجری تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دارالخلافہ رہا۔ حضرت علی سے بھی باشندگان کوفہ نے استفاضہ کیا۔ ان حضرات کے شاگردوں (تابعین) اور پھر ان کے شاگردوں (تبع تابعین) کی وجہ سے وہاں دینی مسائل کی اشاعت ہوئی۔

کوفے کے مجتہد و مفتی اور اصحاب حدیث اچھی خاصی تعداد پر مشتمل تھے جو حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور دیگر متعدد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیض یافتہ اور ارشد تلامذہ تھے۔۔۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) علقمہ بن قیس نخعی: انھوں نے فقیہ عراق کے طور پر شہرت پائی۔

(۲) مسروق بن اجدع: یہ وہاں کے مفتی اور عالم و معلم تھے۔

(۳) عبیدہ بن عمرو سلمانی: انھیں معلم عراق کہا جاتا تھا۔

(۴) عامر شعبی: یہ کوفے کے فقیہ اور مفتی تھے۔

(۵) حماد بن ابوسلیمان: ان کا شمار وہاں کے اساتذۂ حدیث و فقہ میں ہوتا تھا۔

(۶) عبدالرحمٰن بن ابولیلیٰ۔

(۷) سعید بن جبیر۔

(۸) عمرو بن شرحبیل۔

(۹) ابراہیم بن یزید نخعی۔

(۱۰) شریح بن حارث کندی: یہ کوفے کے قاضی تھے۔ قاضی کی حیثیت سے انھیں بے حد شہرت حاصل ہوئی۔

(۱۱) اسود بن یزید نخعی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات تھے جنھوں نے اپنے دور میں کوفہ اور اس کے نواح میں دینی علوم پھیلانے کے لیے تگ و تاز کی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

۴۔ بصرہ

بصرے سے تعلق رکھنے والے اصحاب فتویٰ اور ارباب مسند صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اس شہر اور علاقے میں علم حدیث کی شمع روشن کرنے اور روشن رکھنے میں بڑی محنت اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ ان کے بعد جن تابعین نے وہاں خدمات سرانجام دیں اور تدریس حدیث کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے رکھا، ان میں ابوالعالیہ رفیع بن مہران، ابوالشعثا جابر بن یزید، حسن بن ابوالحسن بصری، محمد بن سیرین اور قتادہ بن دعامہ سدوسی کے نام رجال کی کتابوں میں ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے شاگردوں نے بھی اس باب میں بہت کام کیا، رحمۃ اللہ علیہم۔

۵۔ شام

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کچھ مدت کے لیے حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوالدرداء اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم کو معلم اور مفتی کا منصب عطا کر کے شام کے علاقے میں بھیجا تھا۔ ان حضرات نے وہاں کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دینے کا اہتمام کیا۔

ان صحابہ کرام کے بعد تابعین عظام میں سے وہاں مشہور اصحاب افتا اور اہل حدیث مندرجہ ذیل حضرات ہوئے۔

عبدالرحمٰن بن غنم' ابوادریس خولانی' عمر بن عبدالعزیز' قبیصہ بن ذویب' رجاء بن حیوٰۃ اور مکحول بن مسلمہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔۔۔ یہ وہ تابعین کرام ہیں جنھوں نے حضرت معاذ' حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت معاویہ بن ابوسفیان' حضرت انس بن مالک اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے علم حدیث وفتویٰ حاصل کیا۔

۶۔ مصر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصر فتح کیا۔۔۔ یہ انتہائی ترقی یافتہ ملک تھا اور وہاں کے لوگ بے حد امیر اور زیور علم سے آراستہ تھے۔ عقل وفہم میں بھی ان کا مقام بڑا بلند تھا' تہذیب وشائستگی کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ ان کے حصے میں آئی تھی۔ وہاں کا منصب افتا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا تھا۔ ان کے بعد وہاں کے تابعین میں جن حضرات نے خصوصیت کے ساتھ شہرت پائی اور ان دیار میں علم حدیث عام کیا' ان میں ابوالخیر مرشد بن عبداللہ اور یزید بن حبیب رحمہم اللہ کے اسماے گرامی شامل ہیں۔ یہ دونوں بزرگ علاقہ مصر کے مفتی اور محدث تھے۔

۷۔ یمن

حدیث وفقہ اور افتا کے مشہور مراکز میں ساتواں مرکز یمن تھا۔ اس مرکز کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہاں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عرصے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عامل وقاضی اور معلم مقرر کر کے بھیجا۔ پھر آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو اس خدمت پر مامور کر کے یمن روانہ فرمایا۔ ان حضرات نے وہاں کے لوگوں کو حدیث کی تعلیم سے متمتع کیا اور انھیں مسائل دینی سکھائے۔

وہاں کے تابعین میں سے طاؤس بن کیسان' وہب بن منبہ اور یحییٰ بن ابو کثیر نے بڑی شہرت پائی۔ رحمۃ اللہ علیہم

یہی وہ حضرات ہیں' جن کی وجہ سے یمن اور اس کے گرد و نواح میں علم حدیث پھیلا اور لوگوں میں دینی مسائل کی سمجھ پیدا ہوئی۔

فقہ و فتویٰ کے دو اہم مراکز۔۔۔حجازی اور عراقی

حدیث اور فقہ و فتویٰ کے یہ سات مراکز جن کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک ہی میں معرض وجود میں آ گئے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ عالم اسلامی میں فقہ و افتا کے دو اہم مرکز قائم ہوئے۔ ایک کوفہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سعی و نگرانی میں عراقی فقہ کا مرکز قرار پایا۔ دوسرا مدینہ منورہ' جسے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی علمی سیادت و قیادت میں حجازی فقہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی زمانے میں فقہ اسلامی کی تدوین کا آغاز ہوا۔

معاشرہ چوں کہ جامد نہیں ہے' تغیر پذیر ہے' نوع بنوع مسائل کا گہوارہ ہے اور ہر آن یہاں مسائل جنم لیتے ہیں اور اسلام دائمی مذہب ہے' لہٰذا دونوں کا یکساں اور ساتھ ساتھ چلنا ضروری ہے۔ اس کا احساس پہلی صدی ہجری میں اسی وقت ہونے لگا تھا' جب مسائل میں تنوع پیدا ہوا' ہمہ گیری ابھری اور ان کی تعبیر میں بوقلموں افکار نے ایسی صورت اختیار کر لی جس کے پیش نظر اہل علم کو تدوین فقہ کی طرف عنان توجہ مبذول کرنا پڑی اور کتاب و سنت کی روشنی میں اسے باقاعدہ ایک مستقل شرعی علم کے قالب میں ڈھالنے کا جذبہ ان کے قلب و ذہن میں ابھرا۔ یہ چار متعارف و مشہور فقہیں ہیں' جن کا چند الفاظ میں یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

تدوین فقہ کے سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سرفہرست نظر آتا ہے۔ وہ پہلے جلیل القدر بزرگ ہیں جو اقتدار بنوامیہ کے خاتمے کے بعد اپنے تلامذہ کی

ایک جماعت کے ساتھ اس میدان میں اترے۔ حضرت امام کی ولادت ۸۰ ہجری میں ہوئی اور ۱۵۰ ہجری میں وہ اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

طریق استنباط

امام ابوحنیفہ کا مسائل دینی میں طریق استنباط یہ تھا کہ پہلے جواب مسئلہ کتاب اللہ سے تلاش کرتے۔ وہ جواب کتاب اللہ کی عبارۃ النص سے ہو' دلالتہ النص سے ہو' اشارۃ النص ہو یا اقتضاء النص سے۔ اگر اس میں کامیاب ہو جاتے تو اسی کا تعین کرتے۔ اگر اس کا کتاب اللہ سے سراغ نہ ملتا یا کتاب اللہ کی روشنی میں بات کا فیصلہ نہ ہوسکتا تو سنت مشہورہ کی طرف رجوع فرماتے۔ اگر سنت مشہورہ کے ذریعے سے کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتے تو اہل فتویٰ صحابہ اور تابعین کے اقوال اور قضایا میں اس کی تلاش شروع کرتے۔ اجماع کی طرف آتے اور اہل عراق صحابہ اور اہل عراق تابعین کے مسلک و مذہب کو محل فکر ٹھہراتے۔ اگر یہاں سے بھی جواب نہ ملتا تو قیاس اور استحسان سے مسئلے کا حل ڈھونڈتے۔

احادیث کے متعلق یہ بات ان کے پیش نظر رہتی کہ اگر حجازی اور عراقی صحابہ سے مروی مرفوع احادیث میں اختلاف ہوتا تو بربنائے فقہ راوی' روایتِ فقیہہ کو ترجیح دیتے۔

قبل از وقوع واقعہ پر غور

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ سے قبل اصحاب فتویٰ قضاۃ میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ جب تک کوئی نئی صورت حال ابھر کر سامنے نہ آتی' مسئلے پر غور نہ کرتے۔ لیکن امام صاحب کا نقطہ نظر اس کے برعکس یہ تھا کہ جن امور میں لوگوں کے مبتلا ہونے کا اندیشہ یا امکان ہے' ان پر اہل علم کو پہلے ہی غور کر لینا چاہیے تاکہ نئی صورت حال پیش آجانے کی صورت میں اور عندالنوازل انھیں کوئی حیرانی نہ ہو اور وہ اسے ایسی بات نہ سمجھیں جس سے وہ پہلے سے آگاہ نہ تھے۔

امام صاحب کا نقطہ فکر یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان معاملات سے کوئی

شخص دوچار ہو جائے تو از روئے شریعت اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان بہت سے مسائل فقہیہ کو ہدف فہم ٹھہرایا جن کا عالم وقوع میں آنا ممکن تھا۔

امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں چار شاگردوں نے بڑی شہرت پائی اور وہ عمود فقہ حنفی کہلائے۔ وہ ہیں امام زفر' امام ابویوسف' امام محمد اور امام حسن بن زیاد۔ ان کی وجہ سے فقہ امام ابوحنیفہ اور ان کے مسلک کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

فقہ اسلامی کے دوسرے مضبوط ترین ستون امام مالک بن انس بن مالک بن ابو عامر ہیں۔ امام مالک مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کے پردادا حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے' جنھوں نے غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات نبوی میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی تھی۔

امام مالک نہایت موثر شخصیت کے مالک تھے' حدیث وفقہ میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کی کتاب ''موطا'' نے اہل علم میں بے حد شہرت پائی اور ہر حلقے میں متداول ومقبول ہوئی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس دور کے بارہ سو اہل علم نے ان سے موطا پڑھا۔

استنباط

امام مالک کم وبیش پچاس برس مسجد نبوی میں مسند درس وافتا پر رونق افروز رہے اور بے شمار حضرات نے ان سے استفادہ کیا۔ امام مالک کے نزدیک تعامل اہل مدینہ مستقل حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ استنباط مسائل میں فقہ مالکی کے ذرائع مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید۔

(۲) احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) تعامل اہل مدینہ۔

(۴) قیاس۔

(۵) استصلاح۔

امام مالک کی ولادت ۹۳ ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی اور وہیں ۱۷۹ ہجری میں وفات پائی۔ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا' جنھوں نے امام کے فقہی اور شرعی نقطہ نظر کی بے حد اشاعت کی' رحمہم اللہ تعالیٰ۔

علم حدیث کی تعظیم

امام مالک بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ان کا دل عظمت حدیث سے معمور تھا۔ اس کا اندازہ علامہ زرقانی کی اس عبارت سے ہوتا ہے جو انھوں نے مقدمہ شرح موطا میں حضرت امام کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔

اخـذ عـن تسعمائة شيخ فاكثر وما افتىٰ حتىٰ شهدله سبعون اماما انـه اهـل لـذالـک و کتب بيده مائة الف حديث وجلس للدرس وهـو ابـن سبعة عشر عاما وصارت حلقته اكبر من حلقة مشائخه فـي حيـاتهـم ' وكـان الـنـاس يزدحمون على بابه لاخذ الحديث والـفـقـه كـا زدحـامهـم عـلـى بـاب السـلطان' وله حاجب ياذن اولاًلـلـخـاصـة ' فـاذا فـرغـوا اذن للعامة واذا جلس للفقه جلس كيف كـان' واذا ارادالـجـلـوس للحديث اغتسل وتطيب ولبس ثيـابـا جـددا وتـعـمـم وقعد على منصته بخشوع و خضوع ووقار ويبـخر المجلس بالعود من اوله الى فراغه تعظيما للحديث حتى بـلـغ مـن تـعظيمه له انه لدغته عقرب وهو يحدث ستة عشر مرة فصار يصفر ويتلوى حتى تم المجلس ولم يقطع كلامه.

(مقدمه زرقانی شرح موطا ص ۳)

(امام مالک نے نوسو اساتذہ سے علم حاصل کیا اور اس وقت تک فتویٰ نہیں دیا جب تک ستر ائمہ کرام نے فتوے کے لیے ان کی صلاحیت کی شہادت نہیں دی۔اپنے ہاتھ سے انھوں نے ایک لاکھ حدیثیں لکھیں۔وہ سترہ برس کی عمر میں مسند درس پر بیٹھ گئے تھے اور ان کا حلقہ درس ان کے اساتذہ کی زندگی ہی

میں ان کے حلقہ ہائے درس سے بڑھ گیا تھا۔ حدیث وفقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے ان کے دروازے پر لوگوں کا اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا' جیسا کہ بادشاہ کے دروازے پر ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ایک دربان مقرر کر رکھا تھا جو پہلے ان خاص لوگوں کو ان کے حلقۂ درس میں جانے کی اجازت دیتا تھا جو باقاعدگی کے ساتھ ان سے سماع علم کرتے تھے' جب وہ فارغ ہو جاتے تو ان عام لوگوں کو آنے کی اجازت دی جاتی تھی جو مسائل وغیرہ دریافت کرنے کے لیے آتے تھے۔

حضرت امام فقہ پڑھانے بیٹھتے تو زیادہ اہتمام نہیں کرتے تھے' بس آتے اور مسند پر بیٹھ جاتے' لیکن جب حدیث پڑھانے کا ارادہ فرماتے تو بے حد اہتمام کرتے۔ غسل فرماتے' خوشبو لگاتے' نیا لباس زیب تن فرماتے' عمامہ باندھتے اور خشوع وخضوع کے ساتھ یک سو ہو کر بیٹھتے۔ درس حدیث کے دوران شروع سے آخر تک مجلس میں خوشبودار چیزیں جلتی رہتیں۔ اس تمام اہتمام کی تہہ میں حدیث کی تعظیم وتکریم کا مقصد پنہاں تھا۔ تعظیم حدیث کا جذبہ ان کے دل میں یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ ایک دن حدیث پڑھا رہے تھے کہ ان کی قمیص میں بچھو داخل ہو گیا اور اس نے ان کے جسم پر سولہ دفعہ ڈنگ مارا۔ تکلیف سے ان کی حالت متغیر ہو ہو جاتی اور چہرے کا رنگ بدل بدل جاتا' لیکن وہ مجلس کے اختتام تک بہ دستور حدیث کا درس دیتے رہے۔)

یہ تھا حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث کا طریقہ اور یہ تھی ان کے دل میں ارشادات پیغمبر (ﷺ) کی تعظیم وتکریم۔

ان کی کتاب موطا کو اللہ تعالیٰ نے اہل علم میں بے حد پذیرائی بخشی اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں اور علمائے کرام نے ہر شرح کا نہایت ذوق وشوق اور اخلاص وتوجہ سے مطالعہ کیا۔

خود امام مالک سے موطا بارہ سو اصحاب علم نے پڑھا۔ اس کے بعد آج تک اس کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور اب تک لاکھوں اصحاب علم اسے پڑھا چکے اور پڑھ چکے ہیں۔

موطا کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی رائے

موطا کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وان شئت الحق الصراح فقس کتاب الموطا بکتاب الآثار لمحمد والامالی لابی یوسف تجدبینه وبینهما بعدالمشرقین، فما سمعت احداً من المحدثین والفقهاء تعرض لهما واعتنی بهما ؟.[۱]

(اگر تم موطا کی مقبولیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس کا مقابلہ امام محمد کی کتاب الآثار اور امام ابو یوسف کے الامالی سے کرو اور پھر سوچو کہ کسی محدث اور فقیہ نے ان دونوں کی کتابوں سے کوئی تعرض کیا اور انھیں لائق اعتنا گردانا؟ واقعہ یہ ہے کہ موطا امام مالک اور ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق ہے)

نواب صدیق حسن کا فرمان

حضرت سید نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فارسی کتاب ''اتحاف النبلا'' میں موطا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا یہاں اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''موطا امام مالک قدیم بابرکت و باسعادت کتاب ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کی تصانیف میں سے حدیث کے موضوع پر اس وقت صرف یہی کتاب دست یاب ہے۔ اس کے علاوہ کسی امام کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ دوسرے ائمہ کی جو مسانید دنیائے علم میں مشہور ہیں، وہ خود ان کی تصنیف کردہ نہیں ہیں، بلکہ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے ان کی مرویات جمع کی ہیں اور ان کی مسند کے نام سے موسوم کر دی گئی ہیں۔''

اس سے آگے نواب صاحب رقم فرماتے ہیں۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۴۔

''حلیہ میں ابونعیم' امام مالک سے روایت بیان کرتے ہیں کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے مجھ سے مشورہ کیا کہ میں موطا کو کعبۃ اللہ میں آویزاں کر دیتا ہوں اور لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ اس کے مطابق عمل کریں۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے روک دیا' اس لیے کہ یہ کتاب تعامل اہل مدینہ کے مطابق تصنیف کی گئی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بعض مسائل کی تعبیر میں مختلف آرار کھتے ہیں اور متعدد شہروں اور علاقوں میں پھیل گئے ہیں' اور سب کا نقطہ نظر صحیح ہے۔ ہارون الرشید نے میری یہ بات سن کر کہا: اے ابوعبداللہ! اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔''

اس سے آگے نواب صاحب طبقات ابن سعد کے حوالے سے امام مالک کی یہ روایت بیان کرتے ہیں۔

''عباسی خلیفہ منصور نے حج کے موقعے پر ان سے کہا کہ میں چاہتا ہوں آپ کی کتاب موطا کا ایک ایک نسخہ اپنی قلمرو کے ہر شہر کے مسلمانوں کو بھجوادوں اور انھیں حکم دوں کہ اس کے مندرجات کے مطابق عمل کریں اور اس سے سرمو تجاوز نہ کریں' جو کچھ اس میں مرقوم ہے' اس کے پابند رہیں۔ لیکن میں نے کہا: امیر المومنین! لوگوں کو یہ حکم نہ دیجیے اس لیے کہ لوگوں کو پہلے سے احادیث پہنچ گئی ہیں اور ہر جگہ کے لوگ ان کے مطابق عمل کر رہے ہیں اور وہ صحیح سمت اختیار کیے ہوئے ہیں' ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔''

(اتحاف النبلا ص ۱۶۴' ۱۶۵)

یہ ہے نہایت مختصر الفاظ میں موطا امام مالک کی اہمیت و فوقیت' اور یہ ہے خود امام مالک کا مقام و مرتبہ۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

امام شافعی

فقہ اسلامی کے تیسرے عظیم المرتبت امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن عثمان بن شافع الشافعی المطلبی ہیں۔ امام شافعی کی ولادت ۱۵۰ ہجری میں صوبہ عسقلان کے ایک مقام ''غزہ'' میں ہوئی۔ انھوں نے امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی سے حصول علم کیا۔

امام شافعی کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تین مسالک فقہی کے جامع تھے۔ مسلک محدثین اور مسلک اہل حجاز کے امام مالک کے واسطے سے اور مسلک اہل عراق کے امام محمد کی وساطت سے۔ اس طرح وہ تینوں مسالک پر عبور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسی فقہ مدون فرمائی جس میں محدثین' اہل حجاز اور اہل عراق تینوں کا اسلوب فکر کارفرما تھا۔

جو فقہ انھوں نے عراق میں مرتب کی' اس میں عراقی رنگ غالب ہے' اسے ان کا مذہب قدیم کہا جاتا ہے۔ پھر مصر تشریف لے جانے کے بعد جو فقہ مصر میں ترتیب دی' اس میں حجازی رنگ نمایاں ہے' اسے ان کے مذہب جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امام شافعی کی مدونہ فقہ کو "فقہ شافعی" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

وسعت علم

حافظ ابن حجر نے "توالی التاسیس بمعالی الامام محمد بن ادریس" کے نام سے امام شافعی کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی ہے' اس میں وہ حضرت امام کی وسعت علم اور فہم و فراست کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔

فكان الشافعي رجلا قرشي العقل والفهم والذهن' صافي العقل والفهم والدماغ سريع الاصابة. [1]

(امام شافعی قرشی بے حد عاقل و فہیم تھے۔ ان کا ذہن و دماغ نہایت صاف تھا۔ بات کی تہہ کو بہت جلد پہنچ جاتے تھے)

اسی کتاب میں حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کا ذکر کیا ہے اور الگ الگ ان کے نام تحریر کیے ہیں۔ پھر لکھا ہے۔

فهولاء شيوخه الذين نقل عنهم العلم والحديث والفقه والاخبار سمع منهم بمكة والمدينة واليمن والعراق ومصر وكان مكثرا

۱۔ توالی التاسیس بمعالی الامام محمد بن ادریس ص ۵۶۔

من الحدیث۔ [1]

(ان تمام حضرات کا شمار امام شافعی کے اساتذہ میں ہوتا ہے' ان سے انھوں نے حدیث وفقہ اور رجال کا علم مکہ' مدینہ' یمن' عراق اور مصر میں حاصل کیا اور حدیث انھوں نے کثرت سے روایت کی)

ابن خلکان لکھتے ہیں۔

اجتمعت فیہ من العلوم بکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکلام الصحابۃ وآثارھم واختلاف اقاویل العلماء وغیر ذالک من معرفۃ کلام العرب واللغۃ والعربی والشعر مالم یجتمع فی غیرہ۔ [2]

(امام شافعی کی ذات میں قرآن وحدیث' اقوال وآثار صحابہ' اختلاف اقوال علما' کلام عرب' علم لغت اور شاعری وغیرہ سب علوم جمع تھے۔ علوم کی جو جامعیت ان میں پائی جاتی تھی' کسی میں نہ تھی۔)

امام شافعی کا نہج استدلال

امام شافعی مسائل میں ظاہر قرآن سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے بعد حدیث کی طرف رجوع فرماتے ہیں' اگرچہ وہ حدیث کسی مقام کے اہل علم سے حاصل کی گئی ہو' لیکن شرط یہ ہے کہ حدیث متصل ہو اور اس کے راوی ثقہ ہوں۔ اسی بنا پر علمائے اہل حدیث میں امام شافعی کو حسن قبول حاصل ہوا۔ اہل بغداد تو انھیں ناصر السنہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔

حدیث کے بعد وہ اجماع کی طرف آتے ہیں۔ قرآن' حدیث اور اجماع' تینوں میں مسئلے کی عقدہ کشائی نہ ہو تو قیاس پر اس شرط کے ساتھ عمل کرتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی اصل معین ہو۔

اہل عراق کے استحسان اور اہل حجاز کے استصلاح کے وہ مخالف ہیں۔ البتہ

۱۔ ایضاً ۲۔ وفیات الاعیان

''استدلال'' کو قابل عمل مانتے ہیں جو اس کے قریب ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۰۴ ہجری کو مصر میں وفات پائی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

فقہ اسلامی کے چوتھے جلیل القدر امام' ابوعبداللہ احمد بن حنبل بن ہلال ذہلی مروزی ہیں جو ۱۶۴ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئے۔

امام احمد بن حنبل کی فقہ بہت صاف اور سادہ ہے۔ درحقیقت وہ طریق اہل حدیث کو پسند فرماتے ہیں' جس میں درایت و رائے کا حصہ بہت کم ہے۔

فقہ حنفی کی تحصیل انھوں نے امام ابو یوسف سے کی۔ فقہ شافعی کے لیے براہ راست امام شافعی کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا۔ تکمیل حدیث کے لیے مختلف محدثین کی خدمت میں گئے اور اس میں مہارت پیدا کی۔ چنانچہ علم حدیث میں ان کے عمق وانہماک کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

وكان اعظمهم شانا و اوسعهم رواية واعرفهم للحديث مرتبة و اعمقهم فقها احمد بن حنبل ثم اسحاق بن رهوايه. [1]

(محدثین میں سب سے بڑے مرتبے والے' سب سے زیادہ روایت والے' سب سے زیادہ مراتب حدیث کو پہچاننے والے اور نصوص کے معانی کو سب سے زیادہ سمجھنے والے احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔)

اصول استدلال

مسائل شرعی کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا اصول یہ تھا کہ قرآن حکیم اور صحیح السند حدیث پر عمل کی دیواریں استوار کی جائیں۔ درایت' تنقیح مناط اور قیاس سے وہ حتی الامکان دامن کشاں رہتے ہیں۔ مالکیہ کا تعامل اہل مدینہ بھی ان کے نزدیک قابل حجت نہیں۔ وہ مرفوع اور موقوف صحیح حدیث کو لائق عمل قرار دیتے ہیں۔ قیاس سے بہ درجہ

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ص ۱۵۰۔ باب الفرق بین اہل الحدیث واہل الرائی۔

مجبوری کام لیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل نے ۷۷ سال عمر پا کر ۱۲۔ ربیع الاول ۲۴۱ ہجری کو سفر آخرت اختیار کیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں فقہی مذاہب کی تاریخ' ان کے عالم وجود میں آنے کی وجہ' فقہ اسلامی کے مراکز سبعہ کا تذکرہ' ائمہ فقہ اسلامی کا ذکر اور یہ ہیں ان کے مقرر کردہ اصول وضوابط۔

گیارھواں باب

فقہ اور اس کے حدود اطلاق

گزشتہ سطور میں موضوع کی رعایت سے بہ قدر ضرورت فقہی مذاہب اور ان کی تاریخ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعے پر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ فقہ کیا ہے اور اس کے حدودِ اطلاق کیا ہیں؟

فقہ کے لفظی اور لغوی معنے قرآن کی رو سے

فقہ کے لفظی معنے علم و ادراک' سمجھ بوجھ' فہم و فراست اور عقل و فطانت کے ہیں۔ قاموس' اقرب الموارد اور مجمع البحار وغیرہ کتب لغت میں اس کے لغوی معنے یہی مرقوم ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں بھی مختلف مقامات پر انہی معنوں میں آیا ہے۔

۱۔ سورہ نساء میں مخالفین اسلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہے اور اگر کسی تکلیف سے دوچار ہوتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ یہ تکلیف آپ کی وجہ سے پہنچی ہے۔

۱۔ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا) (النساء: ۷۸)

(اے پیغمبر انھیں کہہ دیجیے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ہو یہ سمجھ بوجھ کے قریب ہی نہیں پھٹکتے۔)

۲۔ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ. (الانعام: ۲۵)

(اور ہم نے منکرین حق کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ بات کی سمجھ تک نہیں پہنچتے۔)

۳. اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ. (الانعام: ٦٥)
(اے پیغمبر! دیکھو ہم کس طرح گونا گوں طریقوں سے آیتیں بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھیں بوجھیں۔)

۴. قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ. (الانعام: ۹۹)
(جو لوگ بات کی سمجھ بوجھ رکھنے والے ہیں' ان کے لیے ہم نے اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔)

۵. لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا. (الاعراف: ۱۷۹)
(ان کے دل ہیں' مگر ان سے سمجھتے نہیں۔)

٦. ......مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. (الانفال: ٦٥)
(......کافروں کا گروہ ایسا گروہ ہے' جس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے۔)

۷. قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ. (التوبه: ۸۰)
(اے پیغمبر! کہہ دیجیے' دوزخ کی آگ کی گرمی تو اس سے کہیں زیادہ گرم ہو گی' کاش انھوں نے سمجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا۔)

۸. وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ. (التوبه: ۸۷)
اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی' پس یہ کچھ سمجھتے نہیں۔)

۹. فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ. (التوبه: ۱۲۲)
(پس کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی جو کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرتی۔)

۱۰. صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ. (التوبه: ۱۲۷)
(اللہ نے ان کے دل پھیر دیے' کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ سے کورے ہو گئے۔)

۱۱. قَالُوْا يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ. (هود: ۹۱)
(لوگوں نے کہا: اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو' اس میں سے اکثر باتیں تو

ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔)

۱۲۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ۔ (بنی اسرائیل: ۴۴)

(ہر شے اللہ کی پاکیزگی کا زمزمہ بلند کر رہی ہے، مگر تم ان کی زمزمہ سنجیاں سمجھتے نہیں۔)

۱۳۔ وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ۔ (بنی اسرائیل: ۴۶)

(اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف ڈال دیے، ان کی سمجھ کام نہیں دیتی۔)

۱۴۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ۔ (الکہف: ۵۷)

(بلاشبہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ کوئی بات سمجھ نہیں پاتے۔)

۱۵۔ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا یَكَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ قَوْلًا۔ (الکہف: ۹۳)

(ذوالقرنین) دو پہاڑوں کی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے، جس سے بات کی جائے تو بالکل نہیں سمجھتی۔)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم کے مطابق فرعون کی طرف احکام خداوندی کی تبلیغ کے لیے روانہ ہونے لگے تو یہ دعا مانگی۔

۱۶۔ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ۔ (طٰه: ۲۵۔۲۸)

(اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام میرے لیے آسان فرما دے۔ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ جائیں۔)

۱۷۔ بَلْ كَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا۔ (الفتح: ۱۵)

(بلکہ یہ لوگ اصل بات کم ہی سمجھتے ہیں۔)

۱۸. ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّايَفْقَهُوْنَ. (الحشر: ۱۳)
(یہ اس لیے کہ یہ لوگ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔)
۱۹. فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَايَفْقَهُوْنَ. (المنافقون: ۳)
(ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی' اب یہ لوگ حق بات نہیں سمجھ پاتے۔)
۲۰. وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَايَفْقَهُوْنَ. (المنافقون:۷)
(لیکن منافق اتنی بات بھی نہیں سمجھ پاتے۔)

ان آیات میں جن الفاظ (یعنی یفقهون' یفقهوه' نفقه' لیتفقهوا وغیرہ) پر خط کھینچا گیا ہے' یہ ''فقہ'' سے مشتق ہیں اور ان کے معنے سمجھ بوجھ اور عقل و شعور کے ہیں' ان کا استعمال بہ صورت نفی بھی ہوا ہے اور بہ صورت اثبات بھی۔

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ یہ لفظ اس وقت بھی موجود تھا اور استعمال ہوتا تھا جب فقہ مصطلحہ عالم وجود میں نہیں آئی تھی اور ائمہ فقہ پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت اس کا اطلاق صرف عقل و شعور اور سمجھ بوجھ کے معنوں میں ہوتا تھا اور یہی درحقیقت اس کے لغوی معنے ہیں۔

فقہ کے معنے حدیث کی رو سے

قرآن مجید کے علاوہ یہ لفظ حدیث پاک میں بھی استعمال ہوا ہے اور وہاں اس کے معنے دین کی سمجھ کے اور حصول علم کے ہیں۔۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول من یردالله به خیرا یفقهه فی الدین وانما انا قاسم والله یعطی ولن تزال هذه الامة قائم علی امر الله لایضرهم من خلفهم حتی یاتی امر الله.[۱]

(میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ بھلائی کی نعمت سے بہرہ ور کرنا چاہتا ہے' اسے دین کی سمجھ سے نواز دیتا ہے۔ اللہ عطا فرماتا ہے اور میں بانٹنے والا ہوں۔ امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ

۱۔ صحیح بخاری' کتاب العلم' باب من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین.

وسلم) ہمیشہ امورحق پر قائم رہے گی' قیامت تک اس کے مخالفین اسے تکلیف نہ پہنچا سکیں گے۔)

حدیث کا مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو بھلائی اور خیر سے نوازنا چاہے' اسے دینی معاملات کی سمجھ بوجھ سے آشنا فرما دیتا ہے اور پھر ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جن حقائق دینیہ سے مجھے سرفراز کیا جاتا ہے' میں وہ حقائق تمھیں بتا دیتا ہوں اور دین کی ہر بات تمھارے علم میں لے آتا ہوں۔ بہت سے لوگ اس امت کی مخالفت پر کمربستہ ہوں گے اور اذیت رسانی کا ہر حربہ استعمال کریں گے' مگر اسے اس نوع کا کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے جو اسے ختم کرنے کا باعث ہو سکے۔ یہ امت قیامت تک اپنے فرائض تبلیغ مختلف انداز سے حالات کے مطابق سرانجام دیتی رہے گی۔

ایک حدیث کے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' الفاظ یہ ہیں۔

الناس معادن كمعادن الذهب والفضة خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا. (۱)

(انسان بھی اسی طرح کی کانیں ہیں' جس طرح سونے اور چاندی کی کانیں ہیں۔ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں بھلائی کے حامل تھے' وہ زمانہ اسلام میں بھی بھلائی کے حامل ہیں' جب کہ وہ علم وادراک کی نعمت سے بہرہ یاب ہو جائیں۔)

اس حدیث کے الفاظ بھی معنی و مطلب کے اعتبار سے بالکل صاف ہیں۔ یعنی انسانوں کی حیثیت وہی ہے جو سونے اور چاندی کی کانوں کی ہے۔ کانوں میں سونے اور چاندی کے بے شمار ڈھیر پڑے ہیں۔ انسانوں کے ذہن وفکر میں بھی بھلائی' نیکی' صالحیت اور امور خیر کی بہت بڑی مقدار موجود ہے' بشرطیکہ وہ علم وعقل سے روشناس ہوں' جو لوگ دور جاہلیت میں مکارم اخلاق' شرافت ونجابت اور علم وفہم کے مالک تھے' دور اسلام میں بھی وہ ان اوصاف سے متصف ہیں۔ انسان اگر طبع خیر کا حامل ہو اور عقل وشعور کی دولت سے

۱۔ صحیح مسلم۔ مشکوٰۃ' کتاب العلم۔

کوئی حصہ اسے میسر آیا ہو تو وہ ہر دور اور ہر حال میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

حضرت عمر فاروق کا قول

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

تفقهوا قبل ان تسودوا. [۱]

(قبل اس کے کہ تمھیں کسی منصب پر فائز کیا جائے، علم و دانائی حاصل کرلو)

کسی کو کسی بھی عہدے پر متمکن کیا جائے، کسی معاملے کی سیادت اس کے سپرد کی جائے، کسی ذمے داری کے مقام پر اسے متعین کیا جائے، کہیں بھی اس کی تقرری عمل میں لائی جائے، اس کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس عہدہ و منصب کے آداب اور تقاضوں سے کامل آگاہی حاصل کی جائے اور اس کے مالہ و ماعلیہ سے پوری طرح واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کو وسیع معنوں میں لینا چاہیے، جس میں حکومتی منصب بھی شامل ہے اور دینی ذمے داریاں بھی اس کے ذیل میں آتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی منصب پر فائز ہو گئے، لیکن اس کے تقاضوں کا کوئی علم نہ ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس منصب کی ذمے داریاں کس انداز کی ہیں اور وہ کس طریقے سے پوری کی جائیں۔

یہاں فقہ یعنی "تفقهوا" کا اطلاق حکومت و سیادت کے معاملات سے آگاہ ہونے اور اس نہایت اہم ذمہ دارانہ منصب کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور اس کی جزئیات و تفصیلات سے متعلق عبور حاصل کرنے پر ہوا ہے۔ لفظ "تفقهوا" سے یہاں وہ فقہ مراد نہیں، جسے اصطلاحی معنوں میں فقہ کہا جاتا ہے۔ یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ مروجہ فقہ کا علم حاصل کرو اور جی لگا کر اس کی دو چار کتابیں پڑھ لو۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ

مختلف معانی

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لکھا ہے:

الفقه هوالتوصل على علم غائب بعلم شاهد فهواخص من العلم.[1]

(فقہ کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک پہنچنے کے ہیں)

اس کے ساتھ ہی مرقوم ہے۔

والفقه العلم باحكام الشريعة يقال فقه الرجل فقاهة اذا صار فقيها.[2]

(احکام شریعت کا علم حاصل کرنے کو فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اس علم کو سمجھ لیا۔)

امام ابن عبدالبر نے اسے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ وہ اس کے اصطلاحی معنوں کی وضاحت کرتے ہوئے ہشام بن عبداللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

من لم يعرف اختلاف الفقهاء فليس بفقيه.[3]

(جو شخص مسائل میں اہل علم کے باہمی اختلاف سے آگاہ نہیں، اسے فقیہ نہیں کہا جا سکتا۔)

اس سلسلے میں وہ قتادہ کے یہ الفاظ بیان فرماتے ہیں۔

من لم يعلم الاختلاف لم يشم الفقه بانفه.[4]

(جو شخص اصحاب علم کے اختلافات کا علم نہیں رکھتا، اس نے فقہ کو سونگھا تک نہیں۔)

ان الفقيه من فقه فى القرآن و عرف مكيدة الشيطان.[5]

(فقیہ وہ ہے جو قرآن کو سمجھتا ہے اور شیطان کی فریب کاریوں سے آگاہ

۱۔ مفردات القرآن، بہ ذیل لفظ فقہ۔ ۲۔ مفردات القرآن۔

۳۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۴۶۔ ۴۔ ایضاً ص ۴۶۔ ۵۔ ایضاً ص ۴۷۔

ہے۔)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ کیا اہل علم کے اختلافات سے مراد اہل الرائے کے اختلافات ہیں؟

جواب دیا: اس سے مسائل کی تعبیر میں صحابہ کے باہمی اختلافات مراد ہیں۔

مجاہد کا بیان ہے۔

الفقیه من خاف الله.

(فقیہ وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بیان کرتے ہیں، جس کے الفاظ یہ ہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

الا انبئکم بالفقیه؟ قالوا بلی. قال من لم یقنط الناس من رحمة الله ولم یؤسیهم من روح الله ولم یؤمنهم من مکر الله ولا یدع القرآن رغبة عنه الی ماسواه. الا لاخیر فی عبادة لیس فیها تفقه.[1]

(کیا میں تمھیں یہ نہ بتاؤں کہ سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا فقیہ وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمتوں سے ناامید اور اس کی کرم نوازیوں سے مایوس نہ کرے، اللہ کی تدبیروں سے انھیں بے خوف نہ کرے، قرآن سے بے رغبتی کر کے ماسوا کو مرکز توجہ نہ ٹھہرائے۔ خبردار! جس عبادت میں تفقہ نہ ہو وہ خیر سے خالی ہے)

امام ابن عبدالبر نے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

رب حامل فقه غیر فقیه و رب حامل فقه الیٰ من هوا فقه منه.

(یعنی بسا اوقات فقہ کا مبلغ خود فقیہ نہیں ہوتا اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جسے فقہ کی تلقین کی جا رہی ہو، وہ تلقین کرنے والے سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔)

۱۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۴۴)۔

ابن عبدالبر تحریر فرماتے ہیں۔

فسمي الحديث فقها مطلقا وعلما. [۱]

(یعنی حدیث اور علم کو فقہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔)

ليس الفقه بكثرة المسائل ولكن الفقه يوتيه الله من يشاء من خلقه. [۲]

(فقہ زیادہ مسائل بیان کرنے کا نام نہیں' بلکہ یہ اللہ کا ایک عطیہ ہے' جسے وہ عنایت فرمادے۔)

''فقہ اکبر'' مشہور کتاب ہے جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔فقہ کی تعریف کے بارے میں اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

الفقه معرفة النفس مالها وما عليها. [۳]

(نفس پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں' ان کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کا نام فقہ ہے۔)

یہاں یہ بھی یادرہے کہ جب منطق اور فلسفہ وغیرہ یونانی علوم کی نشر و اشاعت ہونے لگی اور متکلمین نے مناظرات و نزاعات کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف مسائل میں تاویلات و تعبیرات نے راہ پائی تو علم الکلام کو بھی ''فقہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔

بہرکیف فقہ کا لفظ صرف چند معروف کتابوں میں درج شدہ مسائل پر ہی نہیں بولا جاتا بلکہ اس کے حدود اطلاق بہت وسیع ہیں' اختصار کے ساتھ اس کے دائرے میں مندرجہ ذیل امور آتے ہیں۔

- فکر و دانش اور فہم و فراست۔
- علم و ادراک' اگرچہ وہ علم کسی نوعیت کا ہو۔
- مسائل شرعی میں صحابہ کرام کے مجتہدانہ اختلافات سے آگاہی۔
- متقدمین کی اجتہادی آرا سے کامل واقفیت۔

۱۔ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۷۔ ۲۔ ایضاً ص ۴۵۔ ۳۔ فقہ اکبر ص ۱۰۔

- قرآن پر عبور اور اس کے احکام سے مکمل آگاہی۔
- شیطان کی فریب کاریوں کے مختلف پہلوؤں کا علم۔
- اللہ کے خوف کا دل میں جاگزیں ہونا اور لوگوں کو اس کی لامتناہی رحمتوں اور غیر محدود شفقتوں سے باخبر کرنا۔
- دین کی نشر و اشاعت کرنا اور حصول علم کے لیے کوشاں ہونا۔
- انسان پر جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں' انھیں پورا کرنا۔
- حدیث اور علوم حدیث کی معرفت۔

فقہ میں اور بھی بہت سے علوم آتے ہیں' جن کا پڑھنا اور سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ پھر اس کا اطلاق صرف ایک ہی فقہ پر نہیں ہوتا' تمام ائمہ مجتہدین کی آرا و افکار کو غور و فہم کی میزان میں رکھنا اور ان کے اصولوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے ذہن میں وسعت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ اپنے آپ کو تنگ نظری اور تعصب کے دائرے میں محدود کر کے فقہیات سے شناسائی نہیں ہو سکتی اور نہ تقلید کی جکڑ بندیوں سے حصول علم کی راہوں میں کشادگی کے آثار نمایاں ہو سکتے ہیں۔

بارھواں باب

تدوین فقہ کی بحث

یہاں ایک بہت بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہ کی تدوین کا سلسلہ کس امام فقہ نے شروع کیا اور کب کیا۔؟

مولانا شبلی نعمانی نے اس مسئلے پر اپنی تصنیف ''سیرۃ النعمان'' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس علم کی باقاعدہ تدوین کا آغاز حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''امام صاحب کو تدوین فقہ کا خیال قریباً ۱۲۰ھ میں پیدا ہوا' یعنی جب ان کے استاد حماد نے وفات پائی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ اسلام کا تمدن نہایت وسعت پکڑ گیا تھا۔ عبادات اور معاملات کے متعلق اس کثرت سے واقعات پیدا ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے کہ ایک مرتبہ مجموعہ قانون کے بغیر کسی طرح کام نہیں چل سکتا تھا' نیز سلطنت کی وسعت اور دوسری قوموں کے میل جول سے تعلیم و تعلم نے اس قدر وسعت حاصل کر لی تھی کہ زبانی سند و روایت اس کا تحمل نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے وقت میں قدرتی طور پر لوگوں کے دل میں خیال آیا ہوگا کہ ان جزئیات کو اصول کے ساتھ ترتیب دے کر ایک فن بنا دیا جائے۔'' (۱)

اس کے آگے مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں۔

> ''امام ابوحنیفہ کی طبیعت مجتہدانہ تھی اور غیر معمولی متقیانہ واقع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تجارت کی وسعت اور ملکی تعلقات نے ان کو معاملات کی ضرورتوں

۱۔ سیرۃ النعمان' ص ۱۴۰۔

سے خبردار کر دیا تھا۔ اطراف بلاد سے ہر روز جو سیکڑوں ضروری استفتا آتے تھے' ان سے ان کو اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کو اس فن کی کس قدر حاجت ہے۔ قضات اور حکام فصل قضایا میں جو غلطیاں کرتے تھے' وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔"(۱)

تدوین فقہ کی مجلس کے ارکان

اس کے بعد مولانا رقم طراز ہیں کہ کن کن حضرات اہل علم کو امام صاحب نے اس اہم خدمت کے لیے اپنے ساتھ ملایا اور وہ حضرات کن کن علمی و تحقیقی خصوصیات کے حامل تھے۔ اس ضمن میں خود انہی کے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

"امام صاحب نے جس طریقے سے فقہ کی تدوین کا ارادہ کیا وہ نہایت وسیع اور پُرخطر تھا' اس لیے انھوں نے اتنے بڑے کام کو اپنی ذاتی رائے اور معلومات پر منحصر کرنا نہیں چاہا۔ اس غرض سے انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص انتخاب کیے' جن میں اکثر خاص خاص فنون میں' جو تکمیل فقہ کے لیے ضروری تھے' استاد زمانہ تسلیم کیے جاتے تھے' مثلاً یحییٰ بن ابی زائدہ' حفص بن غیاث' قاضی ابو یوسف' داؤد الطائی' حبان' مندل حدیث و آثار میں نہایت کمال رکھتے تھے۔ امام زفر استنباط میں مشہور تھے۔ قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔ امام صاحب نے ان لوگوں کی شرکت سے ایک مجلس مرتب کی اور باقاعدہ طور سے فقہ کی تدوین شروع ہوئی۔ امام طحاوی نے بہ سند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہ کے تلامذہ جنھوں نے فقہ کی تدوین کی' چالیس تھے' جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے: ابو یوسف' زفر' داؤد الطائی' اسد بن عمر' یوسف بن خالد تمیمی' یحییٰ بن ابی زائدہ۔

"امام طحاوی نے یہ بھی روایت کی ہے کہ لکھنے کی خدمت یحییٰ سے متعلق تھی

۱۔ سیرۃ النعمان' ص ۱۴۰

اور وہ تیس برس تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔"[۱]

تدوین فقہ کی مدت، تیس سال۔۔۔۱۲۱ ہجری سے ۱۵۰ ہجری تک

مولانا شبلی کے بقول تدوین فقہ پر تیس سال صرف ہوئے۔ یعنی ۱۲۱ھ سے ۱۵۰ ہجری تک یہ کام ہوتا رہا اور ۱۵۰ ہجری میں امام صاحب فوت ہوئے۔[۲]

مولانا شبلی کی یہ تحریر بالکل واضح ہے اور اس کا ایک ایک لفظ نہایت آسانی سے ہر شخص کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض حضرات ائمہ کی معیت میں ۱۲۱ ہجری میں تدوین فقہ کا سلسلہ شروع فرمایا جو ان کی وفات (۱۵۰ ہجری) تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ فرماتے ہیں کہ فقہ کی تدوین کرنے والی جماعت میں امام طحاوی نے جن حضرات کا نام لیا ہے' ان میں یحییٰ بن ابی زائدہ بھی شامل ہیں۔۔۔ پھر مولانا شبلی فرماتے ہیں:

> "لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ شروع سے اس کام میں شریک تھے۔ یحییٰ ۱۲۰ ہجری میں پیدا ہوئے' اس لیے وہ شروع سے کیوں کر شریک ہو سکتے ہیں۔"[۳]

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ۱۲۱ ہجری میں جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تدوین فقہ کا آغاز فرمایا اس وقت یحییٰ بن ابی زائدہ جنھیں طحاوی نے اس جماعت کا رکن قرار دیا ہے' بقول شبلی صرف ایک برس کے تھے' لہٰذا تدوین فقہ والی جماعت میں ان کی شمولیت کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔۔۔ یعنی شبلی نے ان کو اس جماعت سے خارج کر دیا۔

اس باب میں مولانا رحیم آبادی کی تحقیق

یحییٰ کے بعد اب اس جماعت کے بعض دوسرے ارکان کے بارے میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی تحقیق کا مطالعہ کیجیے۔

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی معروف اہل حدیث عالم دین تھے جو ہندوستان کے

۱۔ سیرۃ النعمان ص ۱۴۱۔ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً

صوبہ بہار کے موضع رحیم آباد میں ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) کو پیدا ہوئے اور اپریل ۱۹۱۹ء (۱۳۳۸ھ) کو فوت ہوئے۔ انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کی ''سیرۃ النعمان'' کے جواب میں ''حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان'' کے نام سے کتاب تصنیف کی جو نہایت محققانہ کتاب ہے اور مولانا شبلی نعمانی سے جو فروگزاشتیں ہوئی ہیں' اس کتاب میں ان کا انتہائی اعتدال اور بے حد توازن سے جواب دیا گیا ہے۔

امام محمد کی عمر

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ فقہ کی تدوین کرنے والی جماعت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد امام محمد بھی شریک تھے اور انھیں ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔۔۔ اس کے جواب میں حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی فرماتے ہیں۔

> ''امام محمد علیٰ اختلاف الروایات ۱۳۵ھ یا ۱۳۲ھ یا ۱۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ابن خلکان میں بہ ذیل ذکر امام محمد لکھا ہے۔ مولده خمس و ثلاثین و قیل اثنین و ثلاثین مائة ۔ مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی تعلیق الممجد میں امام محمد کی پیدائش ۱۳۲ھ لکھتے ہیں۔ پھر ان کی شرکت سے وہ مجلس کیوں کر ترتیب دی گئی جو ۱۲۱ھ میں مرتب ہوئی۔ (۱)

اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ امام محمد تدوین فقہ والی مجلس کی ترتیب سے ایک روایت کے مطابق چودہ سال بعد' ایک کے مطابق گیارہ سال بعد اور ایک کے مطابق دس سال بعد پیدا ہوئے۔ مولانا شبلی بہت بڑے مورخ ہیں' لیکن تعجب ہے اس طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوا اور وہ یہ نہیں سوچ سکے کہ جو شخص اس مجلس کی ترتیب سے دس سال بعد پیدا ہوتا ہے' وہ اس کا رکن کس طرح بن گیا اور اسے ادب اور عربیت میں اتنا کمال کیسے حاصل ہو گیا؟ جو اس مجلس کی رکنیت کے لیے ضروری ہے؟

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۳

قاضی ابو یوسف کی عمر

اب قاضی ابو یوسف کی طرف آئیے۔ وہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے تاریخ ابن خلکان میں ہے۔

وكانت ولادة القاضي ابي يوسف سنة ثلاث عشرة ومائة ببغداد.[۱]

(قاضی ابو یوسف کی ولادت ۱۱۳ھ کو بغداد میں ہوئی۔)

اس حساب سے ۱۲۱ھ میں ان کا سن آٹھ برس کا تھا۔ پھر ۱۲۱ میں ان کی شرکت اس مجلس میں کیوں کر ثابت ہوئی؟ کیا آٹھ سال کا بچہ اس قسم کی اونچے درجے کی علمی مجلسوں میں شریک ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے؟

امام زفر کی عمر

امام زفر کے متعلق ابن خلکان میں لکھا ہے۔

مولده سنة عشرة ومائة و توفي في شعبان سنة ثمان و خمسين.[۲]

(وہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے اور شعبان ۱۵۸ھ کو انھوں نے وفات پائی۔)

اس حساب سے ۱۲۱ھ میں امام زفر کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ اتنے کم سن بچے کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تدوین فقہ کی مہتم بالشان مجلس کا رکن تھا' قطعاً قرین صواب نہیں ہے۔

حبان کی عمر

حبان کی نسبت تقریب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ ۱۷۱ یا ۱۷۲ھ کو ساٹھ برس کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ الفاظ یہ ہیں۔

حبان بن علي العنبري بفتح العين والنون ثم الراء. ابوعلي

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۳

۲۔ ایضاً

الکوفی ضعیف من الثامنۃ وکان لہ فقہ وفضل مات سنۃ احدیٰ او اثنین و سبعین ولہ ستون. سنۃ. [۱]

(حبان بن علی کوفہ کے رہنے والے ہیں' ضعیف ہیں' آٹھویں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں فقاہت اور فضیلت تھی۔۱۷۱ یا ۱۷۲ میں ان کا انتقال ہوا' اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس تھی۔)

اس حساب سے ۱۲۱ھ میں وہ آٹھ نو برس کے ہوں گے۔اس عمر میں اس قسم کی عظیم الشان مجلس کی رکنیت ناممکنات میں سے ہے۔

مندل کی عمر

مندل کی پیدائش جیسا کہ تقریب التہذیب میں مرقوم ہے' ۱۰۳ھ میں ہوئی۔۱۲۱ھ میں وہ سترہ اٹھارہ برس کے تھے۔اس عمر کے شخص کے لیے یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حدیث وآثار میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔

مولانا شبلی نعمانی نے جن ائمہ کرام کو تدوین فقہ کی مجلس کے رکن قرار دیا ہے' ان کے سنین کے سلسلے کی یہ باتیں ہم نے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی تصنیف ''حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان'' سے درج کی ہیں۔یہ کتاب مولانا شبلی کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی اور ان کے مطالعے میں آئی تھی۔انھوں نے ''سیرۃ النعمان'' کی دوسری اشاعت میں ان بعض فروگزاشتوں کی اصلاح بھی کر لی تھی' جن کا ذکر مولانا رحیم آبادی نے ''حسن البیان'' میں کیا تھا۔لیکن تدوین فقہ کی مجلس کے ارکان کے سنین سے متعلق مولانا رحیم آبادی نے جن حقائق کی نشان دہی فرمائی ہے' اس طرف مولانا شبلی نے توجہ نہیں کی۔اگر وہ اس طرف توجہ کرتے تو وہ تمام بنیاد ہی مخدوش ہو جاتی جس پر انھوں نے تدوین فقہ کی عمارت کھڑی کی ہے۔

فقہ کی تدوین سے انکار نہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مرتبہ فقاہت سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا' لیکن جس انداز سے اس کا تذکرہ مولانا شبلی نعمانی نے فرمایا ہے' وہ حقیقت کی

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۳۔۱۴۴۔بحوالہ تقریب التہذیب۔

میزان میں پورا نہیں اترتا۔ انتہائی تعجب انگیز بات ہے کہ اتنے بڑے صاحب مطالعہ مورخ سے اتنی بڑی چوک کیسے ہوگئی۔

سیرۃ النعمان میں انھوں نے جو لغزشیں کھائی ہیں، مولانا رحیم آبادی نے نہایت تحقیق کے ساتھ ان سب کی نشان دہی فرمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی نے اس کے بعد اس قسم کی خالص مسلکی انداز کی کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کے بعد ان کے رہوار قلم نے تحریر و نگارش کی دوسری راہ اختیار کر لی تھی۔

مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا ذکر مولانا غلام رسول مہر نے ''سرگزشت مجاہدین'' میں کیا ہے، جس میں مولانا شبلی پر ان کی تنقید کا ذکر بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو شیخ عطاء الرحمٰن اور شیخ عبدالرحمٰن کے ہاں پھاٹک حبش خاں میں قیام فرماتے۔ جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورۂ قٓ اول سے آخر تک پڑھتے اور مختصر سی تقریر بھی فرماتے۔ پھر وہ، حافظ عبداللہ غازی پوری اور دوسرے علما و رؤسائے دہلی اوکھلا میں جمع ہوتے۔ وہاں بنوٹ کے کرتب دکھائے جاتے، جنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ انھیں اور حافظ عبداللہ غازی پوری کو مجاہدین سے بڑی الفت تھی اور جہاد کا بہت شوق تھا۔ اسی خیال سے وہ موزوں جوانوں کو منتخب کر کے ان کے لیے سپاہیانہ فنون کے سیکھنے کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔ گھر سے آسودہ حال تھے۔ ہزاروں روپے جماعتی کاموں میں خرچ کیے۔ مولانا شبلی کی ''سیرۃ النعمان'' پر جو انتقاد انھوں نے ''حسن البیان'' کے نام سے شائع کیا، اس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔[1]

مسائل کی تعداد

تدوین فقہ کی اس مجلس میں جس کا ذکر مولانا شبلی نے فرمایا ہے، جو مسائل زیر بحث آئے اور مدون ہوئے، ان کی تعداد کتنی تھی؟ اس کے متعلق بھی مولانا شبلی ہی کے الفاظ

۱۔ سرگزشت مجاہدین ص ۶۴۳، ۶۴۴۔

ملاحظہ کیجیے۔فرماتے ہیں۔

''غالباً یہ مجموعہ بہت بڑا مجموعہ تھا اور ہزاروں مسائل پر مشتمل تھا۔ قلائد عقود الدرر والعقیان کے مصنف نے کتاب الصیانتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کیے' ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ یہ مسائل چھ لاکھ تھے۔''(۱)

اس کے آگے مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

''یہ خاص تعداد شاید صحیح نہ ہو' لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں سے کم نہ تھی۔''(۲)

اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے۔

''لیکن افسوس ہے کہ یہ مجموعہ ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے اور دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کا پتا نہیں چلتا۔''(۳)

اب خدا ہی جانتا ہے کہ یہ مدونہ فقہی مسائل چھ لاکھ تھے یا بارہ لاکھ نوے ہزار سے زائد تھے' اس کا مجموعہ تو مولانا فرماتے ہیں ''ایک مدت سے ضائع ہو گیا ہے۔''

تعجب ہے اس درجہ اہم علمی ذخیرہ ضائع کیسے ہو گیا' جب کہ بقول مولانا کے فقہ حنفی کو ہمیشہ حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ پھر مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بارہ تیرہ لاکھ کے مجموعے میں سے کچھ بھی نہیں بچا۔ صرف فقہ حنفی محفوظ ہے' اس کے مسائل ضائع ہو گئے ہیں۔

ایک گزارش اور سنیے!

اس باب کے شروع میں ہم مولانا شبلی کا یہ فرمان پڑھ آئے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ''اطراف بلاد سے ہر روز سیکڑوں ضروری استفتا آتے تھے'' ظاہر ہے مہینے میں وہ کئی ہزار استفتا ہو جاتے ہوں گے۔۔۔ لیکن مولانا نے نشان دہی کسی ایک

۱۔ سیرۃ النعمان ص ۱۴۲۔ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً ص ۱۳۷۔

استغنا کی بھی نہیں کی۔

آخر وہ استغنا کہاں گئے؟

مولانا شبلی کی ایک اور مورخانہ لغزش

مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

''صحابہ میں سے جن لوگوں نے استنباط واجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہ کہلائے' ان میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے۔ عمر' علی' عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عباس۔''(۱)

اس سے آگے لکھتے ہیں۔

''حضرت علی وعبداللہ بن مسعود زیادہ تر کوفہ میں رہے اور وہیں ان کے احکام کی زیادہ ترویج ہوئی' جس طرح کہ حضرت عمر وعبداللہ بن عباس کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا تھا۔''(۲)

مولانا شبلی کے الفاظ قارئین کرام کے مطالعے میں آئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مقدس جماعت میں سے چار صحابہ (حضرت عمر' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس) کے بارے میں فرمایا ہے کہ انھوں نے ''استنباط واجتہاد سے کام لیا اور مجتہد یا فقیہ کہلائے۔''

اصل معاملہ

مولانا شبلی نے جو کچھ فرمایا ہے' کیا وہ صحیح ہے؟ اس کے لیے بھی ہم حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے باب علم پر دستک دیتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

''یہ بات غلط ہے کہ صحابہ میں صرف یہی چار بزرگ فقہ اور استنباط مسائل میں ممتاز تھے۔ فقہ ومسائل میں جو صحابہ ممتاز تھے' امام ابن حزم نے ستائیس صحابہ کے نام گنوائے ہیں اور کثیر الفتویٰ ان میں سے سات ہیں۔''(۳)

۱۔ سیرۃ النعمان ص ۱۳۷۔ ۲۔ ایضاً

۳۔ حسن البیان ص ۱۴۰۔

اس کے بعد وہ فتح المغیث (صفحہ ۳۷۹) کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

والمکثرون منهم افتاء سبعة عمرو علی وابن مسعود وابن عمر وابن عباس و زید بن ثابت و عائشه. قال ابن حزم.یمکن ان یجمع من فتیا کل واحد من هولاء مجلد ضخیم.

(یعنی صحابہ میں سے کثیر الفتویٰ سات بزرگ ہیں' حضرت عمر' علی' عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عمر' عبداللہ بن عباس' زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم۔ امام ابن حزم کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص کے فتوے اس قدر ہیں کہ اگر جمع کیے جائیں تو ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔)

یہ بات بھی غلط ہے کہ حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود زیادہ کوفہ میں رہے۔ حضرت علی ۳۶ ہجری میں مدینے سے نکلے اور ۳۸ ہجری تک جنگ جمل' جنگ صفین اور جنگ نہروان میں مشغول رہے۔ اس کے بعد کوفہ میں صرف دو سال ان کی اقامت رہی۔"(۱)

اس سے آگے مولانا رحیم آبادی الاصابہ فی تمییز الصحابہ کی جلد ۴ کے صفحہ ۱۷۱ سے یہ الفاظ درج فرماتے ہیں۔

بویع بعد قتل عثمان فی ذی الحجة سنة خمس وثلاثین و کانت واقعة الجمل فی جمادی الثانية سنة ست وثلاثین و وقعة صفین فی سنة سبع و ثلاثین و وقعة النهروان مع الخوارج فی سنة ثمان وثلاثین. ثم اقام سنتین یحرض علی قتال البغاة فلم یتهیأ الی ان مات.

(یعنی حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی ذی الحجہ ۳۵ ہجری میں خلیفہ ہوئے اور جنگ جمل کا واقعہ ۳۶ ہجری میں پیش آیا۔ جنگ صفین ۳۷ ہجری میں اور خوارج کے ساتھ جنگ نہروان ۳۸ ہجری میں ہوئی۔ اس کے

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۰۔۱۴۱۔

بعد حضرت علی نے دو سال (کوفہ میں) اقامت اختیار کی۔ اس اثنا میں لوگوں کو باغیوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتے رہے' لیکن اس کا سامان نہ مہیا ہو سکا اور وہ شہید ہو گئے۔)

مولانا رحیم آبادی تحریر فرماتے ہیں۔

''اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پچیس برس یعنی ۳۵ ہجری تک مدینہ طیبہ میں رہے اور کوفہ میں ان کی اقامت صرف دو برس ہوئی۔ اس صورت میں صاحب سیرۃ النعمان کا یہ قول کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ زیادہ تر کوفہ میں رہے (اندازہ کیجیے) کس قدر ٹھیک اور ان کے طرز مورخانہ کی دلیل ہے۔ اگر وہ یہ کہیں کہ حضرت علی کی فقہ واستنباط کا زمانہ زیادہ تر کوفہ میں گزرا تو یہ بالکل غلط ہے۔''(۱)

باقی رہا مولانا شبلی کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بھی زیادہ تر کوفہ میں رہے۔ اس کے متعلق مولانا رحیم آبادی رقم طراز ہیں۔

''حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ابتدا سے مدینہ منورہ ہی میں رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار کو کوفہ کا حاکم بنا کر اور عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کا معلم بنا کر بھیجا' پھر ان کو موقوف کر کے مدینہ طلب کر لیا۔''

اس کے ثبوت میں مولانا رحیم آبادی ''اصابہ فی تمیز الصحابہ'' کی یہ عبارت پیش فرماتے ہیں۔

سیره عمر الی الکوفة لیعلمهم امور دینهم و بعث عمارا امیرا' قال انهما من النجباء من اصحاب محمد فاقتدوا بهما' ثم امره عثمان علی الکوفة' ثم عزله فامره بالرجوع الی المدینة.

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفے بھیجا تا کہ وہ وہاں کے لوگوں کو احکام دین کی تعلیم دیں اور حضرت عمار کو وہاں کا حاکم بنا کر

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۱۔

بھیجا اور فرمایا کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے یہ دونوں ممتاز درجے پر فائز ہیں' ان کی اقتدا کرو۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفے کا حاکم مقرر فرمایا۔ پھر انھیں اس عہدے سے معزول کر کے واپس مدینے شریف بلالیا۔) (۱)

مولانا رحیم آبادی' مولانا شبلی کے اس نقطہ نظر کو بھی صحیح نہیں قرار دیتے کہ "حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس کے تعلق سے حرمین کو دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا۔"

وہ فرماتے ہیں۔

"یہ بات سراسر غلط ہے کہ حرمین کو صرف حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس کے تعلق سے دارالعلوم کا لقب حاصل ہوا۔ حرمین تو اصحاب و اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مجمع رہا۔ کوفہ میں چند روز حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رہے اور حرمین ان لوگوں کا اصل مرکز تھا۔ علاوہ ازیں خلفائے راشدین و ازواج مطہرات و اہل بیت اور ہزاروں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں رہے۔ ایسی حالت میں کوفہ اور حرمین کا علم میں موازنہ کرنا کمال درجے کی خیرہ چشمی ہے۔" (۲)

اپنے اس فرمان کے اثبات میں مولانا رحیم آبادی' حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی مشہور تصنیف مصفی شرح موطا کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کے (صفحہ ۶) کی مندرجہ ذیل عبارت نقل فرماتے ہیں۔

"مدینہ مشرفہ در زمان او پیشتر از زمان متاخر بے شبہ مرجع فضلا و محط رجال علما بودہ است' و زمانے بعد مفتیان عظیم الشان کہ ہمہ عالم را قبلہ توجہ علم ایشاں بود پیدا شدند۔"

یعنی مدینہ منورہ حضرت امام مالک کے زمانے سے پہلے سے مرجع فضلا اور مرکز علما تھا۔ ہر زمانے میں وہاں ایسے عظیم القدر مفتی پیدا ہوتے رہے ہیں' جن کا علم پوری دنیا کے اصحاب علم کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

۱۔ حسن البیان ص ۱۴۱۔ ۲۔ حسن البیان ص ۱۴۲۔

فقیہ اور غیر فقیہ صحابہ

یہاں ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ مولانا شبلی نے صحابہ کرام کو جو فقیہ اور غیر فقیہ (دو حصوں) میں تقسیم کیا ہے' کیا یہ تقسیم قرین صحت ہے؟ یہ بات تو لائق التفات ہے کہ بعض صحابہ کثیر الفتویٰ تھے اور بعض قلیل الفتویٰ تھے' لیکن یہ کہنا کہ چند صحابہ تو فقیہ تھے اور دوسرے غیر فقیہ تھے' قطعاً لائق اعتنا نہیں۔ کیا فقیہ وہی ہوتا ہے جس نے مدارس میں فقہ کی چند کتابیں پڑھی ہوں اور ان فرضی مسائل کا جو وقوع پذیر نہیں ہوئے رٹا لگایا ہو؟ اور صحابہ نے آج کل کے مدارس کی نصابی کتابیں نہیں پڑھی تھیں اور حنفی مدرسین کی شاگردی میں وہ مسائل یاد نہیں کیے تھے جو ان کتابوں میں درج ہیں' لہٰذا وہ فقیہ نہیں تھے۔ اس پیمانۂ فقاہت میں صحابہ بلاشبہ پورے نہیں اترتے۔

صحابہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا' بعض کو فقیہ اور بعض کو غیر فقیہ کہنا یا بعض کو مجتہد اور بعض کو غیر مجتہد قرار دینا' صحابہ کے مرتبہ عالی کے منافی ہے۔

تیرھواں باب

اہل حدیث اور اہل رائے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نقطۂ نظر سے

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے صحابہ و تابعین کے بعد آنے والے گروہوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک گروہ اہل حدیث کا ہے اور دوسرا اہل رائے کا۔

اہل حدیث کی تگ وتاز

اہل حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

وکان اکبر همهم رواية حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم. [1]

(ان کی بہت بڑی کوشش یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کی جائیں۔)

اس سے چند سطور آگے چل کر فرماتے ہیں۔

فطاف من ادرک من عظمائهم ذلک الزمان بلاد الحجاز والشام والعراق و مصر واليمن وخراسان، وجمعوا الکتب وتتبعوا النسخ وامعنوا فی التفحص عن غريب الحديث و نواد رالاثر، فاجتمع باهتمام اولئک من الحديث والآثار مالم يجتمع لاحد قبلهم. [2]

(پھر اس گروہ کے تمام سربرآوردہ لوگوں نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کے دور دراز بلاد وممالک کے سفر کیے، وہاں جا کر حدیث کی کتابیں

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج۱ ص ۱۴۸۔ ۲۔ ایضاً

لکھیں اور ان کے نسخے ترتیب دیے۔ بے حد تلاش و جستجو کر کے انھوں نے کم یاب احادیث و آثار کا پتا لگایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت کی سعی سے احادیث و آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ اب تک کسی جماعت کے پاس نہیں ہوا تھا اور نہ کسی کی رسائی ان احادیث و آثار تک اس سے قبل ہوئی تھی۔)

اس سے تین سطور آگے شاہ صاحب رقم فرماتے ہیں۔

وظهر عليهم احاديث صحيحة كثيرة لم تظهر على اهل الفتوىٰ من قبل. (۱)

(اور پھر اس جماعت اہل حدیث کو اس درجہ کثرت کے ساتھ احادیث میسر آئیں کہ اس سے پیشتر کسی مفتی اور مجتہد کو میسر نہیں آئی تھیں۔)

حضرت شاہ صاحب کی اس عبارت سے صاف پتا چلتا ہے کہ اصحاب حدیث کے علاوہ جتنے بھی فقہا اور قابل احترام مجتہدین گزرے تھے' ان کے پاس احادیث' ان حضرات سے کم تھیں' جنھیں اہل حدیث کے لقب سے پکارا جاتا تھا' اس لیے کہ ان کا اصل مشغلہ ہی حدیث کی جمع و تدوین تھا چنانچہ شاہ صاحب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں۔

قال الشافعي لاحمد انتم اعلم بالاخبار الصحيحة منا فاذا كان خبر صحيح فاعلموني حتى اذهب اليه. (۲)

(امام شافعی نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ آپ کو صحیح احادیث کا ہم سے زیادہ علم ہے' اس لیے جو صحیح حدیث آپ کو ملے وہ ہمیں بتا دیا کریں تاکہ ہم اس کے مطابق عمل کریں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے تک احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذخیرہ لوگوں کے پاس مکمل نہیں تھا' اسی لیے وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے یہ فرماتے ہیں کہ وہ صحیح حدیث سے انھیں مطلع فرما دیا کریں۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۴۸ ۲۔ ایضاً

ہوسکتا ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ از راہِ انکسار فرمائے ہوں۔ امام احمد ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا اور ۱۲۔ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو فوت ہوئے۔

ان سے پہلے کا زمانہ امام شافعی کا تھا۔ ان کا سن ولادت ۱۵۰ اور سن وفات ۲۰۴ ہجری ہے۔

امام شافعی سے قبل کا دور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے' جن کی ولادت ۹۳ھ میں اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا عہد مبارک اس سے بھی پیشتر کا ہے۔ ان کی پیدائش ۸۰ھ میں ہوئی اور ۱۵۰ھ میں وہ عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ احادیث کی جمع وتدوین کا سلسلہ اگرچہ صحابہ کرام کے زمانے میں شروع ہوگیا تھا' لیکن یہ سلسلہ محدود تھا۔ امام ابوحنیفہ' امام مالک اور امام شافعی کے زمانے میں بھی بہ کثرت احادیث نہیں ملتی ہوں گی۔ البتہ امام احمد بن حنبل کے عہد میں تلاش حدیث کا سلسلہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک تو کوفے میں قیام فرما تھے' دوسرے ان کے دور میں احادیث کی کثرت نہ تھی' لہٰذا انھیں جو "قلیل الحدیث" کہا جاتا ہے' اس کا مطلب ان کی ذات گرامی پر "قلت حدیث" کا الزام عائد کرنا ہرگز نہیں ہے' اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حضرت امام کوفے میں قیام فرما تھے اور کوفے میں امارت وحکومت کے معاملات کے متعلق تو بے شک صحابہ کرام کی آمدورفت رہی تھی' لیکن مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ یا شام کی طرح وہ شہر صحابہ کا ایسا مرکز نہ تھا' جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی تدریس و تعلیم کے حلقے قائم ہوں۔

شاہ صاحب اہل حدیث اور محدثین کی مقدس جماعت کے بہت سے ارکان کا ذکر کرتے ہیں۔ حدیث سے متعلق ان کی مساعی اور تگ وتاز کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ رقم فرماتے ہیں۔

وکان اوسعهم علما عندی وانفعهم تصنیفا واشهرهم ذکرا

رجال اربعة متقاربون فی العصر. [1]

(ان حضرات میں سے سب سے زیادہ وسیع علم والے، سب سے زیادہ مفید ترین کتابوں کے مصنف، سب سے زیادہ مشہور، باہم قریب العہد میرے نزدیک چار شخص ہیں۔)

اس کے بعد شاہ فرماتے ہیں: یہ چار شخص ہیں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب صحیح بخاری کی عظمت کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ولعمری انه نال من الشهرة والقبول له درجة لایرام فوقها. [2]

(بخدا اس کتاب کو جس درجہ شہرت و قبولیت حاصل ہوئی، اس سے زیادہ کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔)

اہل حدیث کے بالمقابل اہل رائے

اہل حدیث کی مساعی جمیلہ کی تفصیل بیان کرنے اور احادیث و آثار میں ان کے بے حد انہماک کا تذکرہ کرنے، صحابہ کرام کے ساتھ ان کے قلبی تعلق اور ان کے طرز عمل کے مطابق ان کے سفر حیات کی تگ و تاز کو معرض تحریر میں لانے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس جماعت کے ارکان رائے و قیاس سے دامن کشاں رہتے تھے اور ان کے فکر و عمل کا انحصار حدیث و سنت پر تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ان کے بالمقابل ایک دوسری جماعت تھی۔

وکان بازاء هؤلاء فی عصر مالک و سفیان وبعدهم قوم لایکرهون المسائل ولایهابون الفتیا، ویقولون علی الفقه بناء الدین فلا بد من اشاعته ویهابون روایة حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم والرفع الیه. [3]

(اور اس جماعت اہل حدیث کے بالمقابل امام مالک، امام سفیان ثوری اور

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج اص ۱۵۱۔ ۲۔ ایضاً ۳۔ ایضاً

ان کے بعد کے زمانے میں ایک دوسری جماعت تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو نہ تو غیر ضروری مسائل دریافت کرنے سے باز آتے تھے اور نہ ان کے جواب دینے میں کوئی جھجک محسوس کرتے تھے' وہ کہا کرتے تھے کہ دین کی اصل بنیاد فقہ ہے' اس لیے اس کی اشاعت کرنا ضروری ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے سے گریز کرتے تھے۔)

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں:

فوقع تدوین الحدیث والفقه والمسائل من حاجتهم بموقع من وجه آخر' وذالک انه لم یکن عندهم من الاحادیث والآثارما یقدرون به علیٰ استنباط الفقه علی الاصول التی اختارها اهل الحدیث ولم تنشرح صدورهم للنظر فی اقوال علماء البلدان وجمعها والبحث عنها واتهموا انفسهم فی ذالک وکانوا اعتقدوا فی ائمتهم انهم فی الدرجة العلیامن التحقیق و کان قلوبهم امیل شئی الی اصحابهم. [1]

(اہل رائے نے اپنی مصلحت کے مطابق دوسرے انداز سے حدیث وفقہ اور مسائل کو جمع کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر احادیث و آثار پر اس درجہ وسیع نہ تھی کہ اہل حدیث کی طرح ان کے پسندیدہ اصول کے مطابق مسائل کا استنباط کر سکیں' ان کے دلوں میں بھی اس قدر وسعت نہ تھی کہ اپنے خاص علاقوں اور شہروں کے علما کے اقوال اور ان کی تصانیف پر تنقیدی نگاہ ڈال سکیں اور اسے موضوع بحث بنا سکیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھا اور اپنے ائمہ کے بارے میں یہ بات ذہنوں میں بٹھالی کہ اب ان

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۲

سے زیادہ کوئی شخص تحقیق نہیں کرسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل تمام امور
سے کٹ کر اپنے ائمہ ہی کی طرف مائل تھے۔)

شاہ صاحب کی اس عبارت سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کو اہل رائے اس لیے کہا گیا کہ ذخیرہ حدیث پر ان کی نظر کم تھی اور مسائل بتانے اور بیان کرنے میں زیادہ محتاط نہ تھے' رائے اور قیاس سے کام لے کر بلا تامل مسائل بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ نقد و جرح سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔۔ اہل حدیث کا انداز ان سے مختلف تھا' وہ حدیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین کی تلاش میں رہتے تھے اور اسی کی روشنی میں بات آگے بڑھاتے تھے۔

چودھواں باب

اہل رائے کی ترقی کا بنیادی سبب۔۔۔حکومت

کسی مذہب یا مسلک کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ عام طور سے حکومت کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاص شان وشوکت کی مالک ہوتی ہے اور نشر واشاعت کے ذرائع اس کے قبضے میں ہوتے ہیں' وہ لوگوں میں عہدے اور منصب تقسیم کرتی ہے۔ یہ تقسیم بعض دفعہ صلاحیت کے مطابق ہوتی ہے اور بعض دفعہ عدم صلاحیت کو بھی صلاحیت کا نام دے دیا جاتا ہے۔

دور گزشتہ کی اسلامی حکومتوں میں علمائے دین کو قضا وافتا کے مناصب عطا کیے جاتے تھے اور عوام ان منصب داروں کے محتاج ہوتے تھے اور یہ محتاجی مذہب ومسلک کی ترقی کا باعث بنتی تھی۔ حنفی مسلک کے زیادہ پھیلاؤ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کان اشھر اصحابه ذکرا ابویوسف رحمه الله فولی قضاء القضاة ایام ھارون الرشید فکان سببالظھور مذھبه والقضاء به فی اقطار العراق و خراسان وما وراء النھر. (۱)

(امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے۔ ان کی وجہ سے یہ مذہب خوب پھیلا اور عراق' خراسان اور ماوراء النہر میں اس کی بے حد اشاعت ہوئی۔)

ہندوستان میں بھی حنفی مذہب کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اس خطۂ ارض میں یہ مذہب

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صفحہ ۱۴۶۔

عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں سے پہنچا۔

اس کے بعض فقہا و مجتہدین کی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نہایت دلچسپ انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

من حفظ المبسوط کان مجتهدا، وان لم یکن له علم بروایة اصلا. (۱)

(جس نے فقہ کی کتاب مبسوط یاد کر لی، بس مجتہد ہو گیا، اگرچہ اسے ایک بھی روایت اور حدیث کا علم نہ ہو۔)

شاہ صاحب کا یہ تجزیہ بالکل مبنی بر صحت اور واقعات کے عین مطابق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرات احناف کے بڑے بڑے مدارس میں جس اہتمام و التزام سے فقہ حنفی کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس اہتمام و التزام سے حدیث کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں۔ کتب فقہ کی تدریس برسوں جاری رہتی ہے اور اس کی ایک ایک جزئی طالب علم کے حلق میں اتاری جاتی اور راسخ کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس حدیث کی کتابوں کا چند مہینوں میں دورہ کرایا اور بات ختم ہو گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اسے موسوم ہی "دورۂ حدیث" سے کیا جاتا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا بھی یہی فرمان ہے کہ فقہ حنفی کی اشاعت حکومتوں کی سرپرستی کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اس کا خاصی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ایک خاص بات یہ ہے کہ عنان حکومت جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی، وہ اکثر حنفی فقہ کے پابند تھے۔" (۲)

کیا سلطان محمود غزنوی حنفی تھا؟

یہاں مولانا شبلی نے مختلف ادوار اور ممالک کے بعض بادشاہوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ حنفی مسلک کے پابند تھے اور ان کی وجہ سے فقہ حنفی کو ترقی کے مواقع میسر آئے۔ ان بادشاہوں میں انھوں نے سلطان محمود غزنوی کا ذکر بھی کیا ہے۔

۱۔ حجۃ البالغہ جلد ۱ صفحہ ۱۵۲ ۲۔ سیرۃ النعمان صفحہ ۱۴۲

بلاشبہ مولانا شبلی بہت بڑے عالم تھے اور اسلامی تاریخ کے مختلف گوشوں پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ لیکن محمود غزنوی کی حنفیت کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اصل واقعات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔۔۔ اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وسعت مطالعہ کے باوجود اس موضوع کے حقائق مولانا کی نظر سے اوجھل رہے ہیں یا ان حقائق کو انھوں نے کسی خاص وجہ سے جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اگر دوسری صورت ہے تو اسے تاریخ نویسی کے دیانت دارانہ اصول کے مطابق نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی واقعہ کی تعبیر اپنے بنیادی فکر کی روشنی میں کی جائے، لیکن اصل واقعہ کی بالکل نفی کر کے اسے یکسر دوسرے انداز میں بیان کیا جائے، یہ مورخ کی شان کے شایاں نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی ابتدا میں حنفی مسلک کا حامل تھا۔ لیکن بعد میں اس نے حنفیت ترک کر دی تھی۔ اس کی تفصیل تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں، امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی نے مغیث الخلق فی ترجیح القول الحق میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے مسلک حنفی کیوں ترک کیا۔

ان حضرات نے لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں علماے حنفیہ اور علماے شافعیہ کثیر تعداد میں جمع تھے۔ ایک مرتبہ قفال مروزی نے ان علما کی موجودگی میں سلطان کے سامنے پہلے شافعی مسلک اور پھر حنفی مسلک کے مطابق نماز پڑھی۔ امام شافعی کا مذہب چوں کہ ظواہر حدیث سے مطابقت رکھتا ہے، اس لیے سلطان اس سے نہایت متاثر ہوا اور اس نے حنفیت ترک کر کے شافعیت قبول کر لی۔[1]

سلطان محمود غزنوی کا ذکر حاجی خلیفہ نے بھی اپنی کتاب کشف الظنون میں کیا ہے۔ اس کی ایک تصنیف کا ذکر بھی کیا ہے، جس کا نام "التفرید" تھا اور وہ حنفی فقہ کے مسائل پر

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مغیث الخلق فی ترجیح القول الحق صفحہ ۵۷ تا ۵۹۔۔۔ وفیات الاعیان جلد ۴ صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۹۔

مشتمل تھی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان پہلے حنفی تھا' پھر شافعی ہو گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کے مطالعہ کے لیے یہاں حاجی خلیفہ کی پوری عبارت درج کر دی جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

التفريد في الفروع. للسلطان محمود بن سبكتگين الغزنوى الحنفي ثم الشافعي. المتوفى سنة اثنتين وعشرين واربع مائة. قال الامام مسعود بن شيبة كان السلطان المذكور من اعيان الفقهاء وكتابه هذا مشهور في بلادغزنة وهو في غاية الجودة وكثرة المسائل ولعله نحو ستين الف مسئلة وفي التاتا رخانية نقول منه. ولما رائى ان المذهب الشافعي وافق لظوا هر الحديث تشفع بعد ان جمع علماء المذهبين' كما ذكره ابن خلكان.[1]

(التفریدفی الفروع۔ سلطان محمود بن سبکتگین غزنوی حنفی ثم شافعی کی تصنیف ہے جو ۴۲۲ھ (۱۰۳۱) کو فوت ہوا۔ امام مسعود بن شیبہ کا کہنا ہے کہ سلطان کا شمار مشاہیر و اکابر فقہا میں ہوتا تھا۔ اس کی یہ کتاب غزنہ کے علاقے میں بہت مشہور ہے۔ عمدگی اور کثرت مسائل میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کتاب تقریباً ساٹھ ہزار مسائل پر مشتمل ہے۔ فتاویٰ تا تارخانیہ میں اس سے مسائل درج کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ ابن خلکان نے (وفیات الاعیان میں) ذکر کیا ہے' سلطان محمود غزنوی نے' شافعی اور حنفی دونوں مکاتب فقہ کے مجمع علما میں جب یہ سمجھا کہ شافعی مذہب' ظواہر حدیث سے زیادہ موافق ہے تو اس نے شافعی مذہب اختیار کر لیا۔)

اس عبارت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی پہلے حنفی مسلک کا حامل تھا' بعد میں اس سے الگ ہو گیا تھا۔ ''طبقات الشافعیہ'' میں اس کا تذکرہ اکابر شوافع

۱۔ کشف الظنون جلد ا کالم ۳۲۶۔

کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

حاجی خلیفہ نے سلطان کی کتاب ''التفرید'' کو ساٹھ ہزار مسائل پر مشتمل قرار دیا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے' یہ کہاں تک صحیح ہے' بہ ظاہر یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے مسائل کے شمار میں کوئی صاحب غلطی کا شکار ہو گئے ہوں۔

کیا محمود غزنوی اہل حدیث تھا؟

سلطان محمود غزنوی کے مسلک کے بارے میں افغانستان اور سرحد کے علمائے کرام اور اصحاب تاریخ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ وہ مسلک اہل حدیث کا حامل تھا۔ بعض مواقع پر اس نے مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے حضرات کو سفارتی ذمے داریاں بھی تفویض کیں۔ چنانچہ جب ایلک خاں نے ماوراء النہر کا علاقہ آل سامان کی گرفت سے آزاد کرایا اور وہ مملکت خراسان پر قابض ہوا تو اس کی اطلاع اس نے محمود غزنوی کو دی۔ محمود غزنوی نے اس پر بے حد مسرت کا اظہار کیا اور اپنے دربار کے ایک نہایت معزز اور اہل علم رکن شیخ ابوالطیب سہل بن سلیمان صعلوکی کو جو اہل حدیث مسلک کے حامل تھے' ایلک خاں کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا اور ان کے ہاتھ مختلف قسم کے قیمتی تحائف ارسال کیے۔ اس سلسلے میں فرشتہ کے الفاظ لائق ملاحظہ ہیں۔

> ایلک خاں ماوراء النہر یک باراز آل سامان متخلص گردانیدہ' وفتح نامہ بہ سلطان محمود فرستادہ۔ اور ابہ استیلاے مملکت خراسان تہنیت گفت' بنا براین میان ہر دو بادشاہ بناے دوستی ویگانگی استحکام پذیرفت' وسلطان محمود نیز ابوالطیب سہل بن سلیمان صعلوکی را کہ از ائمہ اہل حدیث بود بہ رسم رسالت پیش ایلک خاں فرستادہ۔[1]

> (ایلک خان نے جب خاندان سامان کے قبضے سے ماوراء النہر کا علاقہ آزاد کرایا اور خراسان پر فتح حاصل کی تو فتح نامہ تہنیت سلطان محمود کی خدمت میں ارسال کیا' جس کے نتیجے میں دونوں بادشاہوں کے درمیان اتحاد و دوستی کی

۱۔ تاریخ فرشتہ جلد ۱' صفحہ ۴۰۔

بنیادیں مستحکم ہوگئیں۔ اس کے جواب میں سلطان محمود نے ابوالطیب سہل بن سلیمان صعلوکی کو جو کہ اہل حدیث کے جلیل القدر علما میں سے تھے' اپنا سفیر اور پیغام رساں مقرر کر کے ایلک خاں کے پاس بھیجا۔)

مولانا شبلی کی لغزش

مولانا شبلی نعمانی کا شمار عربی اور فارسی کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم اور مصنف ہیں' مشہور مورخ اور سیرت نگار۔۔۔! لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ تاریخ اور رجال کی بعض ایسی کتابیں ان کے پیش نگاہ نہیں ہیں' جن کے بغیر اس راہ میں چند قدم چلنا بھی مشکل ہے۔ وہ سلطان محمود غزنوی کو حنفی قرار دیتے ہیں' لیکن تاریخ فرشتہ کے اس مقام کا مطالعہ نہیں فرماتے' جس میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اور وہ عبارت ان کی نظر سے اوجھل رہی جو ابھی قارئین کے مطالعہ میں آئی ہے۔ عربی رجال کی مشہور کتاب وفیات الاعیان بھی ان کے سامنے نہیں ہے۔ طبقات الشافعیہ کا' جس میں ممتاز شوافع کا ذکر کیا گیا ہے' وہ کہیں حوالہ نہیں دیتے۔ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون بھی جس میں ہر موضوع کی کتابوں اور ان کے مصنفوں کا ذکر مناسب تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے' غالباً مولانا کی نظر سے نہیں گزری۔ پھر مغیث الخلق فی ترجیح القول الحق پڑھنے کا بھی شاید انھیں موقع نہیں ملا' جس میں سلطان محمود غزنوی کے دربار میں اس کے سامنے شافعی اور حنفی علما کی موجودگی میں قفال مروزی کے نماز پڑھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر سلطان نے شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا۔

یہ سب قدیم کتابیں ہیں اور کئی سو سال پہلے کی تصنیف شدہ ہیں۔ تاریخ و رجال کے موضوع پر کام کرنے والے وہ اہل علم جو عربی اور فارسی سے آشنا ہیں' ان کتابوں کی طرف رجوع کرنا اور ان سے استفادہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا شبلی نے صرف اسی مقام پر ٹھوکر نہیں کھائی' بہت سے مقامات پر ان سے لغزش علمی ہوئی ہے۔ سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری (دو) جلدیں ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں جو ان کی وفات کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے نظر ثانی کر کے شائع کیں۔ ان میں

بھی متعدد مقامات پر مولانا سے چوک ہوئی ہے۔ سید صاحب نے ان میں سے بعض مقامات کی نشان دہی کی اور بعض کی طرف عنان توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ اسی طرح ''الفاروق'' میں بھی بعض مقامات پر ان سے تسامح ہوا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ سلطان محمود غزنوی نے یکے بعد دیگرے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور اس کے حکمرانوں کا نہایت جرأت مندی سے مقابلہ کیا۔ اسی کے زمانے میں لاہور فتح ہوا۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا' جس نے لاہور پر حملہ کیا اور اس شہر پر اسلامی پرچم لہرایا۔

اور اب غیاث الدین غوری

سلاطین غزنویہ کی یمینی سلطنت کے خاتمے کے بعد غوری برسر اقتدار آئے' جنھوں نے ہندوستان پر باقاعدہ حکومت کی۔ غوری خاندان میں سلطان غیاث الدین غوری اور شہاب الدین غوری بڑے بہادر اور مدبر حکمران گزرے ہیں اور انھیں ہندوستان کے عظیم مسلمان فاتحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ غیاث الدین غوری بڑا تھا اور شہاب الدین چھوٹا۔۔۔! اس زمانے میں غور کے زیادہ تر مسلمان فرقہ کرامیہ [1] سے تعلق رکھتے تھے' یہ دونوں بھائی بھی اسی فرقے سے منسلک تھے۔ لیکن سلطان شہاب الدین غوری تخت غزنی پر متمکن ہوا تو اس نے حنفی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

رہا غیاث الدین غوری کا معاملہ' تو اس کے متعلق قاضی منہاج سراج رقم طراز ہیں کہ وہ شافعی مذہب سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک شافعی مذہب قرآن و حدیث سے ہم آہنگ تھا اور اس کے ماننے والوں کو اہل حدیث یا اصحاب حدیث بھی کہا جاتا تھا۔

۱۔ فرقہ کرامیہ کے بانی کا نام ابوعبداللہ محمد بن کرام تھا۔ یہ شخص ۲۵۵ھ میں فوت ہوا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان صرف اقرار باللسان کا نام ہے' اس کے لیے عمل بالجوارح اور یقین بالقلب کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اللہ انسانوں کی طرح جسم رکھتا ہے اور عرش کے اوپر اس کی ایک مخصوص جگہ ہے۔ کہتے ہیں کہ فرقہ کرامیہ قول و عمل میں بدعت اور اسلام کی ایک درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا۔ منقول ہے کہ ہزاروں غیر مسلم محمد بن کرام کے اس فرقے میں شامل تھے۔ (طبقات ناصری جلد ۱ طبقہ ۱۷' صفحہ ۳۶۲)

قاضی منہاج سراج نے اس کے شافعی مسلک قبول کرنے کا دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ "وہ اور قاضی وحید الدین محمد مروزی' امام شافعی کی اقتدا میں نماز پڑھ رہے ہیں۔"

یہ نہایت مختصر خواب ہے۔ اس سے دوسرے دن سلطان غیاث الدین غوری نے قاضی موصوف کو وعظ و تذکیر کے لیے دربار میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ وہ تشریف لائے اور وعظ شروع کیا تو وہی خواب بیان کیا جو گزشتہ رات سلطان نے دیکھا تھا۔ سلطان اس سے بہت متاثر اور متعجب ہوا کہ دونوں نے اتفاق سے ایک ہی وقت میں ایک ہی قسم کا خواب دیکھا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے شافعی مذہب اختیار کر لیا۔

اس باب میں قاضی منہاج سراج کے اصل الفاظ کا مطالعہ کیجیے۔

اما سلطان غیاث الدین طاب ثراہ شبے در خواب دید کہ او با قاضی وحید الدین مروزی رحمۃ اللہ علیہ کہ بر مذہب اصحاب حدیث بود و مقتدائے شفعیان' در یک مسجد بودندے' ناگاہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ در آمدے' در محراب رفتے و تحریمہ نماز پیوستے۔ و سلطان غیاث الدین و قاضی وحید الدین ہر دو بہ امام شافعی اقتدا کردندے۔ چوں از خواب در آمد' سلطان فرمان داد تا بامداد قاضی وحید الدین در بارگاہ تذکیر فرمودند۔ چوں بر بالائے کرسی رفت در اثنائے سخن گفت کہ اے بادشاہ اسلام! ایں داعی دوش خوابے دیدہ است' و عین خوابیکہ سلطان دیدہ بود' باز گفت۔ او ہم بہ مثل آں دیدہ بود کہ سلطان چنداں کہ از کرسی فرود آمد' بر بالا رفت و بخدمت سلطان' در حال سلطان دست مبارک قاضی وحید الدین بہ گرفت و مذہب امام شافعی رضی اللہ عنہ قبول کرد۔ چوں نقل سلطان بہ مذہب اصحاب حدیث شافعی شد' بر دل علمائے مذہب محمد بن

کرام حمل آمد۔(۱)

(یعنی سلطان غیاث الدین غوری نے (اللہ اس کا بہتر ٹھکانا کرے) ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ قاضی وحیدالدین مروزی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کہ اہل حدیث میں سے تھے اور شافعیوں کے مقتدیٰ تھے' ایک مسجد میں بیٹھے ہیں۔ اچانک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے' محراب میں گئے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلطان غیاث الدین اور قاضی وحیدالدین دونوں نے امام شافعی کی اقتدا میں نماز پڑھی۔۔۔ جب سلطان نیند سے بیدار ہوا تو اس نے دربار میں وعظ و نصیحت کے لیے قاضی وحیدالدین کو طلب کیا۔ وہ وعظ کے لیے اپنی نشست پر بیٹھے تو اثنائے گفتگو میں فرمایا اے بادشاہ اسلام! میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔(وہ خواب انھوں نے بیان کیا تو) بالکل وہی خواب تھا جو سلطان نے دیکھا تھا۔ چنانچہ سلطان نے ان سے کہا کہ اس نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا ہے۔ بعدازاں سلطان نے قاضی وحیدالدین رحمۃ اللہ علیہ کا دست مبارک پکڑا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک قبول کر لیا۔ جب سلطان مذہب اہل حدیث اختیار کر کے مسلک امام شافعی سے وابستہ ہو گیا تو ان علما کو یہ بات سخت ناگوار گزری جو محمد بن کرام کے مذہب کے حامل تھے۔)

یہ واقعہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں ۵۹۵ھ کے حوادث کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ ابن اثیر کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

''اسی سال (یعنی ۵۹۵ھ) میں حاکم غزنہ غیاث الدین غوری اور بعض باشندگان خراسان نے مذہب کرامیہ ترک کر کے شافعی مذہب اختیار کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سلطان غیاث الدین غوری کے مصاحبوں میں ایک شخص

۱۔ طبقات ناصری جلد ا' طبقہ ۱۷' صفحہ ۳۶۲۔

مبارک شاہ تھا۔ وہ شخص شیخ وحید الدین ابوالفتح محمد بن محمود مروزی کو' جو ایک شافعی فقیہ تھے' سلطان کے پاس لے گیا۔ انھوں نے سلطان کے سامنے مذہب شافعیہ کی خوبیاں بیان کیں اور کرامیہ مذہب کے نقائص کی نشان دہی کی۔ اس سے متاثر ہو کر سلطان نے شافعی مذہب قبول کیا اور پھر شوافع کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے لیے کئی مدرسے قائم کیے۔''

۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) میں غوری سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ تاریخ میں ان سلاطین کو معزی سلاطین کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے' سلاطین شنسبانیہ بھی کہا جاتا ہے' ملوک غور سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ سلطان غیاث الدین تغلق بھی مسلک اصحاب حدیث یا اہل حدیث کا حامل تھا' جو ایک صاحب علم حکمران تھا۔ یہ سلطان ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں تخت ہند پر متمکن ہوا اور پانچ سال حکومت کرنے کے بعد ربیع الاول ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو وفات پا گیا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے محمد خاں تغلق نے ملک کی زمام اقتدار ہاتھ میں لی۔ وہ بھی عالم و فاضل اور متدین و متواضع بادشاہ تھا۔[1]

محمد خاں تغلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا مرکز عقیدت قرار دیتا تھا' چنانچہ حضرت امام کے ایک مشہور شاگرد شیخ عبدالعزیز اردبیلی اس کے زمانے میں ہندوستان آئے جو حدیث و فقہ کے جلیل القدر عالم تھے اور بادشاہ ان سے بے حد متاثر تھا۔ ان کے مشورے اور تبلیغ و تجویز سے بادشاہ نے ملک میں بہت سی دینی اصلاحات جاری کیں اور غیر اسلامی رسوم و رواج کا خاتمہ کیا۔[2]

محمد خاں تغلق نے چھبیس سال ہندوستان پر حکومت کی اور ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کو اس کا انتقال ہوا۔

۱۔ ملاحظہ ہو قاضی محمد بن علی شوکانی کی تصنیف البدر الطالع۔ جلد ۲' صفحہ ۱۸۰۔

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۲' صفحہ ۶۷۔

اس کے بعد اس ملک کا حکمران فیروز شاہ تغلق ہوا‘ جس نے صالحیت وتقویٰ شعاری میں بڑی شہرت پائی اور بدعات ومحدثات کو ختم کرنے کی مہم چلائی‘ جس میں وہ کامیاب رہا۔ اس نے سنتالیس سال حکومت کی اور ۱۳۔رمضان المبارک ۷۹۹ھ (۱۰جون ۱۳۹۷ء) کو وفات پائی۔

سلطان محمود غزنوی‘ غیاث الدین غوری‘ غیاث الدین تغلق‘ محمد خاں تغلق اور فیروز شاہ تغلق کی مثالیں مولانا شبلی نعمانی کے جواب میں دی گئی ہیں‘ جن کا فرمان ہے کہ ہندوستان کے تمام بادشاہ حنفی تھے اور حنفی مسلک کو بادشاہوں کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا۔۔ان مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کئی مشہور اور بڑے بادشاہ حنفی نہیں تھے۔ مولانا نے جن کو حنفی قرار دیا ہے‘ انھوں نے حنفیت ترک کر دی تھی اور شافعی یا اہل حدیث ہو گئے تھے۔کتب تاریخ میں ان کی تبدیلی مسلک کی وضاحت وہیں کی گئی ہے‘ جہاں ان کی حنفیت کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن مولانا نے ”سیرۃ النعمان“ میں یا کسی اور کتاب میں ان کی شافعیت کا ذکر نہیں کیا‘ صرف حنفیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

کیا حکومت سے وابستگی عالی مرتبے کی دلیل ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومت کے ایوانوں سے وابستگی اور ارباب اقتدار سے تعلق کو وجہ فضیلت یا عالی مرتبے کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔۔۔! حکومت کے معاملات اور ہیں‘ اہل علم کے اور ہیں۔ اہل علم اور اصحاب حدیث نے کبھی ارباب اقتدار کے دروازوں پر دستک نہیں دی‘ وہ ہمیشہ اس سے دور رہے ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ ہارون الرشید سے قرب پیدا کیا اور اس کے نتیجے میں اس نے حضرت امام سے ”فقہی نوعیت“ کے جو کام لیے‘ وہ فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہیں اور اس کی تفصیل متعدد کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔ ہارون الرشید بڑے کھلے دل کا اہل علم حکمران تھا۔ وہ حضرت امام ابو یوسف کے ارشاد فرمودہ ”مسائل فقہیہ“ پر نہایت مسرت کا اظہار کرتا اور اپنے ہر من پسند مسئلے پر انھیں انعام واکرام سے نوازتا تھا۔

اس کی بارگاہ خلافت میں قاضی القضاۃ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہوتا تو کہتا۔

هذا لا یعزل ابدا.

(انھیں اس منصب سے کبھی معزول نہیں کیا جائے گا۔)

اب بھی حکومتوں کا یہی طرز عمل ہے۔ ان کے ارکان اعلیٰ عدالتوں کے بعض ججو
سے بہت خوش رہتے ہیں اور بعض سے انتہائی ناراض۔۔۔!

اسی طرح علمائے کرام کے بارے میں بھی ان کا یہی اسلوب فکر ہے۔ بعض آمرقسم
کے حکمران ان علما کو بے حد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے اور انھیں کئی قسم کی منفعت سے
نوازتے ہیں جو ان کی تائید کرتے اور ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ وہ صحیفہ نگار اور اخبار نویس
بھی ان کے درباروں میں قدرومنزلت کے مستحق قرار پاتے ہیں جن کے قلم ان کی مد
سرائی میں متحرک رہتے ہیں۔ اور جو ان پر صحت مندانہ تنقید کرتے اور واقعات کی اصل
تصویر ان کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک معتوب گردانے جاتے ہیں او
مختلف طریقوں سے انھیں پریشان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پندرھواں باب

مسئلہ تقلید

اب ہم مسئلہ تقلید کے متعلق چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تقلید کیا ہے اور اس پر عمل کا سلسلہ کب شروع ہوا۔؟

تقلید کی تعریف اور اس کے معنے

اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ تقلید کا لفظ کس چیز پر بولا جاتا ہے اور اس کی تعریف کیا ہے اور اس کے کیا معنے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں یہاں چند جلیل القدر اصحاب علم کی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱. **التقلید' العمل بقول الغیر من غیر حجة.** [۱]

(تقلید اس عمل کا نام ہے جو کسی غیر کے کہنے پر بلا دلیل کیا جائے۔)

۲. **التقلید' العمل بقول غیرک من غیر حجة.** [۲]

(تقلید' وہ عمل ہے جو تم کسی غیر کے کہنے پر کسی دلیل کے بغیر انجام دو۔)

۳. **التقلید' ھوقبول قول بلاحجة ولیس من طریق العلم لافی الاصول ولافی الفروع.** (اصول فقہ خضری ص ۳۵۷)

(تقلید یہ ہے کہ کسی کا قول بلا دلیل قبول کر لیا جائے' وہ قول اصول وفروع میں طریق علم سے نہ ہو۔)

۴. **التقلید' اعتقاد الشیئی لان فلانا قالہ ممالم یقم علی صحة قولہ برھان.** (احکام۔ ابن حزم ص ۴۰)

(تقلید یہ ہے کہ کسی بات کو محض اس لیے مرکز عقیدت قرار دے لیا جائے کہ

۱۔ مسلم الثبوت ج ۲' ص ۳۵۰۔ ۲۔ مختصر ابن حاجب ص ۲۳۱۔

یہ فلاں شخص کا فرمان ہے' جب کہ اس کی صحت کی بنیاد کوئی دلیل نہ ہو۔)

ان تمام اقوال سے یہ بات مترشح ہوئی کہ تقلید اس اطاعت واقتدا کو کہا جاتا ہے جو بلا دلیل و برہان کسی بزرگ یا امام کی کی جائے۔ انسانوں میں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واقتدا ہی کسی دلیل اور حجت کے بغیر کی جاسکتی ہے۔ یہ کہنا قطعاً قرین صواب نہیں کہ چوں کہ فلاں امام اور عالم عظیم شخصیت کے مالک ہیں' بہت پڑھے لکھے ہیں اور کوئی مسئلہ ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہے' اس لیے وہ جو کچھ فرمائیں' اسے بلا کسی دلیل کے تسلیم کر لینا چاہیے۔

کوئی شخص ایسا نہیں جو تمام علوم پر حاوی ہو اور شرعی اعتبار سے پیش آنے والے ہر مسئلے پر اس کی نگاہ ہو۔ مسائل شرعی میں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو حجت مانا جائے گا اور آپؐ کے ارشادات ہی کو لائق اطاعت گردانا جائے گا۔ آپ کے اقوال و ارشادات کے مقابلے میں کسی امام اور بزرگ کی بات کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔ یہ محض خوش فہمی اور حسن ظن ہے کہ فلاں شخص تمام مسائل پر عبور رکھتا ہے۔ یہ بات ہرگز لائق تسلیم نہیں۔ عین ممکن ہے بعض مسائل اس کے ذہن کی گرفت اور علم کی حدود میں نہ ہوں' اس لیے مسائل کا خود بھی کھوج لگانا چاہیے۔ تحقیق و تفحص انسان کی فطرت میں داخل ہے' کتاب وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس سے بہرصورت کام لینا ضروری ہے۔ اپنے آپ کو جمود و تعطل کے سپرد کر دینا علم کی غربت اور تحقیق کے افلاس کی علامت ہے۔

کسی ایک ہی دائرے میں محدود ہو جانا اور سمٹ جانا حق کی فطرت کے خلاف ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ حق فلاں نقطۂ فکر کی چار دیواری کے اندر بند ہے' اس سے باہر کی دنیا حق سے محروم ہے' وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے اور حق کا مذاق اڑاتا ہے۔

یہاں ہم استاد محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے چند سطور مستعار لیتے ہیں۔ وہ ''تقلید کا لفظ کب استعمال ہوا؟'' کے عنوان کے تحت رقم فرماتے ہیں۔

''سنن دارمی' عقد الجید' حجۃ اللہ البالغہ' دراسات اللبیب' میزان شعرانی' بیان العلم وفضلہ ابن عبدالبر وغیرہ کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس کا یہ استعمال جو

اب کیا جا رہا ہے صحابہ کرام اور ائمہ اربعہ کے زمانے میں نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

لایقلدن رجل رجلا فی دینه ان امن امن وان کفر کفر.

یعنی کوئی شخص اپنے دین کے معاملے میں کسی شخص کی اس طرح تقلید نہ کرے کہ وہ ایمان لایا تو یہ بھی ایمان لائے گا' اگر اس نے انکار کیا تو یہ بھی انکار کرے گا۔

امام احمد کا بھی یہی فرمان ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

لاتقلدنی ولاتقلدن مالکا ولا الاوزاعی وخذالاحکام من حیث اخذوا. (۱)

یعنی نہ میری تقلید کرو اور نہ امام مالک اور اوزاعی کی تقلید کرو' وہیں سے احکام لو جہاں سے انھوں نے لیے۔

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقلید کا لفظ اس وقت کسی خوش گوار انداز میں استعمال نہیں ہوا۔'' (۲)

مولانا کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور امام احمد نے تقلید سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ یعنی اس زمانے میں یہ لفظ مستعمل تو تھا لیکن دینی معاملات میں اس پر عمل کرنے سے روکا جاتا تھا۔

تقلید نہیں' تحقیق

فکر و فقہ کی تاریخ کے دروازے پر دستک دی جائے تو ہم بہت سے ان عالی مرتبت اصحاب فضل سے متعارف ہوں گے جو اپنے آپ کو بعض ائمہ فقہ کی طرف منسوب تو بے شک کرتے ہیں' لیکن متعدد مسائل میں اپنے امام فقہ سے اختلاف کا اظہار بھی فرماتے ہیں اور بربنائے تحقیق کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ائمہ کی طرف انتساب کے باوصف ہم ان کے لیے ان معنوں میں ''تقلید'' کا لفظ استعمال نہیں کریں گے' جن معنوں میں بالعموم یہ لفظ

۱۔ عقد الجید' ص ۵۳۔ ۲۔ تحریک آزادی فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۱۲۳۔

استعمال کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا فرمان ہے:

''تقلید کی مصطلح تعریف کے مطابق ایسے بزرگوں کو مقلد کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا' بلکہ یہ رجحان تقلید سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔''

''مختصر الطحاوی میں ایسے بہت سے مسائل ملتے ہیں جن میں طحاوی نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف فرمایا ہے' معانی الآثار میں بھی اس کے کافی نظائر موجود ہیں۔''(۱)

اس سے آگے بہ صورت مثال حضرت مولانا چند اور معروف اصحاب فضل کے اسمائے گرامی تحریر فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

''علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ' علامہ کاشانی مولف البدائع والصنائع' علامہ سرخسی' قاضی خان' نسفی' ابن قدامہ' ابن تیمیہ' علامہ ابواسحاق' ابراہیم بن علی بن یوسف صاحب مہذب' اسی طرح زرقانی اور باجی' ابن رشد اور شاطبی وغیرہم سب اپنے ائمہ کے مذاہب کے بارے میں روایت اور درایت کو پیش نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے طریق استدلال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے' مگر ان کے محقق ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس روش کے بعد انھیں اصطلاحاً کیوں کر مقلد کہا جاسکتا ہے؟ اور مقلد کی تعریف ان پر کیسے صادق آئے گی۔؟'' (۲)

غیر مقلد' بہ صورت طنز

بہت سے مقلد حضرات کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اہل حدیث کو ''اہل حدیث'' کہنے کے بجائے ''غیر مقلد'' کہہ کر یاد فرماتے ہیں۔ ''اہل حدیث'' کا لفظ تحریر کرتے وقت ان کے قلم میں لکنت آجاتی ہے اور بولتے وقت زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ اپنی دانست میں یہ حضرات طنز بہ صورت میں ان کے لیے یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اہل حدیث

۱۔ تحریک آزادئ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی' ص ۱۲۳۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۲۴۔

کو ان کا غیر مقلد کہنا واقعہ کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ غیر مقلد ہیں۔ تقلید میں آخر کون سی ایسی خوبی ہے، جسے اپنایا جائے۔ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر عمل کرنا ضروری ہو بلکہ جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا صحابہ کرام اور ائمہ عظام نے اس سے روکا ہے، اس لیے کہ اس کا علم وفکر سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ سوچ بچار کی صلاحیتوں سے دست برداری کا اعلان اور فہم مسائل میں دلیل وثبوت کو نظر انداز کر دینے کی علامت ہے۔

چنانچہ امام ابن قیم فرماتے ہیں۔

قال ابوعمرو وغيره من العلماء اجمع الناس على ان المقلدليس معدودا من اهل العلم وان العلم معرفة الحق بدليله، وهكذا كما قال ابوعمرو رحمة الله عليه فان الناس لايختلفون ان العلم المعرفة الحاصلة عن الدليل امابدون الدليل فانما هو التقليد.[1]

(ابوعمرو (ابن عبدالبر) وغیرہ اہل علم کا کہنا ہے کہ علما اس امر پر متفق ہیں کہ مقلد کا شمار اہل علم کے گروہ میں نہیں ہوتا۔ علم کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے کہ انسان کو دلیل کے ساتھ معرفت حق حاصل ہو۔۔۔ اس ضمن میں ابوعمرو (ابن عبدالبر) رحمۃ اللہ علیہ کی بات عین حقیقت پر مبنی ہے۔ اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ علم اس معرفت حق ہی کو کہا جاتا ہے جو دلیل کی بنیاد پر قائم ہو، اگر دلیل کے بغیر ہو تو اسے تقلید کہا جائے گا۔)

امام ابن قیم کا اس سلسلے میں ایک اور اندراج ملاحظہ ہو۔

لايجوز الفتوىٰ بالتقليد لانه ليس بعلم والفتوى بغير علم حرام. ولاخلاف بين الناس ان التقليد ليس بعلم وان المقلد لايطلق عليه لفظ العالم، وهو قول اكثر الاصحاب و قول جمهور الشافعي.[2]

(اکثر اہل علم اور جمہور شافعی علما کا قول ہے کہ تقلید سے فتویٰ جاری کرنا جائز

۱۔ اعلام الموقعین ج ۱ ص ۷۔ ۲۔ ایضاً ص ۱۶۔

نہیں‘ اس لیے کہ مقلد عالم نہیں ہوتا اور فتویٰ بغیر علم کے نہیں دیا جا سکتا۔)

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے‘ امام غزالی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

انما شان المقلد ان یسکت اویسکت عنه. [۱]

(مقلد کا معاملہ یہ ہے کہ علمی معاملات میں یا تو وہ خود خاموش رہے یا اس کی بات پر خاموشی اختیار کی جائے۔)

گستاخ کون؟

بعض مقلد حضراتِ علما کو تقلید سے اس درجہ محبت اور تعلق خاطر ہے کہ وہ مقلد کہلانے کو اپنے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک دین کی بنیاد شاید اسی پر قائم ہے۔ وہ بڑی تحدی اور قطعیت کے ساتھ غیر مقلدوں کو گستاخ قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کا اپنا کردار اور اپنا عمل ہے‘ اس کے متعلق انھیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جن لوگوں کو اس قسم کے الفاظ کہنے اور دوسروں کو مطعون ٹھہرانے کی عادت پڑ گئی ہے‘ وہ ہرگز اس سے باز نہیں آئیں گے۔ لیکن اگر فہم وفراست کا کوئی شمہ ان میں موجود ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ درحقیقت گستاخ کون لوگ ہیں‘ وہ جو اخذ مسائل کے لیے براہ راست کتاب وسنت سے تمسک کرتے‘ آیات قرآن اور حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حجت مانتے اور اسی کو حرف آخر قرار دیتے ہیں یا وہ حضرات جو قرآن وسنت کے بجائے بربنائے تقلید کسی امام فقہ کا تتبع کرنے پر مصر ہیں؟ اگر ایک طرف احکام الٰہی اور ارشادات پیغمبر ہیں اور دوسری طرف قول امام ہے تو وہ قول امام کو ترجیح دیتے ہیں‘ حالاں کہ امام واضح الفاظ میں اعلان فرماتے ہیں کہ حدیث صحیح کے مقابلے میں ان کے قول کو نہ مانا جائے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی تحریر فرماتے ہیں۔

انه روی عن ابیؔ حنیفة رضی الله عنه انه کان یقول: لاینبغی لمن

۱۔ تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۱۲۵۔

لم يعرف دليلي ان يفتي بكلامي' وكان رضي الله عنه اذا افتى يقول هذا راى النعمان بن ثابت. يعني نفسه وهوا حسن ماقدرنا عليه فمن جاء باحسن منها فهو اولىٰ بالصواب. [۱]

(حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کسی مسئلے میں میری پیش کردہ دلیل کا علم نہیں رکھتا' اسے میرے قول کے مطابق فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ امام صاحب فتویٰ جاری کرتے وقت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ یہ نعمان بن ثابت کی (یعنی میری) ذاتی رائے ہے اور ہماری طاقت کے مطابق بہترین رائے ہے، جو شخص اس سے بہتر بات لائے تو وہ درست ہونے کے زیادہ لائق ہے (یعنی اس کو ماننا زیادہ قرین صواب اور اولیٰ ہے)

اب حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ملاحظہ فرمایئے۔ ان کا ارشاد شاہ صاحب ان الفاظ میں درج کرتے ہیں۔

وكان الامام مالك رضي الله عنه يقول: مامن احد الاهو ماخوذ من كلامه و مردود عليه الا رسول الله صلى الله عليه وسلم. [۲]

(امام مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو بات کسی سے لی گئی ہے' وہ اس پر لوٹا دی جائے گی' لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہمیشہ قائم اور قابل عمل رہے گا۔)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت شاہ صاحب رقم طراز ہیں۔

روى الحاكم والبيهقي عن الشافعي رضي الله عنه انه كان يقول اذا صح الحديث فهو مذهبي وفي رواية اذا رايتم كلامي يخالف الحديث فاعملوا بالحديث واضربوا بكلامي الحائط. [۳]

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۷۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

(امام حاکم اور امام بیہقی نے امام شافعی رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی مسئلے میں جب صحیح حدیث مل جائے تو سمجھ لو کہ یہی میرا مذہب ہے۔

ایک روایت میں فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ میرا کلام حدیث کے خلاف ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو دیوار پر دے مارو۔)

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول پہلے گزر چکا ہے' یہاں ایک اور قول پڑھتے جائیے۔

وکان الامام احمد رضی الله عنه یقول: لیس لاحدمع الله ورسوله کلام.[1]

(امام احمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں کسی کی بات قابل حجت اور لائق تسلیم نہیں۔)

ائمہ کرام کے ان واضح ارشادات کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''گستاخ'' کا اطلاق کن لوگوں پر ہوگا؟ ان لوگوں پر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو لائحہ عمل ٹھہراتے ہیں یا ان پر جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقابلے میں ائمہ کرام کے اقوال کو لائق عمل قرار دیتے ہیں؟

ایک اور بات

شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات حجۃ اللہ البالغہ' عقد الجید اور تفہیمات وغیرہ میں مسئلہ تقلید پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو بات کتاب وسنت اور آثار صحابہ یا تابعین وتبع تابعین کے اعمال واقوال سے واضح ہو جاتی ہے' اسی کو عمل کی بنیاد بنایا جائے گا' اسے چھوڑ کر کسی امام فقہ کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ ائمہ فقہ نے اپنی تقلید سے لوگوں کو روکا ہے اور خیر القرون میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے کسی صحابی کی یا کسی تابعی نے کسی تابعی کی تقلید کی ہو۔ شاہ صاحب تقلید کے سلسلے میں امام ابن حزم کے حوالے سے ایک نہایت عجیب وغریب نکتہ بیان فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۷

وایضا فما الذی جعل رجلا من هؤلاء اومن غیرهم اولی ان یقلد من عمر بن الخطاب اوعلی بن ابی طالب او ابن مسعود او ابن عمر او ابن عباس او عائشة ام المومنین رضی الله تعالیٰ عنهم' فلو ساغ التقلید لکان کل واحد من هولاء احق بان یتبع من غیره. (۱)

(یہاں یہ بھی یادر ہے کہ ان میں سے یا ان کے علاوہ دوسروں میں سے کون ہے جو عمر بن خطاب' علی بن ابی طالب' عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ بن عباس یا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے افضل و بہتر ہو۔ اگر تقلید جائز ہوتی تو ان میں سے ہر شخصیت کو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس کی تقلید کی جاتی۔)

لیکن یہاں تو صورت حال بالکل مختلف ہے اور تقلید کا سلسلہ قطعی طور سے ختم ہے۔ مسائل کی تحقیق اور استفتا و افتا کا سلسلہ زمانہ نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاری ہے۔ آنحضرت کے بعد صحابہ کرام اور پھر تابعین و تبع تابعین قرآن و حدیث کے مطابق مسائل بتاتے تھے اور ان مسائل کو صحیح تسلیم کیا جاتا تھا۔ تقلید کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

تقلید کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں امام عزالدین بن عبدالسلام کی ایک عبارت درج کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ومن العجب العجب ان الفقهاء المقلدین یقف احدهم علی ضعف مأخذ امامه بحیث لایجد ضعفه مدفعا وهومع ذالک یقلده فیه ویترک من شهد الکتاب والسنة والا قیسة الصحیحة لمذهبهم جمودا علیٰ تقلید امامه بل یتخیل لدفع ظاهر الکتاب والسنة ویتا ولها بالتاویلات البعیدة الباطلة نضالا عن مقلده. (۲)

(عجیب تر بات یہ ہے کہ مقلدین فقہا کو اپنے امام کے کم زور دلائل کا پتا چل

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۵ ۲۔ ایضاً

جاتا ہے، جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا، لیکن اس کے باوجود اس مسئلے میں وہ اسی کی تقلید کرتے ہیں اور ان لوگوں کے نقطہ نظر کو ترک کر دیتے ہیں جو کتاب وسنت اور قیاسات صحیحہ سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ وہ اپنے امام کی تقلید کو چھوڑنا نہیں چاہتے اور ہر صورت میں اس پر جمے رہتے ہیں۔ کتاب وسنت کے ظاہر مطلب سے دور رہنے کی غرض سے وہ بہت سی تاویلیں کرتے اور اپنے امام کی مدافعت کے لیے کئی قسم کی بے بنیاد اور دور از کار تاویلوں سے کام لیتے ہیں۔)

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ منسوب بہ حنبلیت تھے، لیکن بہت بڑے مجتہد تھے۔ وہ بعض اہم مسائل میں فقہ حنبلی کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کا نقطہ فکر یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب وسنت کی نص کو دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا۔ پھر اجماع و قیاس سے کام لیا جائے گا۔ نص کے ہوتے ہوئے تقلید پر قائم رہنا، ان کے نزدیک قرآن کی رو سے اتباع ظن اور خواہشات نفس کی پیروی ہے۔[۱]

اصطلاحی تقلید کی تاریخ

اب اس مسئلے کی طرف آیے کہ اصطلاحی تقلید کا آغاز کب ہوا؟

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک کسی امام یا کسی ایک فقہی مذہب کی تقلید کا رواج نہیں تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ میں **باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة وبعدها.** کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

اعلم ان الناس كانوا قبل المائة الرابعة غير مجمعين على التقليد الخالص لمذهب واحد بعينه.[۲]

(یہ بات خوب جان لو کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگ کسی ایک خاص اور

۱۔ فتاوی شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ج ۲ ص ۳۸۵

۲۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۲

معین مذہب کی تقلید نہیں کرتے تھے۔)

اس سے آگے شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

انهم كانوا في المسائل الاجتماعية التي لااختلاف فيها بين المسلمين اوجمهور المجتهدين لايقلدون الاصاحب الشرع.[1]

(ان اجتماعی مسائل میں، جن میں عام مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، لوگ صرف صاحب شریعت (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقلید واتباع کرتے تھے۔)

شاہ صاحب اس سے آگے مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

واذا وقعت لهم واقعة استفتوا فيها اىّ مفت وجدوا من غير تعيين مذهب ، وكان من خبرالخاصة انه كان اهل الحديث منهم يشتغلون بالحديث فيخلص اليهم من احاديث النبى صلى الله عليه وسلم و آثار الصحابة مالا يحتاجون منه الى شئى آخر.[2]

(اگر کوئی اہم واقعہ پیش آ جاتا تو عام لوگ اس کے متعلق جو مفتی بھی انھیں میسر آتا اس سے فتویٰ طلب کرتے۔ رہے علما تو جو ان میں اہل حدیث ہوتے وہ حدیث سے شغف رکھتے تھے، انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آثار صحابہ کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ تھی۔)

ایک سوال

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب چوتھی صدی ہجری تک کسی معین امام فقہ کی تقلید نہیں کی جاتی تھی اور مسائل کے لیے براہ راست کتاب وسنت سے رجوع کیا جاتا تھا تو اس کے بعد تقلید کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی؟ پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی گزارش ہے کہ جب بعض حضرات کے نزدیک غیر مقلد ''گستاخ'' قرار پاتے ہیں تو چوتھی صدی ہجری تک کے مسلمانوں کو کیا کہا جائے گا؟ کیا ان پر بھی اسی لفظ کا اطلاق ہوگا، جس کا اطلاق

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۵۲ ۲۔ ایضاً ص ۱۵۳۔

موجودہ غیر مقلدین پر کیا جاتا ہے؟ کیا انھیں اپنا اسلام ثابت کرنے کے لیے مقلدین حضرات کی بارگاہ تقلید سے سند لینا پڑے گی؟

یہاں یہ یاد رہے کہ امام مالک کے مقلد بھی دنیا میں موجود ہیں' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کی تقلید کرنے والے بھی کہیں زیادہ کہیں کم تعداد میں مختلف علاقوں اور ملکوں میں پائے جاتے ہیں' لیکن اس سلسلے میں سختی کا اظہار کرنا اور غیر مقلدوں کو گستاخی کا سرٹیفکیٹ عطا فرمانا' حضرات احناف ہی کا شیوہ ہے۔ ان کی تقلید میں معلوم نہیں اہل حدیث کے خلاف تشدد کے جراثیم کیوں گھس آئے ہیں۔ ادھر اہل حدیث کا نام لیا اور ادھر ان کی مقلدیت جوش میں آئی۔ اس ضمن میں احناف کے دونوں مکاتب فکر (دیوبندی اور بریلوی) ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

حضرت مولانا تھانوی کا فرمان

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم سے دیوبندی مکتب فکر کے کسی شخص نے پوچھا کہ ہمارے قریب ایک مسجد بریلوی حضرات کی ہے اور ایک اہل حدیث کی۔ ہمیں نماز کس امام کی اقتدا میں پڑھنی چاہیے؟

ارشاد ہوا بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے' اس لیے کہ وہ مقلد ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی

بحمد اللہ اہل حدیث کا دامن اس قسم کے بے جا تشدد سے پاک ہے۔ ان کی نماز ہر امام کی اقتدا میں ہو جاتی ہے۔ وہ اس حدیث پر عامل ہیں جو ابوداؤد کے حوالے سے مشکوٰۃ شریف کے ''باب الامامہ'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصلوٰۃ واجبة علیکم خلف کل مسلم برا کان اوفاجرا.

(یعنی تمھارے لیے نماز باجماعت پڑھنا ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے' وہ

مسلمان نیکوکار ہو یا فاجر۔۔۔!)

کسی حدیث میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ مقلد امام کی تلاش میں نکل کھڑے ہو، اگر مقلد امام کہیں مل جائے تو اس کے پیچھے نماز پڑھو۔ اگر مقلد نہ ملے، غیر مقلد ملے تو اس کے پیچھے نہ پڑھو، اکیلے پڑھ لو۔

حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا طریق عمل

نماز میں امام کی اقتدا کے سلسلے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا فرمان بھی قارئین کرام کے مطالعے میں آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کے الفاظ بھی ہم نے پڑھے۔ اب مسلک اہل حدیث کے بہت بڑے عالم حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق عمل پر غور فرمایے۔ ان کا بہت بڑا حلقہ درس تھا، جس میں دور دراز سے طلبا آ کر تحصیل علم کرتے تھے۔ خاص دہلی شہر میں ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے الگ جمعہ پڑھنا مناسب نہیں سمجھا، وہ بادشاہی مسجد میں حنفی امام کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد احناف کے تشدد اور تعصب کی وجہ سے دہلی میں اہل حدیث اور احناف کے متعدد جمعے قائم ہو گئے۔ (معیار الحق ص ق ر)

یہ واقعہ اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ حضرت میاں صاحب انتہائی روادار اور طبعاً بہ درجہ غایت صلح کل تھے۔ وہ بعض اختلافی مسائل میں نرم رویہ اختیار کرنے کے عادی تھے۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا اور مسائل میں سختی کا مظاہرہ کرنا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ اندازہ کیجیے کہ وہ غیر مقلد ہیں بلکہ غیر مقلدوں کے سربراہ ہیں۔ مگر مقلدوں کی اقتدا میں نماز پڑھتے اور جمعہ ادا فرماتے ہیں۔ اس کے برعکس مقلدین کا کیا نقطہ نگاہ ہے، اس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے نزدیک نماز مقلد کی اقتدا ہی میں پڑھنی چاہیے، اگرچہ اس کی دینی حالت کتنی ہی پست ہو۔ غیر مقلد کی اقتدا سے بچنا چاہیے، بے شک وہ کتنا ہی متدین اور پابند سنت ہو۔ یعنی چوں کہ وہ پابندِ تقلید امام نہیں ہے، محض پابندِ سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، اس لیے اس کی اقتدا میں نماز نہ پڑھی جائے۔

تقلیدی دور

گزشتہ سطور میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ تقلید کا دور چوتھی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ نہ تھا' اس کے بعد تقلید کا رجحان عام ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی فرماتے ہیں۔

> ''پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی فقہیات کو بالکل کتاب وسنت کے برابر سمجھا جانے لگا۔ سائل جب علمائے دین سے شریعت کے متعلق سوال کرتا ہے تو ہمارے ملک کے علمائے کرام بلا تامل ہدایہ' درمختار' شامی اور فتاویٰ عالم گیری وغیرہ کی عبارات لکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے شریعت کی بات بتا دی اور حق ادا کر دیا۔ وہ قرآن وحدیث کا حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتے' بس ایک خاص مکتب فکر کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔''

(معیار الحق مقدمہ ص ک)

حضرت مولانا نے تو ہدایہ اور درمختار کے حوالوں کا ذکر فرمایا ہے' اس فقیر نے قدوری اور اصول شاشی کے حوالے بھی دیکھے ہیں' بلکہ ''پکی روٹی'' کے حوالے بھی دیے جاتے ہیں' جب کہ وہ کچی روٹی بھی نہیں ہوتی۔

اجتہاد کا دروازہ بند

علمائے احناف کے نقطۂ فکر کے مطابق چوتھی صدی ہجری کے بعد تقلید کی وجہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے ایک ترک عالم شیخ حسین آفندی کی کتاب ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے ترکی کے سلطان عبدالحمید کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب کا نام ہے **''رسالہ حمیدیہ فی حقیقۃ الدیانۃ الاسلامیہ''**... اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اب لوگوں کی ہمتیں ٹوٹ گئی ہیں' عزائم ختم ہو گئے ہیں' سوچ بچار کی قوتیں جواب دے گئی ہیں اور ذہنوں میں پستی آ گئی ہے' لہٰذا اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں۔

ولكن من عصر اربع مائة من الهجرية النبوية على صاحبها از كى الصلوٰة والسلام قال بعض العلماء الا علام كما ينقل من علماء الحنفية ان باب الاجتهاد قد انسد من ذالك التاريخ. (رساله حميديه فى حقيقة الديابة الاسلاميه ص ۳۲۸)

(چوتھی صدی ہجری نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تاریخ سے بعض جلیل القدر علماے حنفیہ کے فرمان کے مطابق اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔)

مطلب یہ کہ جو مسائل پیدا ہونا تھے، وہ چوتھی صدی ہجری تک پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی ایسا نیا مسئلہ پیدا نہیں ہو گا جس پر سوچنے کی ضرورت پڑے۔ پہلے ائمہ کرام نے جو کچھ سوچ لیا اور جس مسئلے کی جو تشریح کر دی، بس وہی کافی ہے، مزید سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔

چوتھی صدی ہجری کو گزرے ہوئے ایک ہزار سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ اس اثنا میں امت مسلمہ بے شمار مسائل سے دو چار ہوئی اور ہر لحہ نئے سے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہوں گے۔ کیا ان پر غور و فکر کے لیے اجتہاد سے کام نہ لیا جائے اور سوچ بچار کے دروازوں پر قفل چڑھا دیا جائے؟ یہ وہ نقطہ نظر ہے جس کی کوئی باشعور آدمی تائید نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ دینی مسائل کو سمجھنے اور شرعی معاملات پر غور کرنے کے لیے ائمہ اہل سنت نے چار بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) قرآن۔ (۲) سنت۔ (۳) اجماع امت۔۔۔اور (۴) قیاس۔

جب تک قرآن مجید موجود ہے، سنت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دور دورہ ہے، اجماع امت اور قیاس کو اہمیت حاصل ہے، اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے گا، تقلید و جمود کے ذریعے اس بنیادی ضرورت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

کسی امام یا فقیہ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ امام یا مجتہد ہیں اور فلاں صدی تک ان کے اجتہاد کو ماننا ضروری ہے، اس کے بعد تقلید کا دور شروع ہو جائے گا۔ پھر ان کی تقلید میں مصروف ہو جانا اور غیر مقلدوں اور اجتہاد کے حامیوں کو تنقید کا نشانہ بنا لینا۔ اگر یہ کرو گے

تو بیڑا پار ہے اور جنت کے دروازے تمھارے لیے وا ہیں۔

مالکی، شافعی اور حنبلی بھی مقلد ہیں۔ مالکی امام مالک کی تقلید کرتے ہیں، شافعی امام شافعی کی اور حنبلی امام احمد کی۔ لیکن ان میں سے کسی کو تقلید کا اتنا شوق نہیں جتنا حضرات احناف کو ہے۔ نہ وہ اس طرح زور اور تسلسل سے غیر مقلدوں کو ہدف طعن ٹھہرانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں، جتنا حنفی علمائے کرام دیتے ہیں۔ حنفی علمائے کرام کی بہت بڑی خدمت دین یہ ہے کہ اہل حدیث کو رگیدا جائے، کبھی غیر مقلد کہہ کر، کبھی گستاخ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بزرگوں کے منکر کہہ کر، کبھی نجدی اور وہابی کہہ کر۔

تاریخ کا ایک ورق

گزشتہ سطور میں ہم نے کتاب وسنت پر عمل کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکارِ عالیہ کا مطالعہ کیا اور تقلید کے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ بھی ہمارے علم میں آیا۔ اس ضمن میں حضرت استاذ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور کے بعض اقتباسات بھی ہماری نظر سے گزرے۔ مسئلہ تقلید کی بحث کے سلسلے میں حضرت مولانا سلفی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

> ''ائمہ اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ولادت اور وفات کے سنین پر غور کیا جائے تو ۸۰ ہجری سے شروع ہو کر امام احمد کی وفات ۲۴۰ ہجری تک یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان ایام کے بعد برسوں اس جمود اور تقلید کا پتا نہیں چلتا جسے آج کل واجب کہا جا رہا ہے اور اس سے اعراض کو بے دینی وغیرہ القاب سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پر اظہار فخر یا اس کی طرف دعوت کسی صورت میں بھی چوتھی صدی ہجری سے پہلے نہیں ہو سکتی۔
>
> فتح ہند سے قبل پہلا لشکر جو ساحل ہند پر اترا، اس وقت ان مروجہ مذاہب کا نام ونشان نہ عرب میں تھا نہ عجم میں۔ تقلید ائمہ کے موجودہ انداز سے ذہن بالکل خالی تھے۔
>
> ہند پر پہلا حملہ ۹۳ ہجری میں ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں

ہوا۔[1] عرب میں تو اس وقت تابعین کی کثرت تھی' ائمہ اربعہ کا خیال بھی اس وقت ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ خراسان' ایران اور فارس میں ان دنوں ائمہ حدیث کی کثرت تھی۔ احادیث کا حفظ وضبط اور نقل وروایت ان حضرات کا محبوب مشغلہ تھا۔ حدیث کی جمع وتدوین کے اس دور میں ائمہ کی (موجودہ) فقہوں کا احساس بھی کسی کو نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے فتوے بلا تخصیص وتعیین اہل علم کی نظر میں تھے۔ تقلید کا اس وقت شائبہ تک نہ تھا۔ اسلامی قلمرو کے تمام گوشوں میں یہی مسلک پایا جاتا تھا' جسے آج کل ہم اہل حدیث کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔[2]

مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطہ نظر

اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) نے بھی اپنے اسلوبِ خاص میں اس موضوع کو شائستہ التفات ٹھہرایا ہے اور جن الفاظ میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے وہ لائق مطالعہ ہیں۔ جی چاہتا ہے خوانندگان محترم مولانا کے افکار عالیہ سے بھی مستفید ہو جائیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

کتبِ فقہ وواقعات وفتاویٰ وحوادث کی بے شمار تفریعات ومحدثات فقہیہ میں' جن سے قدما وائمہ کو کوئی تعلق نہیں' مگر بے تکان لکھ دیا جاتا ہے کہ كذا عندابی حنيفة و كذاعندفلان ۔ اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی کسی قرار دادہ اصل کی بنا پر یہ تفریع ہے اور فلاں اصل جو ہم نے ان کی ٹھہرالی ہے' اس کی بنا پر یہ جزئیہ متفرع ہوتا ہے۔ حالانکہ تفریع خود ان کی ساختہ وپرداختہ ہے اور امام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی

۱۔ حضرت مولانا کی مراد دربارِ خلافت کی طرف سے باقاعدہ اور بھرپور حملے سے ہے جو ۹۳ء ہجری میں محمد بن قاسم کی قیادت میں ہوا۔ لیکن اس سے ۷۸ سال قبل ۱۵ ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کے زیر کمان حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ کے عہد خلافت میں تھانہ کی بندرگاہ پر بحری حملہ ہو چکا تھا' جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔

۲۔ تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۲۱۰۔۲۱۱۔

تخریج در تخریج، وتفریع در تفریع، وقیاس در قیاس، واستنباطاتِ رائیہ چند در چند، واقتاع برمجرد قواعدِ منطقیہ جزئیات وکلیات وتمثیل وتقسیم، وابعد بعدوا ہجر ہجرا اصلین اساسین کتاب وسنت کی مصیبت عظمیٰ ورزیتِ کبریٰ ہے جس کی وجہ سے قرنا بعد قرنٍ ونسلاً بعد نسلٍ سخت وشدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں اور کارخانہ شرع میں فسادِ عظیم رونما ہوا۔ ازاں جملہ یہ کہ ناواقف عند ابی حنیفۃ دیکھ کر دھوکا کھا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ فرع امام ابوحنیفہ کا بعینہٖ مذہب ہے۔ جب مسئلۂ عشر فی العشر' اور تحریم اشارہ فی التشہد' وکراہتِ رفع الیدین عندالرکوع' وکراہتِ آمین بالجہر' واقتداے خلف مخالف' وعدمِ وجوب طمانیہ' ووجوب لزوم وتعین وغیرہ کی نسبت صاف دیکھ رہے ہیں کہ صریح تصریحات کتب اصول وموطا وجامع وغیرہ کے خلاف لکھا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض کوتاہ آستینانِ فقاہت کی درازدستیاں یہاں تک بڑھیں کہ رفع الیدین عندالرکوع اور اشارہ فی التشہد کو فعل کثیر کہتے ہوئے بھی نہ شرمائے' تو پھر اور باتوں کے لیے ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون تھا؟

درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں![1]

اس سے آگے مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

حتیٰ کہ بعض دانش مندوں نے تو ایک ہی قاعدہ بنا کر سارے جھگڑے چکا دیے:

اذا كان في المسئلة قول لابي حنيفة وصاحبيه وحديث يحكمون بصحته، وجب اتباع قولهم دون الحديث ' لانا نظن بابي حنيفة وصاحبيه انهم عارضوا الحديث مع صحته وصحة الاستنباط .

(یعنی اگر کسی مسئلے میں حدیثِ صحیح ایک طرف ہو اور دوسری طرف اس کے خلاف امام ابوحنیفہ اور صاحبین (امام ابویوسف اور امام محمد) کا قول تو واجب ہے کہ حدیث کو چھوڑ دیا جائے اور قول امام ہی کی پیروی کی جائے' کیونکہ

۱۔ تذکرہ ص ۹۹' ۱۰۰

آخر کوئی بات تو ہوگی جس کی وجہ سے انھوں نے ایسا کیا)

تو کیا یہ قاعدہ بھی اس وجودِ گرامی کا قرار دادہ ہوسکتا ہے، جس نے اپنی ساری عمر مقدس اس صدائے حق کے اعلان و تکرار میں بسر کر دی کہ اترکوا قولی لخبر الرسول ۔ پیغمبر کے مقابلے میں میرا قول ترک کردو۔ اور کیا اس طرح کے قواعد کا ان لوگوں کو گمان بھی گزر سکتا تھا جن کا عقیدہ یہ تھا کہ اذا صح الحدیث فھو مذھبی فاضربوا بقولی الحائط (جب صحیح حدیث تمھیں مل جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو اور میرا قول دیوار پر دے مارو)[1]

مولانا مزید فرماتے ہیں۔

لکھتے لکھتے بات یاد آ گئی۔ ہمارے زمانے کے بعض مشہور ملاؤں کی نسبت بھی خصوصیت کے ساتھ معلوم ہوا کہ اسی حیلۂ زکات پر عمل کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے ایک مولوی صاحب کی نسبت کہ مدرس بھی ہیں، واعظ بھی ہیں اور جدل و مکابرات کے رسائل کے مصنف بھی، بیان کیا کہ وہ ہر سال اپنا اندوختہ بیوی کے نام ہبہ کر دیتے ہیں اور پھر وہ نیک بخت اسی کا ردِ عمل کرتی ہے۔ ان کے استاد جناب مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی نے یہ سنا تو ایسا کرنے سے روکا کہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ تقویٰ تو ایک مزید درجۂ عمل و فضیلت ہے، اس کا یہاں ذکر ہی کیا؟ یوں کہنا چاہیے کہ سرے سے دین و شریعت کے ہی خلاف ہے، اور ایک نہایت غلیظ قسم کا باطنی فسق اور کامل قسم کی یہودیت اور اصحاب السبت کے شجرۂ ضلالت سے پورا پورا استلحاق۔! خیر، دنیا کی زندگی ہے اور دنیا والوں کے احکام و انظار سے مقابلہ، جو جی میں آئے کر لیں، اور ابلیس خادع کی ہر کھولی ہوئی راہ کو صراطِ مستقیم سمجھ لیں، لیکن ایک دن آنے والا ہے، جب نیتوں کے بھیدوں کا جاننے والا اور سرائر و خفایائے قلوب کا دیکھنے والا سامنے ہوگا اور اس وقت یہ ساری مکاریاں اور حیلہ بازیاں جو دنیا والوں کو دھوکا دیتی تھیں، دھری کی دھری رہ جائیں گی۔[2]

۱۔ تذکرہ ص ۱۰۱ ۲۔ تذکرہ ص ۱۰۳

مولانا محمد حنیف ندوی کی ایک تحریر

مولانا محمد حنیف ندوی جماعت اہل حدیث کے جلیل القدر عالم اور بہت بڑے مصنف تھے۔ ان کا انداز نگارش نہایت عالمانہ اور انتہائی دلآویز تھا۔ وہ قدیم و جدید پر گہری نگاہ رکھتے تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) میں بہت عرصہ پیشتر ''اہل حدیث کا تصور دینی'' کے موضوع پر مقالہ لکھا تھا جس میں مسئلہ تقلید کو بھی ہدف نظر قرار دیا تھا۔ اس مقالے کا ایک حصہ جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتا ہے' یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ مولانا ندوی نے ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔۔۔۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اہل حدیث کا تصور دینی جس درجہ سادہ' سمجھ میں آنے والا اور قلب و روح کو حرارت و تپش عطا کرنے والا ہے' یار لوگوں نے اتنا ہی اسے الجھا دیا ہے اور اس کے بارے میں ایسی ایسی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں کہ الامان و الحفیظ۔ سوال کم پڑھے لکھے یا جہال کا نہیں' اچھے خاصے علما کا ہے۔ ان حلقوں میں اگر کسی جانی پہچانی شخصیت کے بارے میں بھی بھولے سے کسی نے یہ کہہ دیا یا لکھ دیا کہ صاحب وہ تو وہابی' غیر مقلد یا اہل حدیث ہے تو نہ پوچھیے صرف اتنا کہہ دینے اور لکھ دینے سے اس سے متعلق طبیعت کس تیزی سے بدل جاتی ہے اور اس کے خلاف نفرت و تعصب کے کتنے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نفرت و تحقیر کا یہ بادۂ تلخ انگریز کے استعماری مصالحہ کے علاوہ' اور کن کن مقدس ہاتھوں سے کشید ہوا ہے؟ اور تہمت طرازی کی اس سازش میں کس کس نے حصہ لیا ہے؟ کن کن عناصر نے اہل حدیث کے خلاف اس نفسیاتی مہم کو چلانے میں کامیاب کردار ادا کیا ہے؟ یہ ایک مستقل اور علیحدہ موضوع ہے جو مخصوص تحقیق و التفات چاہتا ہے۔ کیونکہ ''اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔'' تاہم اتنی بات کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ نفرت کی یہ مہم پورے زور شور اور تنظیم کے ساتھ آج بھی جاری ہے' حالانکہ جماعت اہل حدیث کے عقاید و سرگرمیاں اور کارنامے کوئی چیز بھی تو ڈھکی چھپی نہیں اور کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جس میں اسلامی نظریہ و تصور سے کسی

درجے میں بھی انحراف پایا جائے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم تو معتوب اور مستوجب تعزیر ہی اس بنا پر ہیں کہ ہم فقہ ہو یا کلام، تفسیر ہو یا حدیث، دین کے معاملے میں ادنیٰ انحراف کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارا سیدھا سادا عقیدہ یہ ہے کہ حق وصداقت کو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول ہی میں محصور ومنحصر مانو اور سعی وعمل یا فکر وعقیدے کا جب بھی کوئی نقشہ ترتیب دو تو تابش وضو کے لیے اسی آفتاب ہدایت کی طرف رجوع کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انسانی کے لیے سراج منیر ٹھہرایا ہے۔

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهِ وَ سِرَاجًا مُنِيْرًا. (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

(اے پیغمبر ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور خدا کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن!)

یہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہم کسی طرح بھی تاریخی ارتقا کے منکر نہیں اور زمانے کے ناگزیر تقاضوں کے تحت فقہ وکلام کے سلسلے میں ہمارے ہاں جلیل القدر علما اور آئمہ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان سے ذرہ برابر صرف نظر کو ہم جائز تصور نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کی فکری وآئینی کاوشیں، امام شافعیؒ کے اصول فقہ وحدیث کے معرکے، امام مالک کا اصحاب مدینہ کے تعامل کو دست برد زمانہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا اور امام احمد بن حنبلؒ کی جمع حدیث کی وسیع تر کوششیں، ہماری تہذیبی انفرادیت کا زندہ ثبوت ہیں اور یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جن پر ہم جس قدر بھی فخر وناز کریں کم ہے۔

ہم حق کو ان سب مدارس فکر میں جن کی ان بزرگوں نے بنیاد رکھی، دائر وسائر تو مانتے ہیں لیکن محصور ومنحصر کسی میں بھی نہیں جانتے، کیونکہ ہمارے نقطہ نگاہ سے صحت وصواب کی استواریاں غیر مشروط طور پر صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلاً ٥ (النساء: ۵۹)

(اے ایمان دارو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور صاحب امر کی جو تم میں سے ہو، اور اگر تم میں کسی چیز پر تنازع ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ یہ انجام کے لحاظ سے بہتر ہے۔)

ہمارے عقیدے کی رو سے استدلال و تاویل کا یہی دو چیزیں نقطۂ آغاز ہیں اور یہی نقطۂ آخر۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ سورہ نساء کی اس آیت کو ہم Preamble یا قانونی اساس سمجھتے ہیں۔ اس آیت ہی کے لب و لہجے میں علما سے کہتے ہیں کہ ہر ہر متنازع فیہ مسئلے میں اول و آخر کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیجیے۔ تقلید و عدم تقلید کی اصطلاح میں پڑے بغیر کہ اس میں قدرے الجھاؤ اور جھول ہے، ہم محبت و وفا کی زبان میں دعویٰ داران عشق رسول سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ خدارا آپ ہی بتایے اگر کسی گروہ نے یہ فیصلہ ہی کر لیا ہو کہ طلب و آرزو کے دامن کو وہ صرف انہی گل بوٹوں سے سجائے گا جو قرآن و سنت کے سدا بہار دبستاں میں نظر افروز ہیں، اور اگر کچھ لوگوں نے از راہ شوق یہی مناسب جانا ہو کہ ان کی نظر اگر کسب ضو کرے گی تو انہی انوار و تجلیات سے جو چہرۂ نبوت کی زیب و زینت ہیں، یا زمان و مکان کے فاصلوں کو ہٹا کر اگر کوئی بے تاب اور متجسس نگاہ اسی جمال جہاں آرا کا براہ راست مشاہدہ کرنا چاہتی ہے جس کی جلوہ آرائیوں نے عشاق کے دلوں میں پہلے پہل ایمان و عمل کی شمعیں فروزاں کیں، تو آیا یہ کوئی جرم، گناہ یا معصیت ہے؟ اور اگر یہ جرم اور معصیت ہے تو ہمیں اقرار ہے کہ ہم وابستگان دامنِ رسالت اور اسیرانِ حلقہ نبوت مجرم اور گناہ گار ہیں۔

تقلید و عدم تقلید کا مسئلہ دراصل فنی و علمی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ٹھیٹھ اسلام کی رو سے ہماری اولیں ارادت کا مرکز کون ہے؟ ہماری پہلی اور بنیادی وابستگی کس سے ہونا چاہیے اور پیش آمدہ مسائل میں، مشکلات کے حل و کشود کے سلسلے میں ہمیں اول اول کس کی طرف دیکھنا چاہیے؟ کتاب اللہ اور سنت رسول کی چشم کشا اور ابدی تعلیمات کی

طرف یا فقہی مدارس فکر کی وقتی اور محدود تعبیرات کی طرف؟ اس سے قطع نظر کہ تقلید سے فکر و نظر کی تازہ کاریاں مجروح ہوتی ہیں اور اس سے بھی قطع نظر کہ اس سے خود فقہ و استدلال کے قافلوں کی تیز رفتاری میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور تہذیب و فن کی وسعتیں، زندگی، حرکت اور ارتقا سے محروم ہو جانے کے باعث حد درجہ سمٹاؤ اختیار کر لیتی ہیں، اصل نقص اس میں یہ ہے کہ اس سے عقیدت و محبت کا مرکز ثقل یکسر بدل جاتا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ ہماری ارادت و عقیدت کا محور و قبلہ اول و آخر کتاب اللہ اور سنت رسول ہے، ہماری عصبیتیں مخصوص فقہی مدارس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور غیر شعوری طور پر قلب و ذہن اس بات کے عادی ہو جاتے ہیں کہ بحث و تمحیص کے مرحلے میں کتاب و سنت سے کسی نہ کسی طرح مسائل کی وہی نوعیت ثابت ہو جو ہمارے حلقے اور دائرے کے تقاضوں کے عین مطابق ہو، حالانکہ اللہ اور رسولؐ سے ربط و تعلق کی کیفیتیں معروضیت (Objectivity) چاہتی ہیں اور اس بات کی مقتضی ہیں کہ ہر مسئلے اور ہر امر میں نقطہ نظر کسی خاص مدرسہ فکر کی تائید و حمایت کرنا نہ ہو بلکہ اس شے کی تصدیق مقصود ہو کہ اخذ و قبول کے لحاظ سے کون سی صورت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے زیادہ قریب تر ہے۔

❀❀❀

سولھواں باب

علم حدیث اور علم اسماء الرجال

محدثین اور اہل الحدیث کی خدمت بوقلموں میں سے ایک خدمت جلیلہ علم اسماء الرجال ہے۔ اس علم کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ کی تبلیغ و اشاعت کے دائرے نے انتہائی وسعت اختیار کی اور یہ سلسلہ دور دراز تک پھیلا۔ علم حدیث اور علم اسماء الرجال دونوں کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم اسماء الرجال حدیث ہی کی وجہ سے عالم وجود میں آیا۔ حدیث کا معاملہ نہایت نازک اور بہ درجہ غایت احتیاط کا متقاضی ہے' اسی لیے اس کے ساتھ ایک سلسلہ اسناد وابستہ ہے' جس سے پتا چلتا ہے کہ اس سلسلے میں کون کون حضرات شامل ہیں اور وہ کس حیثیت کے حامل ہیں' کسی میں کسی قسم کی کوئی کمزوری تو نہیں پائی جاتی' کہیں کسی نوع کا کوئی نقص تو راہ نہیں پا گیا ہے۔ علم میں' عمل میں' گفتار میں' کردار میں' میل جول میں' معاملات میں اور زندگی کے کسی بھی گوشے میں کسی راوی میں کوئی سقم تو نہیں ہے۔ اہل الحدیث نے اس علم کی وساطت سے تمام امور کو مرکز غور وفکر ٹھہرایا ہے اور قبول روایت کی سخت شرائط مقرر کی ہیں۔ اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی ہیں' جن میں ہر پہلو کو منقح کر دیا گیا ہے۔ آئندہ سطور میں اسی کی وضاحت کرنا مقصود ہے۔

حدیث کیا ہے؟

لفظ حدیث کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل یا تقریر پر ہوتا ہے۔ اثر' خبر اور سنت کے الفاظ بھی انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ حدیث کا لفظ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام اور ارشادات کے لیے پسند فرمایا تاکہ آپؐ کے اور دوسرے

لوگوں کے کلام اور اقوال میں امتیاز ہو سکے اور آسانی سے نشان دہی کی جا سکے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اور یہ کسی اور کا قول۔ یہی وجہ ہے کہ دینی روایات کے اس دل آویز اور ضوفشاں ذخیرے کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین پر مشتمل ہے" "حدیث" کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ "علم الحدیث" کہلایا۔

علم اسماء الرجال کے حدود و اطلاق

پھر آگے چل کر علم حدیث میں اس درجہ وسعت اور تنوع پیدا ہوا کہ اس سے متعدد علوم عالم وجود میں آئے اور اس شجرہ طیبہ کی طویل و عریض شاخوں نے گوناگوں اور بوقلموں اصناف علم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور پروان چڑھایا۔ ان علوم میں ایک نہایت بنیادی اور ضروری علم "اسماء الرجال" کا ہے، جس کی علم حدیث کے ساتھ بہ درجہ غایت گہری وابستگی ہے۔ جب ہم حدیث کا لفظ بولتے ہیں تو ذہن بلا کسی ادنیٰ توقف کے فوراً اسماء الرجال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس علم کی کیا تعریف ہے اور اس کے حدود و اطلاق کیا ہیں؟ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ راویان حدیث کے حالات و کوائف سے آگاہی حاصل کرنا اور ان کی سیرت و سوانح اور تراجم و احوال کو معرض بیان میں لانا "فن اسماء الرجال" یا "علم اسماء الرجال" کہلاتا ہے۔

آنحضرتؐ کے فرامین کی تبلیغ و حفاظت کرنے والی اولین جماعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعے پر صحابہ کرام کے عظیم الشان اجتماع میں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: **فلیبلغ الشاھد الغائب**۔ یعنی جو لوگ اس مجمعے میں موجود ہیں، جو میری زندگی کے لیل ونہار سے واقف ہیں، جنھوں نے اپنی آنکھوں سے میرے عمل و کردار کا مشاہدہ کیا ہے اور جانتے ہیں کہ ان کے سامنے میری حیات دنیوی کس انداز کی رہی ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ یہ سب باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس وقت کسی وجہ سے یہاں موجود نہیں ہیں، یا ابھی اس عالم آب و گل میں نہیں آئے، آئندہ

پیدا ہوں گے۔

چنانچہ حضور ﷺ کے جان نثاروں اور آپؐ کے ہر قول و فعل کی حفاظت کرنے والی عالی قدر جماعت نے جنھیں آپؐ کے ''صحابہ'' کہا جاتا ہے' آپؐ کے اس ارشاد کو آویزۂ گوش بنایا۔ یہ مقدس جماعت' شانِ نبوت کی ایک ایک ادائے دل نواز سے نہ صرف واقف تھی' بلکہ اس پر دل و جان سے فریفتہ بھی تھی اور فریضہ رسالت کے تیوروں اور اس کی نزاکتوں سے خوب آگاہ تھی۔

اس طائفہ مقدسہ نے حضور فداہ ابی و امی کے آغاز نبوت سے لے کر آپؐ کے وصال تک کے تمام واقعات' اوامر و نواہی کے سلسلے کی تمام باتیں اور معاملات و عبادات سے متعلق تمام احکام اپنی اولاد' اپنے تلامذہ' اپنے رفقا و احباب اور ملنے والوں کو بلاکم و کاست سنائے۔ صحابہ کرام کے بعد ان کے جن شاگردوں نے اس مسند کو زینت بخشی' انھیں تابعین کہا جاتا ہے' تابعین نے بھی تبلیغ و تدوین حدیث میں بدرجہ غایت گرم جوشی کا ثبوت دیا اور نہایت دیانت کے ساتھ اس امانت کو جو انھیں اپنے اساتذہ یعنی صحابہ عظام سے ملی تھی' اپنے شاگردوں کے حوالے کیا۔ تابعین کے شاگرد تبع تابعین کہلاتے ہیں۔ تبع تابعین نے بھی انتہائی کوشش اور سعی مسلسل سے یہ خدمت انجام دی اور اپنے سے بعد کے حضرات کو اس عظیم الشان دولت دینی سے مالا مال کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و ارشادات کی تبلیغ و حفاظت کرنے والی اس اولیں مقدس جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے روح پرور حالات' آپؐ کے اقوال و معمولات اور اسوۂ حسنہ کو علمائے حدیث کی رفیع المرتبت جماعت نے اس نہج و اسلوب سے محفوظ و مدون کیا کہ دنیا کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ انھوں نے روایات کی مدد سے حضور کے احوال و کوائف اور اعمال و اقوال کا ایک بے مثال گلستاں سجا دیا اور اپنی مساعیٔ جمیلہ سے معرفت و ادراک کا ایک پیکر حسیں لوگوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔

پانچ لاکھ راویان حدیث

جن برگزیدہ ہستیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال کو روایت کیا یا جن شخصیتوں نے انھیں تحریر وکتابت کی سلک میں پرویا اور ان کے تحفظ وتدوین کی خدمت انجام دی' انھیں رواتِ حدیث وآثار کے پُرشکوہ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں صحابہ کرام سے لے کر ان کے زمانے سے بعد کی کئی صدیوں تک کے بزرگانِ دین شامل ہیں۔ مشہور مستشرق سپرنگر کے محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچتی ہے۔ وہ خوش بخت لوگ جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل کیا' ان میں سے کم وبیش بارہ ہزار افراد کے نام اور حالات' صفحاتِ کتب میں پوری آب وتاب کے ساتھ نقش ہیں۔

ان راویوں سے جو روایات مروی ہیں' وہ حدیث کی کتابوں میں جوں کی توں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں میں صحاح ستہ' مسند امام احمد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں اس ذخیرۂ دینی کو اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ پھر سیرت اور مغازی کے موضوع سے متعلق مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں معرض تالیف میں آچکی ہیں۔

روایات واحادیث اور سیرت ومغازی کی جمع وتدوین

سب سے پہلے روایات کی جمع وتدوین کے سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کہنے سے حضرت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مغازی اور سیرت کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی' جو اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ بعد ازاں مغازی اور سیرت کے موضوع سے متعلق کئی کتابیں ضبطِ تحریر میں آئیں۔

حدیث' تفسیر اور سیرت وغیرہ کے سلسلے کا بہت سا مواد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں متعدد صحابہ کی کوشش سے صفحاتِ قرطاس کی زینت بن گیا تھا۔ عہد صحابہ وتابعین میں اس ضمن میں مزید تگ وتاز ہوئی' اور جن لوگوں کے پاس زبانی یا تحریری

صورت میں یہ سرمایۂ بے بہا موجود تھا' ان سے حاصل کر کے انتہائی احتیاط کے ساتھ جمع کیا گیا۔ وہ اس باب میں ہر سنی سنائی بات کو شائستہ التفات نہ گردانتے تھے' کیونکہ ان کے پیش نگاہ ہر وقت حضور کا یہ ارشاد رہتا تھا۔

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع. (مسلم)

یعنی کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کرنا شروع کر دے۔

انھوں نے روایات کے اخذ وقبول کے لیے انتہائی کڑی شرائط وضع کیں اور سخت قسم کے اصول مدون کیے۔

اخذ روایات کے اصول وقواعد

اصحاب حدیث یا اہل الحدیث نے روایات کے اخذ وقبول کے لیے جو اصول وقواعد وضع کیے اور جو پیمانے اور معیار مقرر کیے' ان میں ایک یہ ہے کہ اس راوی کی روایت کو قابل قبول ٹھہرایا جائے جو خود شریک واقعہ اور اس روایت کا راویٔ اول ہے۔ اگر بالفرض وہ خود شریک واقعہ نہیں تو ان تمام راویوں کا سلسلہ محفوظ ہونا ضروری ہے جو شریک واقعہ تک ساری بات پہنچا دیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازم ہے کہ تمام راویان واقعہ کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں۔ اصل واقعہ تک پورے سلسلہ رواۃ میں کہیں انقطاع نہ ہو۔ پھر اس بات کا اہتمام بھی ضروری ہے کہ کامل تحقیق وتفحص کے بعد یہ فیصلہ بھی کر لیا جائے کہ سند میں جن راویوں کے نام لیے جا رہے ہیں' وہ کون لوگ ہیں؟ حفظ واتقان میں ان کا کیا مرتبہ ہے؟ روایت ودرایت میں کس درجے کے حامل ہیں؟ کس قسم کی فہم وفراست کے مالک ہیں؟ ان کی عدالت وصداقت کیسی ہے؟ ثقاہت میں ان کا کیا مقام ہے؟ معاملات میں کس پایہ کے لوگ ہیں؟ عمل وعقیدہ میں ان کا رجحان کیا ہے؟ باریک بین اور دقیقہ رس ہیں یا کند ذہن اور غبی؟ کب پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ عہد شباب کس طرح گزرا؟ زمانہ کہولت کس طرح بسر ہوا؟ شیخوخت اور پیری کی منزلیں کہاں طے ہوئیں اور کس انداز سے ہوئیں؟ تعلیم وتعلم کے مراحل کس نہج سے گزرے؟ کن اساتذہ

سے تحصیل کی؟ طالب علمی کا زمانہ کیسا تھا؟ نشست و برخاست زیادہ ترکن افکاروخیالات کےلوگوں کے ساتھ رہی؟ علم وتحقیق کے کس مرتبے پر فائز تھے؟ شب وروز کس ماحول میں بسر ہوئے؟ رفقا واحباب کس قسم کے تھے؟ دلچسپیوں کا محور کون لوگ تھے؟ مغفل تو نہ تھے؟ خلفا وملوک سے کوئی تعلق رکھتے تھے یا نہیں' اگر رکھتے تھے تو متملق اور خوشامدی تو نہ تھے؟ زہد وعبادت کا کیا حال تھا؟ اعزہ واقارب سے کس قسم کے تعلقات رکھتے تھے؟ متاہل تھے یانہیں؟ توہمات کا شکار تھے یانہیں؟ کسی معاملے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا تھا یا نہیں؟ کوئی راوی سفیہ یا فاتر العقل تو نہیں تھا؟ اگر اسے سفاہت کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا تو اس کی کون سی مرویات دور سفاہت سے پہلے کی ہیں اور کون سی بعد کی؟ اس میں اختلال تھا یانہیں؟ راوی کا تعلق اہل ہوئی یا زنادقہ سے تو نہیں تھا؟ مزاج میں عبوست یا یبوست پائی جاتی تھی یانہیں؟ توازن واعتدال کا کیا حال تھا؟ غرض ہرراوی کے بارے میں اس قسم کی جزئیات اور تفصیلات کی پوری چھان بین کی جاتی تھی۔

یہ تھے وہ پیمانے اور معیار جو مختلف محدثین واہل الحدیث نے قائم کیے اوران کی روشنی میں اخذ وقبول روایت کے اصول مقرر فرمائے۔

راویوں کے مدارج اور طبقات

پھر رواۃ کے مدارج اور طبقات قائم کیے۔ ظاہر ہے بعض راوی ذہانت وفطانت اور فہم وفراست کے بہ درجہ غایت اونچے درجوں پر فائز تھے اور انتہائی دقیقہ رس اور اصحاب عدل وصدق تھے اور بعض حضرات ان اوصاف وکمالات میں کم درجے کے تھے۔ اس کے لیے طبقہ اولیٰ' طبقہ ثانیہ' طبقہ ثالثہ' طبقہ رابعہ وغیرہ کی اصطلاحیں' معرض وجود میں آئیں اور جو کوئی جس طبقے یا درجے کا مالک تھا اس کو اسی چوکھٹے میں موزوں کیا گیا۔

یہ طبقات سند کے اعتبار سے بھی ہیں اور حفظ وعدالت کے اعتبار سے بھی۔

محدثین عالی مقام نے یہ خدمت نہایت دیانت داری اور بلاخوف لومۃ لائم سرانجام دی۔ راویوں کی تدلیس کی وضاحت کی' ان کی مراسیل کی نشان دہی کی اور موقوفات کو صراحت سے بیان کیا۔ راویوں کے ضعف وغرابت کو واضح فرمایا اوران کے

ذہول اور نسیان کو اجاگر کیا۔ ان کے تعصب فی المذہب کو صاف الفاظ میں نمایاں کیا' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور اس میں کھرے کھوٹے کا امتیاز اسی طرح ممکن تھا۔ اس کے علاوہ احادیث کے تحفظ واستناد کی کوئی صورت نہ تھی۔

اگر کسی راوی میں محدثین کی قائم کردہ شرائط پائی جاتیں تو اس کی روایت قبول کر لی جاتی' ورنہ اسے ترک کر دیا جاتا۔ اس ضمن میں یحییٰ بن سعید قطان سے کسی نے کہا:

اما تخشي ان يكون هؤلاء الذين تركت حديثهم خصمائك يوم القيامة ؟

(کیا آپ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ جن لوگوں کی روایت کو آپ نے ترک کیا ہے' وہ قیامت کے روز آپ سے جواب طلبی کریں؟)

اس کے جواب میں ان کے الفاظ یہ تھے۔

لان يكون هؤلاء خصمي احب الي من ان يكون خصمي رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لم لم تذب عن حديثي؟

(یعنی ان لوگوں کی مجھ سے جواب طلبی کرنے سے کہیں بڑھ کر مجھے یہ خوف لاحق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے جواب طلبی کریں اور پوچھیں کہ تم نے میری حدیث کا دفاع کیوں نہیں کیا؟)

روایت حدیث میں اسناد کا التزام

پھر محدثین نے سند کا التزام کیا اور ہر روایت با اسناد بیان کی۔ ان کے نزدیک سند کو دین کے جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہے۔ امام عبداللہ بن مبارک کا قول ہے۔

الاسناد من الدين' لولا الاسناد لقال فيه من شاء بماشاء .

(اسناد کا معلوم کرنا دین کا حصہ ہے۔ اگر اسناد نہ ہو تو پھر ہر شخص دین کے بارے میں جو چاہے بیان کرتا پھرے۔)

عبداللہ بن مبارک مزید فرماتے ہیں۔

بيننا وبين القوم القوائم يعنى الاسناد. [۱]

(ہم میں اور ان واضعین حدیث میں اسناد کا فرق ہے۔ یعنی ہم اسناد کا التزام کرتے ہیں اور یہ لوگ اسناد کی پروا کیے بغیر جو جی چاہے بیان کر دیتے ہیں۔)

راویان حدیث کے حالات وکوائف کی تلاش

رواۃ حدیث کے حالات و کوائف کا علم حاصل کرنے اور ان کو مختلف طبقات و درجات میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں محدثین نے بے پناہ کام کیا اور اس خدمت کی انجام دہی میں عمریں کھپا دیں۔ انھوں نے دور دراز بلاد و امصار کے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، ہزاروں میل کی خاک چھانی، طویل وعریض مسافتیں طے کیں، شہر شہر اور قریہ قریہ گھومے پھرے، راویوں سے ملے اور ان کے بارے میں ہر نوع کی معلومات حاصل کیں۔ جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہیں تھے اور ان سے پہلے وفات پا چکے تھے، ان سے ملنے والوں سے یا ان کے ذریعے سے دوسرے قابل اعتماد لوگوں سے، جو ان کی مقرر کردہ شرائط پر پورا اترتے تھے، ان کے حالات معلوم کیے اور اس طرح وہ عظیم الشان فن معرض وجود میں آیا، جسے ''فن اسماء الرجال'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ فن جو رواۃ حدیث وآثار کے اسماء، القاب، کنیتوں، سوانح حیات، سیرت اور اوصاف کی وضاحت کرتا ہے۔ نیز ان کے بارے میں جرح و تعدیل اور ان کے طبقات و درجات کی تعیین کا آئینہ دار ہے۔ یہی وہ فن ہے جس کے بارے میں معروف مستشرق سپرنگر کا کہنا ہے:

''دنیا میں نہ کوئی قوم ایسی گزری، نہ آج موجود ہے جس نے محدثین کی طرح اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کے حالات معلوم ہو سکتے ہے۔'' [۲]

جن اسلاف کرام نے اس اہم اور بنیادی کام کی تکمیل اور انجام دہی کا بیڑا اٹھایا وہ

۱۔ صحیح مسلم جلد اوّل شرح نووی ص ۱۲۔ طبع نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب، کراچی

۲۔ علامہ شبلی سیرۃ النبی جلد اوّل صفحہ ۳۹ (حاشیہ)

اپنے دور کے نہایت محنتی اور انتہائی مستعد لوگ تھے۔ وہ اس سلسلے میں نہ کسی کے دباؤ میں آئے' نہ کوئی دنیوی حرص وطمع ان کے سدراہ ہوا اور نہ کوئی بڑے سے بڑا مفاد ان کے قلم کی بے پناہ رفتار میں رکاوٹ پیدا کر سکا۔ انھوں نے اپنی اس سعی مسلسل میں حدیث کے بارے میں تمام شبہات کا ازالہ کر دیا اور شک وریب کی کوئی صورت باقی نہیں رہنے دی۔ چنانچہ سمتھ جیسا متعصب مستشرق بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

> ''یہاں سورج کی پوری روشنی جمع ہو گئی ہے' جو ہر چیز پر براہ راست پڑ رہی ہے اور ہر شخص تک پہنچ سکتی ہے۔''

بے شبہ وہ تمام حالات کتب اسلاف میں محفوظ ہو گئے ہیں' جن کا کسی بھی نہج سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے کوئی بھی تعلق تھا۔ ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ محدثین اور اہل الحدیث نے جس لگن اور قلبی تعلق کے ساتھ اس فن کو لائق اعتنا ٹھہرایا اور جس محنت سے اس علم کو معراج کمال تک پہنچایا' اس میں کوئی دوسرا گروہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جرح وتعدیل کے چند ائمہ کرام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تو لاریب سب کے سب عدول وصدوق تھے ہی' لیکن ان کے تلامذہ میں سے اور پھر ان کے تلامذہ کے تلامذہ میں سے بہت سے حضرات نمایاں ہو کر ابھرے' جنھیں رواۃ کے بارے میں جرح وتعدیل کے بہت بڑے امام مانا جاتا ہے' مثلاً بہ ترتیب زمانی ان میں سے بعض ائمہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

سعید بن مسیب' سعید بن جبیر' شعبی' محمد بن سیرین' سلیمان اعمش' معمر' شعبہ' سفیان ثوری' حماد بن سلمہ' لیث بن سعد' امام مالک' عبداللہ بن مبارک' بشر بن مفضل' وکیع بن جراح اور سفیان بن عیینہ۔ رحمھم اللہ اجمعین

فن اسماء الرجال کی کتابیں' تیسری صدی ہجری کے آخر تک

فن اسماء الرجال اور اس سلسلے کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس

موضوع پر سب سے پہلے ابوسعید یحییٰ بن سعید بن فروخ نے کتاب لکھی، ان کی وفات ۱۹۸ھ میں ہوئی، لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے۔ان کے شاگردوں میں یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد سجستانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

اسماء الرجال کے سلسلے میں جو کتابیں دست یاب ہیں، ان میں سب سے پہلے امام بخاری کی تالیفات پر نگاہ ڈالیے جن کے نام یہ ہیں: التاریخ الکبیر، التاریخ الصغیر، الضعفاء الصغیر، کتاب الکنیٰ۔ پھر مختلف حضرات نے ان کتابوں کے ذیول لکھے۔خطیب بغدادی نے الموضح لاوہام الجمع والتفریق کے نام سے تعقب لکھا۔ ابن ابی حاتم نے التاریخ پر استدراک سپرد قلم کیا بعض دیگر حضرات نے بھی یہ خدمت سرانجام دی۔

اس فن میں امام بخاری کے بعد امام مسلم نے کتاب الکنیٰ اور کتاب المتفردات والوحدان تصنیف کیں۔امام مسلم ہی کے زمانے میں احمد بن عبداللہ عجلی نے کتاب الثقات قلم بند کی۔امام نسائی نے کتاب الضعفاء والمتروکین تالیف کی۔ یہ نہایت اختصار کے ساتھ ان چند مشہور کتابوں کا ذکر ہے جو تیسری صدی ہجری کے اوائل تک اسماء الرجال کے فن میں لکھی گئیں۔

اس موضوع پر چوتھی صدی ہجری کی کتابیں

چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر محدثین میں سے جنھوں نے اسماء الرجال پر قابل قدر ذخیرہ چھوڑا، چار بزرگوں کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ان میں ایک محمد بن احمد بن حماد الدولابی ہیں، جو ۳۱۰ھ میں فوت ہوئے اور کتاب الاسماء والکنی تصنیف کی۔اس کتاب میں راویان حدیث کے ناموں اور کنیتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔دوسرے ابن ابی حاتم ہیں جو الجرح والتعدیل کے مصنف شہیر ہیں۔اس کے علاوہ کتاب الکنی اور کتاب المراسیل ان کی تصانیف ہیں، جو اسی موضوع پر مشتمل ہیں۔تیسرے امام دارقطنی ہیں، جنھوں نے ۳۸۵ھ میں وفات پائی اور ضعیف راویوں کے حالات میں کتاب تالیف کی۔اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود ہے۔اسی صدی کے چوتھے بزرگ ابواحمد عبداللہ بن عدی ہیں، جن کا سال

وفات ۳۶۵ھ ہے۔ انھوں نے فن اسماء الرجال پر الکامل فی الجرح والتعدیل کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کتاب کو الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمتروکین کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کا نام الکامل فی معرفۃ الضعفاء والمحدثین بھی لکھا ہے۔ متقدمین کے نزدیک یہ کتاب اپنے فن کی نہایت مقبول اور معروف کتاب ہے جو سات جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

ابو احمد عبداللہ بن عدی کی ایک کتاب اسماء الصحابہ ہے۔ اس کا بھی قلمی نسخہ محفوظ ہے۔

پانچویں صدی ہجری کی کتابیں

اسی فن میں پانچویں صدی ہجری کے آغاز کے ایک مشہور محدث عبدالغنی مقدسی نے' جن کا سن وفات ۴۰۹ھ ہے' الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کی تہذیب وتکمیل یوسف بن ذکی ہزمی نے تہذیب الکمال فی اسماء الرجال کے نام سے کی۔ یہ کتاب بائیس جلدوں پر محیط ہے جو کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ بارہ جلدوں میں ابوعبداللہ علاء الدین المغلطائی بن قلیج نے اکمال تہذیب الکمال کے نام سے اس کا تکملہ لکھا۔ پھر حافظ ذہبی نے اس کی تلخیص کی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بزرگوں نے اس کی تلخیص کی اور بعض نے اس پر اضافے کیے۔

دیار اندلس کے معروف محدث ابن عبدالبر نے صحابہ کرام کے حالات میں ''الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب'' تالیف کی۔ ان کا پورا نام ابوعمرو جمال الدین یوسف بن عمر بن عبدالبر ہے۔ قرطبہ کے اس عالم کو ان کے حفظ واتقان اور وسعت علم کی وجہ سے ''احفظ اہل المغرب'' کہا جاتا ہے۔ ان کا سال وفات ۴۶۳ھ ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے مصنفین اور تصنیفات

اس اہم موضوع کے چھٹی صدی ہجری کے مؤلفین میں سے امام ابن جوزی کی دو کتابیں لائق تذکرہ ہیں۔ ایک کتاب الضعفاء والمتروکین اور دوسری اسماء الضعفاء والواضعین۔ ابن جوزی نے ۵۰۷ھ کو وفات پائی۔ امام ذہبی نے ابن جوزی کی کتاب

الضعفاء والمتروکین کی تلخیص بھی کی اور اس کے دو ذیول بھی قلم بند کیے۔

ساتویں صدی ہجری کی تصنیفات

ساتویں صدی ہجری میں جن ائمہ عظام نے اس بنیادی موضوع کو قابل توجہ ٹھہرایا' ان میں امام نووی کا اسم گرامی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا سال وفات ٦٧٦ھ ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک تہذیب الاسماء اور دوسری المبہمات من رجال الحدیث۔

آٹھویں صدی ہجری کی کتابیں

آٹھویں صدی ہجری کے جن اعاظم رجال نے فن رجال کو ہدف تحریر ٹھہرایا' ان میں بعض حضرات کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں ایک حافظ ذہبی ہیں' جن کا سن وفات ۷۴۸ھ ہے۔ ان کی اس موضوع سے متعلق کم سے کم چھ کتابوں کا پتا چلتا ہے جن کے نام یہ ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ' طبقات الحفاظ' المشتبہ فی اسماء الرجال (اسے مشتبہ النسبۃ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے) المغنی' الکاشف' میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔

دوسرے مشہور مفسر و محدث حافظ ابن کثیر ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالفدا عماد الدین ابن کثیر ہے۔ انھوں نے ۷۷۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ امام ابن تیمیہ کے شاگرد ہیں۔ فن اسماء الرجال میں تکمیل معرفۃ الثقاۃ والضعفاء والمجاہیل' ان کی تصنیف ہے۔

نویں صدی ہجری کا کام

نویں صدی ہجری میں بھی اس موضوع پر بہت کام ہوا۔ اس عہد کے ایک مشہور ماہر فن رجال ابن مزی تھے۔ ان کا پورا نام ناصر بن احمد بن یوسف فرازی بسکری ہے۔ انھوں نے ۸۰۳ھ میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس عالم حدیث نے تاریخ رواۃ حدیث کے بارے میں ایک بہت ضخیم کتاب تصنیف کی تھی' جو سو اجزا کا احاطہ کیے ہوئے تھی' لیکن افسوس ہے یہ کتاب دست برد زمانہ کی نذر ہو گئی۔

اس دور کے مشاہیر مصنفین میں سے ایک حافظ ابن حجر ہیں' جن کا سال ارتحال

۸۵۲ھ ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بڑا کام کیا اور اس سے متعلق قابل قدر کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب، لسان المیزان وغیرہ لائق تذکرہ ہیں۔

دسویں صدی ہجری کی تصنیفات

پھر دسویں صدی ہجری کے بالکل آغاز میں سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے زوائد الرجال علی تہذیب الکمال کے نام سے اس موضوع پر کتاب لکھی۔ اس کے بعد اس باب میں تحقیق وتفحص کا وہ سلسلہ ختم ہوگیا جو پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا تھا۔

حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) نے بھی اس مسئلے کو زیر بحث ٹھہرایا اور کتابیں لکھیں۔

صحاح کے راویوں کے نام اور کنیت وغیرہ کے سلسلے میں

بعض حضرات نے صرف صحاح کے راویوں کے بارے میں کتابیں لکھیں، بعض نے فقط صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے رواۃ پر کتابیں تصنیف کیں۔ بعض نے المؤتلف والمختلف وغیرہ نام کی کتابوں میں راویوں کے آپس میں ملتے جلتے ناموں میں التباس و اشتباہ کو رفع کرنے کی طرف عنان توجہ ملتفت کی اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔ یعنی ایسے رواۃ کا ذکر کیا جو اپنے نام، کنیت، لقب وغیرہ میں سے کسی ایک کے ساتھ مشہور ہیں، لیکن سلسلۂ سند میں ان کا وہ مشہور نام یا لقب یا کنیت وغیرہ نہیں آیا بلکہ غیر مشہور نام یا لقب آ گیا ہے۔ ان کتابوں میں اصل حقیقت کی وضاحت کی گئی ہے۔

پھر "من نسی وحدث" کے موضوع پر بھی کتابیں تصنیف کی گئیں، یعنی کسی شخص نے کسی وقت کوئی روایت بیان کی لیکن بعد میں جب اس کو یہ روایت بتائی گئی تو وہ بھول چکا تھا۔

ایسا بھی ہے کہ کچھ راویوں یا ان کے آباؤ اجداد کے نام یا کنیتیں یا القاب یا نسبتیں باہم ملتی جلتی ہیں۔ اس سے التباس اور اشتباہ پیدا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے بھی محدثین نے مستقل کتابیں تالیف فرمائیں۔

آخری دور کی خدمات

فن اسماء الرجال پر تحقیق کا یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری سے لے کر نویں بلکہ دسویں صدی ہجری تک چلا۔ اس عرصے میں حدیث اور رجال حدیث پر بے پناہ کام ہوا اور مختلف محدثین نے اس میں عمریں صرف کر دیں۔ آخری دور یعنی نویں صدی ہجری میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس موضوع سے متعلق بہت کام کیا۔ اسی اثنا میں ابن مزی' حافظ سخاوی اور امام سیوطی نے اس فن کو مرکز تحقیق و تفحص ٹھہرایا اور واقعہ یہ ہے کہ انہی حضرات پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ان کے بعد رواۃ حدیث پر کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ کوئی شخص اس علم میں اب مزید اضافہ نہیں کر سکتا اور نئی معلومات سے اہل علم کو بہرہ ور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اب نہ وہ دور باقی رہا ہے اور نہ اس پر اضافہ ممکن ہے۔ اس موضوع پر استفادے کے لیے انہی اصحاب حدیث کی تصنیفات سے رجوع کرنا پڑے گا۔ ان کتابوں میں رواۃ کے تراجم اور حالات اور ان کے ذہنی' علمی' فنی اور عملی کوائف کا پوری طرح استیعاب کیا گیا ہے۔

طبقات سے متعلق کتابیں

فن اسماء الرجال نے یہاں تک وسعت اور تنوع اختیار کیا کہ اہل علم نے ہر فن اور ہر مسلک کے رجال پر طبقات کے عنوان سے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً طبقات القراء' طبقات الشعراء' طبقات المفسرین' طبقات الصوفیاء' طبقات الاولیاء'' طبقات الحکماء' طبقات الادباء' طبقات الحنابلہ' طبقات الشافعیہ' طبقات المالکیہ' طبقات الحنفیہ' طبقات الاطباء' طبقات اللغویین والنحاۃ' طبقات الخطاطین وغیرہ۔

اہل الحدیث کی عظیم خدمت

بہرکیف حدیث کے ساتھ فن اسماء الرجال کا گہرا تعلق ہے اور اس پر اہل الحدیث اور محدثین عظام نے جو کام کیا' وہ عدیم المثال ہے۔ دنیا کی اور کسی قوم اور جماعت نے اپنے بزرگوں اور اسلاف کے حالات اس محنت اور جاں فشانی سے جمع نہیں کیے' جس طرح

کہ محدثین نے کیے یہ انھوں نے اپنے اسلاف اور اکابر کے متعلق تمام امور کو مصرح کر دیا ہے اور کھرے کھوٹے کی پوری وضاحت کر دی ہے۔

ان کا بہت بڑا کارنامہ جس پر فخر کیا جا سکتا ہے' یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھان بین اور نقد و تفحص کے سلسلے میں خالص علمی اور تحقیقی انداز کی طرح ڈالی' جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

محدثین کی ان مساعی جمیلہ کے متعلق مشہور مستشرق گولڈ زہیر اپنے انتہائی تعصب کے باوجود یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اہل الحدیث کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے طلب حدیث کے جذبے کے تحت شرق و غرب کا سفر اختیار کیا' اس میں کسی مبالغہ آرائی کا دخل نہیں۔

❀ ❀ ❀

سترھواں باب

اصحاب حدیث اور فقاہت

بعض حضرات نے اصحاب حدیث اور محدثین پر تنقید کو اپنے آپ پر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ ان کا ارشاد گرامی ہے کہ محدثین صرف الفاظِ حدیث کے ناقل تھے' الفاظ کی سطح سے باہر نکل کر معنیٔ حدیث کی تہہ تک پہنچنا اور اس میں سے فقاہت کے چھپے ہوئے جوہر تلاش کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی حیثیت عطار کی سی تھی جس کا کام محض دوائیں جمع کرنا اور فروخت کرنا ہے۔ فقہا کی مثال ان کے نزدیک ماشاء اللہ طبیب کی سی ہے جو مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتے' اس کی بیماری کی تشخیص کرتے اور نہایت محنت اور انتہائی مناسب طریقے سے کنز، قدوری اور پکی روٹی وغیرہ کتابوں سے شفا بخشنے والے نسخے نکال کر مریض کے علاج کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس قسم کے نکتہ رس اور عاقل و فہیم اطبا و حکما حضرات کی خدمت میں ہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی چند عبارتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ان حضرات کی تسلی تو بے شک نہیں ہو گی' جنھوں نے محدثین کے بارے میں ایک نظریہ قائم کر رکھا ہے' لیکن جن کے دل صاف ہیں' امید ہے ان پر بات واضح ہو جائے گی۔ ہمارا کام نہ کسی سے لڑنا جھگڑنا ہے' نہ کسی کو نشانہ طعن یا ہدف تنقید بنانا ہے' ہمارا کام صرف صحیح صورت حال بیان کرنا ہے۔ کوئی اسے مانتا ہے یا نہیں مانتا' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

حضرت شاہ صاحب محدثین و فقہا کی فقاہت کا تذکرہ کرتے ہوئے مصفی شرح موطا میں لکھتے ہیں۔

> باید دانست کہ سلف در استنباط مسائل و فتاوٰی بر دو وجہ بودند۔ یکے آں کہ قرآن و حدیث و آثار صحابہ جمع می کردند و ازاں جا استنباط می نمودند' و ایں

اصل راہ محدثین است۔۔۔ ودیگر آں کہ قواعد کلیہ کہ جمع از ائمہ تنقیح وتہذیب آں گروہ کردہ اند یادمی گیرند بے ملاحظۂ ماخذ آنہا۔ پس ہر مسئلہ کہ واردمی شد جواب آں از ہماں قواعد طلب می کردند' وایں طریقہ اصل راہ فقہا است۔ (۱)

(یہ جان لینا چاہیے کہ سلف امت میں مسائل وفتویٰ کے استخراج واستنباط کے بارے میں دوطریقے رائج تھے۔ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ قرآن وحدیث اور آثار صحابہ جمع کرتے اور انھیں بنیاد قرار دے کر ان کی روشنی میں پیش آئند مسائل کو زیرغور لاتے تھے۔ یہ محدثین کا طریق ہے۔دوسرا طریقہ یہ مروج تھا کہ مسائل کے سلسلے میں جو قواعد کلیہ ائمہ نے واضح اور منقح کر دیے ہیں' انہی کو اصل ٹھہرایا جائے اور انہی کی روشنی میں مسائل وفتاویٰ پر عمل کیا جائے۔ اصل ماخذ (قرآن وحدیث اور آثار صحابہ) کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فقہا کا طریقہ ہے۔)

یعنی جو ائمہ نے فرمادیا' وہ صحیح ہے' اس لیے کہ انھیں تمام مسائل کا علم تھا۔ان سے زیادہ نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ جاننے کی ضرورت ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

كان عندهم انه اذا وجد في المسئلة قرآن ناطق فلايجوز التحول منه الى غيره واذا كان القرآن محتملاً لوجوه فالسنة قاضية عليه فاذالم يجدوا في كتاب الله اخذوا سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم سواء كان مستفيضاً دائرابين الفقهاء او يكون مختصا باهل بلد اواهل بيت اوبطريق خاصة سواء عمل به الصحابةؓ اوالفقهاء اولم يعملوا به' ومتىٰ كان في المسئلة حديث فلا يتبع فيها خلاف اثر من الآثار ولا اجتهاد احد من المجتهدين ' واذا فرغوا جهدهم في تتبع الاحاديث ولم يجدوا

۱۔ مصفی ص ۴

فی المسئلة حدیثاً اخذوا باقوال جماعة من الصحابة والتابعین ولا یتقیدون بقوم دون قوم ولا بلد دون بلد کما کان یفعل من قبلھم، فان اتفق جمھور الخلفاء والفقھاء علی شئی فھوالمقنع، وان اختلفوا اخذوا بحدیث اعلمھم علما واورعھم ورعا اواکثرھم ضبطا اوماشتھر عنھم فان وجدوا شیئاً یستوی فیه قولان فھی مسئلة ذات قولین، فان عجزوا عن ذالک ایضاً تاملوا فی عمومات الکتاب والسنة وایماء اتھما. واقتضاء اتھما وحملوا نظیر المسئلة علیھا فی الجواب. [1]

(یعنی محدثین کا قاعدہ یہ تھا کہ جب وہ کسی مسئلے میں قرآن کو ناطق پاتے تو پھر کسی دوسری طرف عنان توجہ مبذول نہ کرتے، قرآن کے حکم پر عمل فرماتے اور اگر قرآن کا مسئلہ متعدد معانی کا محتمل ہوتا تو پھر حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فیصلہ لیتے۔ خواہ وہ حدیث فقہا میں مشہور ہوتی، خواہ کسی شہر یا لوگوں سے مخصوص ہوتی یا کسی صحابی یا تابعین کے نزدیک معمول بہا ہوتی یا نہ ہوتی۔ جب کسی مسئلے سے متعلق انھیں حدیث دست یاب ہو جاتی تو پھر اس اثر صحابی اور مجتہد کے اجتہاد پر عمل نہ کرتے جو حدیث کے خلاف ہوتا۔ لیکن جب بے حد تلاش و سعی کے باوجود کسی پیش آمدہ معاملے میں حدیث نہ پاتے تو جماعت صحابہ و تابعین کے اقوال پر عمل کرتے، یہ خیال کیے بغیر کہ وہ صحابہ و تابعین کس قبیلے یا شہر یا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بالکل اسی طرح عمل کرتے جس طرح کہ ان سے پہلے لوگوں کا طریق عمل تھا۔ جس مسئلے پر اکثر خلفا و فقہا کا اتفاق ہوتا، اسے لائق اعتماد قرار دیتے۔ اگر ایسا مسئلہ نہ ملتا جس پر خلفا و فقہا متفق ہوتے تو پھر کتاب و سنت کے عمومات و مقتضیات کو زیر غور ٹھہراتے۔ پھر جو بات نص کے نقطہ نظر سے سمجھ

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۹۔

میں آتی' اس کی نظیر کو اس پر محمول کرتے۔)

معلوم نہیں بعض لوگوں کو محدثین سے اتنی چڑ کیوں ہے۔ انھوں نے تدوین حدیث کے اہم مرحلے طے کیے اور احادیث کا عظیم الشان ذخیرہ اہل علم کے لیے جمع کیا' لیکن نہایت افسوس ہے کہ اس کے باوجود بعض لوگوں کے نزدیک یہ معتوب رہے اور انھیں ''فقیہ'' نہ مانا گیا۔ اس سلسلے میں مولانا محمد اسماعیل سلفی فرماتے ہیں۔

''صحیح بخاری' نسائی' ترمذی' موطا' ابن ماجہ وغیرہ کے مصنفین نے تبویب کی ہے' احادیث سے مسائل استنباط فرمائے ہیں' جن سے انسان میں قوتِ استنباط پیدا ہوتی ہے۔ مذاہب اربعہ کی کتبِ فقہ تو مسائل کی نقل ہے۔ ان کتابوں سے استنباط کا ملکہ مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ضخیم کتابوں کے ہوتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ فقیہ نہیں۔ ان کا کام الفاظ حدیث کا حفظ تھا۔۔۔ ایک پڑھا لکھا شخص جو حدیث کی کتابوں پر سرسری نظر بھی رکھتا ہو' یہ کہنے کی جراٴت نہیں کر سکتا کہ ائمہ حدیث غیر فقیہ تھے۔

''امام بخاری کی تبویب نے بڑے بڑے اربابِ فقہ و بصیرت کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ باقی محدثین ابوداوٗد' نسائی' ترمذی' موطا' ابن ماجہ کی تبویب نے ان کے تفقہ اور فقہی بصیرت کو واضح کر دیا ہے۔ جہاں تک احادیث سے مسائل کے استخراج اور فہم کا تعلق ہے' ائمہ حدیث کی تبویب میں صحیح اور معیاری فقہ پائی جاتی ہے۔

''اگر فقہ فرضی صورتوں کا نام ہے اور اس سے غیر موجود بلکہ ناممکن الوقوع معاملات اور احکام کا تعلق ہے تو واقعی اہل حدیث کی فقہ یا فقہ الحدیث میں اس کا ثبوت نہیں ملے گا۔ یہ خوبی فقہ العراق میں ہوگی۔ لیکن یہ دراصل فقہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ائمہ حدیث کا مقام مصطلح فقہا سے کہیں بلند ہے۔'' (۱)

محدثین پر تنقید کرنے سے معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ ان کے

۱۔ تحریک آزادیٔ فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی ص ۹۷'۹۸۔

نزدیک ائمہ حدیث فقیہ نہیں ہیں۔ ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے' صرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مرتبہ فقاہت کے بارے میں چند اہل علم کی آرا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ماا خرجت خراسان مثل محمد بن اسماعیل فقیھا انه فقیه ھٰذه الامة .

(خراسان میں امام محمد بن اسماعیل جیسا کوئی فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ بلا شبہ وہ اس امت کے فقیہ تھے)

فتح الباری کے مقدمے میں امام بخاری کے بارے میں امام دارمی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

قدرایت العلماء بالحرمین والحجاز والشام والعراق فمارأیت فیھم اجمع من محمد بن اسماعیل ھواعلمنا وافقھنا واکثرنا طلبا.

(میں نے حرمین' حجاز' شام اور عراق کے اصحاب علم کو دیکھا ہے۔ ان میں سے کسی کو امام محمد بن اسماعیل بخاری جیسی جامع شخصیت نہیں پایا۔ وہ ہم سب سے زیادہ عالم' سب سے بڑے فقیہ اور علم کے طالب ہیں۔)

امام صاحب کے بارے میں اہل علم کا یہ مشہور مقولہ ہے۔

فقه البخاری فی تراجمه۔

یعنی امام بخاری کی فقاہت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو تراجم بخاری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حدیث کے ایک ایک باب سے وہ متعدد مسائل مستنبط کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی فرماتے ہیں۔

فقد وجد بعدعلم ایضاً ارباب الاجتھاد المستقل کابی ثورالبغدادی وداؤد الظاھری ومحمدبن اسماعیل البخاری وغیرھم علی مالایخفی علی من طالع کتب الطبقات.[1]

(جو حضرات کتب طبقات کے مطالعہ سے شغف رکھتے ہیں' ان پر مخفی نہیں کہ

۱۔ النافع الکبیر

ائمہ اربعہ کے بعد بہت سے اصحاب علم مستقل ارباب اجتہاد ہوئے ہیں، جیسے
امام ثور بغدادی، امام داؤد ظاہری اور امام محمد بن اسماعیل بخاری وغیرہ)
فیض الباری میں مولانا انور شاہ کاشمیری کا فرمان ہے۔

ولکن الحق ان البخاری مجتهد. (بے شک امام بخاری مجتہد ہیں)

اگر فقہ کی چند درسی کتابیں پڑھنے اور ناممکن الوقوع مسائل کی گردان کرنے کا نام فقہ ہے تو محدثین نے واقعی وہ کتابیں کسی مسجد کے مدرس سے نہیں پڑھی تھیں۔ نہ انھوں نے کسی فقیہ نام دار سے قدوری کا درس لیا تھا اور نہ شرح وقایہ یا ہدایہ کے لیے کسی عالی قدر استاد کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا تھا، نہ فقہ کی وہ ضخیم کتاب پڑھی تھی جو ہندوستان میں اورنگ زیب عالم گیر نے علماے کرام کی ایک بہت بڑی جماعت سے مرتب کرائی تھی، جسے فتاویٰ عالم گیری یا فتاویٰ ہند یہ کہا جاتا ہے۔ نہ اصول فقہ کی اصول شاشی یا ملا جیون امیٹھوی کی نور الانوار تک محدثین میں سے کسی کی رسائی ہو سکی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جس انداز سے اہل حدیث اور اہل رائے کے متعلق اظہار رائے فرمایا ہے، اس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ ان کے نزدیک محدثین کی فقاہت احادیث و آثار صحابہ پر مبنی تھی اور وہ اسی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اب اس باب میں عمرانیات کے ماہر اور فلسفہ تاریخ کے بانی علامہ ابن خلدون کا نقطہ نظر بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ وہ مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں۔

انقسم الفقه منهم الى طريقين طريقة اهل الرای والقياس وهم اهل العراق وطريقة اهل الحديث وهم اهل الحجاز، وكان الحديث قليلاً فی اهل العراق لما قدمناه، فاستكثروا من القياس ومهروا فيه فلذالك قيل لهم اهل الرای ومقدم جماعتهم الذی استقر المذهب فيه وفی اصحابه ابوحنيفة وامام اهل الحجاز مالك ابن انس والشافعی من بعد.

(یعنی دور گزشتہ کے لوگوں میں فقہ کے دو طریقے رائج ہو گئے تھے۔ ایک

طریقہ اہل رائے کا تھا' وہ عراق والوں کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ اہل حدیث کا تھا' وہ حجاز والوں کا طریقہ ہے۔ عراق والوں میں حدیث کا علم کم تھا' اس لیے انھوں نے زیادہ تر قیاس سے کام لیا اور قیاس ہی میں انھوں نے مہارت پیدا کی' اسی بنا پر انھیں اہل رائے کہا گیا۔ اس جماعت کے سربراہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور حجاز والوں کے سربراہ امام مالک بن انس اور ان کے بعد امام شافعی کو ان کی سربراہی کا اعزاز حاصل ہوا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔)

اہل حدیث کے نزدیک یہ تمام حضرات لائق تکریم ہیں اور وہ ان سب سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مسئلے سے متعلق ان سے پوچھا جائے گا تو ان کا جواب وہی ہوگا جو قرآن وحدیث سے ہم آہنگ ہوگا' جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

وکان ابن عباس اذا سئل عن الامر فان کان فی القرآن اخبربه وان لم یکن فی القرآن وکان عن رسول الله صلی الله علیه وسلم اخبربه ' وان لم یکن فعن ابی بکر و عمر فان لم یکن قال فیه برایه.[1]

(یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اگر وہ قرآن مجید میں ہوتا تو اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ اگر قرآن مجید میں نہ ہوتا تو حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع فرماتے اور اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ اگر حدیث میں بھی نہ ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق جواب دیتے۔ اگر وہاں بھی نہ پاتے تو اپنی رائے سے جواب دیتے۔)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جواب مسئلہ میں پہلے قرآن' پھر حدیث اور پھر صحابہ کرام کے قول وعمل کو دیکھنا چاہیے۔۔۔۔اور اہل حدیث کا یہی نقطہ نظر اور یہی طریق عمل ہے۔

لیکن ہمارے ان معزز دوستوں کا جو مقلد کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں' طریقہ یہ ہے کہ فقہ کی وہ کتابیں دیکھو اور انہی سے استفادہ کرو' جو حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کئی سو سال بعد لکھی گئیں۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۵۰۔

اٹھارھواں باب

کیا ائمہ اربعہ اہل حدیث نہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ربیع الاول ۱۱ ہجری میں ہوا' اس طرح ۱۱ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک ختم ہوگیا۔۔ پھر صحابہ کا زمانہ ۱۱۰ ہجری (یعنی ننانوے برس) تک چلا۔ آخری صحابی حضرت ابوطفیل نے ۱۱۰ ہجری میں وفات پائی۔۔۔ تابعین کا زمانہ ۱۸۰ ہجری تک چلتا ہے اور تبع تابعین کا ۲۲۰ ہجری تک۔۔۔!

یہ قرون ثلاثہ ہیں' جنھیں قرون خیار کہا جاتا ہے۔ ائمہ اربعہ کا زمانہ بھی یہی ہے' جن کی اب تقلید کی جاتی ہے۔ صرف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بیس برس اس مدت سے زائد ہیں۔ ائمہ اربعہ کے زمانے کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۸۰ ہجری میں کوفہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ ہجری میں بغداد میں ان کا انتقال ہوا۔

۲۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۹۳ ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی اور ۱۷۹ ہجری میں مدینہ منورہ ہی میں انھوں نے جنت الفردوس کا عزم کیا۔

۳۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۵۰ ہجری میں علاقہ عسقلان کے ایک مقام غزہ میں ہوئی اور ۲۰۴ ہجری میں قاہرہ (مصر) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

۴۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بغداد میں ۱۶۴ ہجری کو پیدا ہوئے اور ۲۴۱ ہجری کو بغداد ہی میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔

ان سے قبل یا ان کے زمانے میں یا ان کے بعد چوتھی صدی ہجری تک کسی امام کی کسی نے تقلید نہیں کی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان الناس کانوا قبل المائة الرابعة غیر مجمعین علی التقلید

الخالص لمذهب واحد بعينه. [1]

(یادرکھو کہ لوگ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کسی ایک معین مذہب کی تقلید پر جمع نہ تھے۔)

ائمہ اربعہ تقلید کے مخالف تھے اور وہ لوگوں کو سختی کے ساتھ تقلید سے منع فرماتے تھے۔

چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے۔

اذا صح الحديث فهو مذهبي. [2]

(جب کسی مسئلے میں صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔)

نیز حضرت امام نے فرمایا:

لايحل لاحد ان ياخذ بقولنا مالم يعلم من اين اخذنا. [3]

(کسی شخص کے لیے اس وقت تک ہماری بات پر عمل کرنا جائز نہیں جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہم نے وہ بات کہاں سے لی ہے۔)

حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ سے اس طرح کے متعدد اقوال منقول ہیں۔

اب آیے حدیث وفقہ کے دوسرے جلیل القدر رکن حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف، وہ بھی واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

انما انابشراخطئی واصيب ، فانظروا فی رأی فكلما وافق الكتاب والسنة فخذوه وكلمالم يوافق الكتاب والسنة فاتركوه.

(میں بھی انسان ہوں، کبھی اجتہاد میں غلطی کر جاتا ہوں اور کبھی مسئلے کی صحت تک پہنچ جاتا ہوں، اس لیے تم میری بات کے متعلق غور کرو، جو قرآن وحدیث کے مطابق ہو، اسے قبول کرو اور جو قرآن وحدیث کے مطابق نہ ہو، اسے ترک کردو۔)

تیسرے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صفحہ ۱۵۲۔
۲۔ فتاویٰ شامی جلد ا صفحہ ۴۶۔
۳۔ البحر الرائق، جلد ۲ صفحہ ۲۹۳۔

اذا صح الحدیث فھو مذھبی. [1]

(جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے)

ایک موقعے پر حضرت امام نے فرمایا:

کل مسئلة صح فیھا الخبر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخلاف ماقلت فا ناراجع فی حیاتی و بعد موتی. [2]

(ہر وہ مسئلہ جس کے بارے میں میری راے صحیح حدیث کے خلاف ثابت ہو جائے تو میں اپنی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی' اس حدیث کی طرف رجوع کرتا ہوں۔)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ چوتھے امام فقہ ہیں' ان کا ارشاد ہے۔

لاتقلدنی ولاتقلدن مالکاً والا وزاعی ولاالنخعی ولاغیرھم فخذالاحکام من حیث اخذوا من الکتاب والسنة. [3]

(تم نہ میری بات بلا دلیل مانو اور نہ مالک' اوزاعی اور نخعی وغیرہ کی بات پر بہ صورت تقلید عمل کرو' بلکہ احکام دین وہیں سے لو' جہاں سے خود انھوں نے لیے ہیں' یعنی قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرو۔)

یہ ان ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے ارشادات گرامی ہیں جن کی اب تقلید کی جاتی ہے۔ ان ارشادات میں صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ احکام شرعی اور اصول دین میں قابل عمل قرآن وحدیث ہیں' فہم مسائل میں انہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ائمہ اربعہ اہل حدیث تھے' وہ عامل بالحدیث اور حاملین حدیث تھے۔ وہ لوگوں کو بار بار تاکید کرتے اور صریح الفاظ میں حکم دیتے ہیں کہ مسائل و احکام میں ہماری راے کے بجائے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرو اور اسی کو مدار عمل ٹھہراؤ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔ ۲۔ اعلام الموقعین جلد ۲ صفحہ ۲۶۴۔

۳۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔

واجعل الكتاب والسنة امامك وانظر فيهما بتامل وتدبر واعمل بهما ولا تغتر بالقال والقيل والهوس.[۱]

(صرف کتاب وسنت کو پیش نگاہ رکھو' انہی دونوں کو ہدف غور وفکر ٹھہراؤ' پھر انہی دونوں کو مدارِ عمل قرار دو' کسی کی ادھر ادھر کی باتوں اور خواہشوں کے دھوکے میں نہ آؤ۔)

اہل حدیث کا یہی نقطہ نظر ہے' یہی ان کی تبلیغ اور یہی ان کی تلقین ہے کہ کتاب وسنت کو مرکز التفات ٹھہرایا جائے اور اسی کی بنیاد پر عمل کی دیواریں استوار کی جائیں۔

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے ان ارشادات کی روشنی میں بتایا جائے کیا وہ اہل حدیث نہیں؟ یقیناً وہ اہل حدیث ہیں جو لوگوں کو واضح الفاظ میں سختی کے ساتھ کتاب وسنت پر عمل کرنے اور رسائل رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔

۱۔ فتوح الطیب مقالہ نمبر ۳۶۔صراط مستقیم صفحہ ۳۵۔

انیسواں باب

چند فرقے

کتاب کے مختلف مقامات پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اہل حدیث' اسلام کا کوئی فرقہ نہیں' عین اسلام ہے اور اسلام کے احکام و اوامر کی صحیح صحیح ترجمانی ہے' اس کی اصلی اور بنیادی تعبیر ہے۔ اس کا کسی فرقے اور کسی امام فقہ کی تقلید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تقلید سے ذہنوں میں جمود کے آثار ابھرتے اور غور و فکر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور اجتہاد کے کواڑوں پر قفل چڑھا دیا جاتا ہے۔

اہل حدیث کا تعلق براہِ راست کتاب و سنت سے ہے' ان کے نزدیک وہی شے لائق عمل اور وہی بات شائستہ التفات ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ اور ارشادات خداوندی اور فرامین پیغمبر سے ہم آہنگ ہے۔

مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے اور وہ تمام فرقے اپنے بانی کی طرف منسوب ہیں اور ان سب میں کوئی نہ کوئی شخصیت جلوہ گر ہے۔ لیکن اہل حدیث میں یہ بات کہیں دکھائی نہیں دیتی' ان کا انتساب سیدھا حدیث رسول اور احکام خاتم النبیین کی طرف ہے' صلی اللہ علیہ وسلم۔

عہدِ اسلام میں جن فرقوں نے جنم لیا اور جس انداز اور جس پس منظر میں لیا اور جس شخص کی وجہ سے لیا' اس کی تفصیل اس موضوع کی مختلف کتابوں میں مرقوم ہے۔ ان کتابوں میں ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین اور شہرستانی کی الملل والنحل وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔ اس موقعے پر تفصیل میں جانا مقصود نہیں' اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل سطور میں چند فرقوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ عہد اسلامی میں جو پہلا فرقہ پیدا ہوا' وہ ''سبائی فرقہ'' تھا۔ اس کے عالم وجود

میں آنے کا پس منظر یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخری دور میں ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے ظاہری طور سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نظامِ خلافت کو ہدف تنقید ٹھہرانا شروع کیا۔ اس مسئلے کو اس نے اس قدر اچھالا کہ باغیوں کی ایک مستقل جماعت منظم ہو گئی اور پھر ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری کو ان لوگوں کے بلوے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر لیا گیا۔ اس زمانے میں علاقہ شام کے والی (گورنر) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ وہاں کے لوگوں اور حضرت عثمان کے حامیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لیا جائے۔ حضرت علی نے فرمایا چند روز صبر کرو، میں ضرور بدلہ لوں گا۔ لیکن معاملہ آگے بڑھا تو اہل شام اور حامیان عثمان نے حضرت علی کے مقابلے میں حضرت معاویہ کو خلیفہ مقرر کر لیا۔ اب سبائیوں نے حضرت علی کا ساتھ دیا اور پھر صفین کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی۔

اسی دوران حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان طے پایا کہ دونوں طرف سے دو منصف مقرر کر لیے جائیں، وہ جو فیصلہ کریں، اسے مان لیا جائے۔ چنانچہ حضرت علی کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اور حضرت معاویہ کی طرف سے حضرت عمرو بن عاص کو منصف مقرر کیا گیا، اسلامی تاریخ میں ان دونوں منصفوں کے تقرر کو "تحکیم" کہا جاتا ہے۔ سبائی فرقے کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کے درمیان فتنہ پیدا کیا جائے، وہ صلح بالکل نہیں چاہتے تھے۔ اب انھوں نے اعلان کیا کہ (العیاذ باللہ) حضرت علی نے اللہ کی نافرمانی کی ہے اور انھوں نے اللہ کے مقابلے میں ایک انسان کو منصف مقرر کر لیا ہے جو شرک ہے، قرآن کا فرمان ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا...

(الانعام: ۱۱۴)

(کیا میں غیر اللہ کو حکم مانوں حالاں کہ اس نے یہ واضح کتاب تم پر اتاری

ہے۔)

انھوں نے مسلمانوں میں فساد کی حدود کو وسعت دینے کی غرض سے حضرت علی کے موقف کو شرک سے تعبیر کیا اور اعلان کیا کہ مشرک کی اطاعت جائز نہیں۔ چنانچہ وہ حضرت علی کے حلقہ اطاعت سے خارج ہو گئے۔ پھر وہ اس معاملے میں یہاں تک آگے بڑھے کہ ہر کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیا اور کہا کہ کبائر کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

۲۔ یہ لوگ جو تحکیم کے مسئلے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے الگ ہو گئے تھے، خارجی کہلائے۔ اب تک اس فرقے کو خارجی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۳۔ ان کے مقابلے میں ایک گروہ کو شیعہ کہا جانے لگا، یعنی ''شیعان علی''۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور ان کی رفاقت اختیار کیے رکھی۔

۴۔ عبدالملک بن مروان جو خاندان بنوامیہ سے تعلق رکھتا تھا، ۶۵ ہجری سے ۸۶ ہجری تک اکیس برس تخت خلافت پر متمکن رہا۔ اس کے زمانے میں بصرہ کے ایک شخص معبد کا ظہور ہوا، وہ تقدیر کا منکر تھا۔ امام عبدالرحمٰن بن عمرو جو امام اوزاعی کے نام سے مشہور ہیں، ملک شام کے معروف امام فقہ تھے اور تبع تابعی تھے، انھوں نے ۱۵۷ ہجری میں وفات پائی۔ ان کا فرمان ہے کہ معبد نے انکار تقدیر کا عقیدہ ایک نصرانی سے لیا تھا، جس کا نام سوسن تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن پھر اسلام ترک کر کے ارتداد کی راہ اختیار کر لی تھی۔۔۔ منکرین تقدیر کو ''قدریہ'' کہا جانے لگا اور انھوں نے ایک مستقل فرقے کے طور پر شہرت پائی۔

۵۔ ان فرقوں میں سے ایک ''فرقہ جہمیہ'' ہے۔ یہ فرقہ کوفہ کے ایک شخص جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔ جہم بڑا لسان اور فصیح البیان تھا، وہ ایک شخص جعد بن درہم کا شاگرد اور عقیدت مند تھا، جو صفات الٰہیہ کا منکر تھا اور اسے فتنہ پھیلانے کی وجہ سے شہر واسط میں قتل کر دیا گیا تھا۔ جہم بن صفوان اس کے افکار کا زبردست مبلغ تھا، اسے ۱۲۸ ہجری میں حاکم خراسان نصر بن سیار کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

۶۔ ایک مشہور فرقے کو فرقہ معتزلہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ

حضرت حسن بصری (متوفی ۱۱۰ ہجری) سے ان کے حلقہ درس میں کسی نے سوال کیا کہ خوارج کبیرہ گناہ کو کفر قرار دیتے ہیں اور اس کا مرتکب ان کے نزدیک کافر ہے' لیکن مرجئہ کا کہنا ہے کہ مومن کو گناہ سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا' اس سلسلے میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟

امام حسن بصری اس سوال کا ابھی کوئی جواب نہیں دے پائے تھے کہ ان کے ایک شاگرد واصل بن عطا نے کہا کہ مرتکب کبیرہ کا حکم ان دونوں کے درمیان ہے' یعنی نہ وہ مومن ہے' نہ کافر۔۔۔واصل یہ الفاظ کہتا ہوا ایک ستون کی طرف چلا گیا اور ان سے الگ ہو گیا۔اس پر امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اعتزل عنا الواصل

(یعنی واصل ہم سے الگ ہو گیا۔)

اعتزال کے لفظی معنے الگ ہو جانے کے ہیں' اصطلاحی معنے ہیں اہل سنت کے عقائد سے انحراف کی راہ پر گامزن ہونا۔۔۔تو جس شخص نے قولاً وعملاً عقیدۂ اہل سنت سے انکار کیا وہ معتزلی کہلایا۔گویا معتزلہ کا بانی واصل بن عطا ہوا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) کے زمانے میں ایک مشہور معتزلی عالم ابوہذیل تھا۔ مامون اس کے افکار ونظریات سے بے حد متاثر ہوا' اور مملکت اسلامی میں جبراً ان افکار ونظریات کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا' جس کی وجہ سے ائمہ اہل سنت کو شدید ابتلا کے مراحل سے گزرنا پڑا۔

۷۔ تمام فرقوں کے بارے میں بہت سی تفصیلات پائی جاتی ہیں' جو ہم نے ترک کر دی ہیں ان میں ایک فرقہ مرجئہ ہے' اس کی بحث بھی بڑی طویل ہے۔اختصار کے ساتھ یہ عرض کرنا کافی ہے کہ ارجا کے معنے تاخیر کرنا بھی ہے اور امید دلانا بھی۔لہٰذا اس کا اطلاق مندرجہ ذیل امور پر ہوتا ہے۔

☆ عمل کو ایمان سے موخر کرنا

☆ مرتکب کبیرہ کے حکم کو قیامت پر موخر کرنا اور اس دنیا میں اس کے متعلق کوئی قطعی حکم نہ لگانا' یعنی یہ رائے نہ دینا کہ وہ اصحاب جنت میں سے ہے یا اصحاب جہنم میں

ہے۔

☆ ایمان کی موجودگی میں گناہوں کا ضرر نہ پہنچانا اور فقط ایمان پر نجات کی امید رکھنا۔

۸۔ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں ایک شخص ابوعبداللہ محمد بن کرام سجستانی کا ظہور ہوا۔ اس شخص کو ابن کرام بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے صفات الٰہیہ کو اس انداز میں ثابت کرنے کی مہم کا آغاز کیا کہ اللہ تعالیٰ کو مجسم بنا دیا گیا (معاذ اللہ) یعنی اس کے ہاتھ' پاؤں' آنکھ وغیرہ تمام اعضا کو حقیقت کا درجہ دے دیا گیا۔ ان افکار کے حامی فرقے کا نام ''کرامیہ'' تھا جو اپنے بانی ابوعبداللہ محمد بن کرام کی طرف منسوب ہوا۔

محمد بن کرام ملک شام میں گھومتا پھرتا رہا۔ اس نے ۲۵۶ ہجری میں زعزہ کے مقام پر وفات پائی۔

۹۔ عباسیوں کا عہدِ حکومت تھا کہ ۲۶۱ ہجری میں ایک شخص حمدان بن اشعث نے سر نکالا۔ یہ شخص ''قرمط'' کے نام سے معروف تھا۔ اس نے ایک عجیب وغریب فرقہ پیدا کیا' جسے اس کے بانی کے نام کی نسبت سے ''قرامطہ'' بھی کہا جاتا ہے اور اس کے باطنی مطالب ومعانی کی بنا پر ''فرقہ باطنیہ'' سے بھی تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس فرقے نے بے حد شہرت پائی' سیاسی اعتبار سے بھی اور مذہبی اعتبار سے بھی۔۔۔!

سیاسی اعتبار سے اس طرح کہ باشندگانِ جنابہ میں سے ایک شخص ابوسعید جنابی نے علاقہ بحرین کی زمام حکومت ہاتھ میں لی اور پھر اسے اس درجہ قوت حاصل ہوئی کہ عباسی خلفا بھی اس سے خوف زدہ ہو گئے۔۔۔ اس کے بعد اس کے جانشینوں نے بھی بڑی مضبوطی اور دھڑلے سے حکومت کی۔

مذہبی اعتبار سے یہ فرقہ بہت بڑے فتنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے ماننے والوں نے ارکان اسلام یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ وغیرہ کا سلسلہ بالکل الٹ دیا اور جو چیزیں شریعت نے حلال یا حرام کی ہیں' ان کی تمام حدود کو اپنی خواہشات کے قالب میں ڈھال لیا اور سب امتیازات ختم کر ڈالے۔ یہاں تک کہ ماں' بہن' بیٹی' خالہ' پھوپھی وغیرہ میں حلت وحرمت کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ یہ اسلام میں ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو رونما ہوا۔

انھوں نے ہر طرف کثیر تعداد میں اپنے مبلغین بھیج دیے تھے جو لوگوں کو خواہش پرستی اور مذہبی قیود سے آزادی کی تعلیم دیتے تھے۔

اس قسم کے ملحد فقیر اب بھی برصغیر کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں' جن کے دام تزویر میں بہت سے لوگ پھنس جاتے ہیں اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

ان فرقوں کے علاوہ اور بھی متعدد فرقے جبریہ' وعیدیہ' مجسمہ وغیرہ عالم وجود میں آئے۔ لیکن اصل اور قابل عمل دین وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لے کر آئے' جس پر صحابہ کرام نے عمل کیا' جس کی تابعین و تبع تابعین نے تبلیغ کی اور جس کی نشر و اشاعت کا فریضہ ائمہ حدیث و فقہ نے انجام دیا' بحمد اللہ اہل حدیث اسی پر عامل ہیں اور اسی کے احکام کی ترویج ان کا مقصد حیات اور اسی کے نفاذ کی کوشش ان کا اصول زیست ہے۔

❀❀❀

بیسواں باب

برصغیر میں اہل حدیث کی خدمات ایک نظر میں

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا' برصغیر کے لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت (۱۵ ہجری) میں اسلام سے آشنا ہو گئے تھے اور اس کی تعلیمات کے بعض گوشے یہاں پہنچ گئے تھے۔ لیکن پوری قوت کے ساتھ اسلام محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ کے نتیجے میں ۹۳ ہجری میں یہاں آیا۔ اس وقت محمد بن قاسم کی عمر اٹھائیس برس تھی۔

وہ ۶۵ ہجری میں پیدا ہوئے تھے اور ۸۳ ہجری میں ان کو فارس اور شیراز کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ ۹۲ ہجری میں وہ ستائیس برس کو پہنچے تو انھیں سندھ پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اپنے مسکن فارس سے روانہ ہو کر وہ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے حدودِ سندھ میں وارد ہوئے تو ان کا کاروانِ حیات اٹھائیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا اور ان کی فوج بیس ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی۔ یہ ۹۳ ہجری کا واقعہ ہے۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ حجاج بن یوسف نے ملک شام کی جو تربیت یافتہ فوج انھیں دی تھی' اس کے علاوہ کافی تعداد میں فوجی ان کے ساتھ تھے۔

وضم ستة آلاف من جند اهل الشام.

(فتوح البلدان۔ صفحہ ۴۲۴)

یعنی حجاج بن یوسف نے شام کے چھ ہزار فوجیوں کو محمد بن قاسم کی کمان میں روانہ کیا تھا' لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ان کے لشکر میں شامل تھے۔

چچ نامہ کی روایت کے مطابق وہ جس جس مقام پر رکتے اور پڑاؤ کرتے گئے' لوگ

ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ اس طرح اصل فوج کے علاوہ کئی ہزار رضا کاران کی رکاب میں تھے۔ جب حدودِ سندھ میں داخل ہوئے اس وقت وہ بیس ہزار سے زیادہ فوج کی کمان کر رہے تھے۔

بعض لوگوں کی یہ بات بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ پر حملہ کیا تھا اور ان کے فوجیوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ یہ محض افسانوی اور ناولاتی باتیں ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اتنے بڑے ملک پر اتنی قلیل تعداد کی فوج کے ساتھ ہرگز حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس فوج کو سترہ سال کا کم سن لڑکا سمندر پار سے لا کر حملہ کرے، نہ اسے عقل مانتی ہے اور نہ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

برصغیر میں اہل حدیث نے کیا خدمات سرانجام دیں ذیل کی سطور میں ان کی خدمات گوناگوں کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔ اگر قلم وقرطاس سے رابطہ رہا اور اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تو ان شاء اللہ اہل حدیث کی مندرجہ ذیل خدمات تفصیل سے بیان کی جائیں گی۔

۱۔ تدریسی وتعلیمی خدمات

عرب مسلمانوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فاتح کی حیثیت سے آنے کے بعد سب سے زیادہ زور وہاں کے باشندوں کی تعلیم پر دیا اور اس کے لیے مراکزِ تدریس قائم کیے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے پہلی وحی میں حصولِ علم ہی کا حکم دیا گیا تھا۔ "الهند في العهد الاسلامي" کے صفحہ ۱۴۴ پر مرقوم ہے کہ:

"محمد بن قاسم نے دیبل فتح کرنے کے بعد وہاں ایک مسجد تعمیر کی، جسے چار ہزار بچوں کی تعلیم کا مرکز کہا جاتا ہے اور وہ پنڈت جو اس سے قبل قیدیوں کی نگرانی کرتا تھا، محمد بن قاسم کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا، اسے دیبل کا نائب مقرر کیا گیا۔ یہ پنڈت اس دور کا بہت بڑا عالم، مشہور ادیب اور عاقل وفہیم شخص تھا۔

فتوح البلدان میں بتایا گیا ہے کہ محمد بن قاسم نے راجستھان کے علاقے نیرون اور ارور فتح کیے اور پنجاب کے شہر ملتان پر قبضہ کیا تو وہاں مسجدیں تعمیر کرائیں۔" دہلی کے قدیم

مدارس'' کے مصنف کے بیان کے مطابق یہی مسجدیں ہندوستان کے نومسلموں کے اولیں تعلیمی مراکز تھے اور اس کے بعد صدیوں تک مسجدیں ہی مراکزِ تعلیم رہیں۔اب بھی دینی تعلیم زیادہ تر مسجدوں میں دی جاتی ہے۔

سندھ میں منصورہ وغیرہ شہر آباد کیے گئے' تو ان میں بھی مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ برصغیر میں یہ سلسلہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہو گیا تھا اور اسے شروع کرنے والے حاملینِ حدیث رسولؐ تھے اور یہ ان کی بہت بڑی بنیادی تدریسی خدمت تھی۔

اس موقعے پر یہ بتانا ضروری ہے کہ محمود غزنویؒ نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے ایک روایت کے مطابق گیارہ اور ایک روایت کی رو سے سترہ حملے کیے۔ وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا' جس نے لاہور پر حملہ کیا اور اس پر اسلامی پرچم لہرایا۔ تذکرہ نگاروں نے اسے اپنے دور کا بہت بڑا عالم اور فقیہ قرار دیا ہے۔۔۔وہ ۹۹۷ء میں تختِ حکومت پر متمکن ہوا۔ تریسٹھ سال عمر پا کر ۱۰۳۰ء میں فوت ہوا' اس نے ۳۴ برس حکومت کی۔ وہ ایک کشور کشا اور مدبر بادشاہ تھا۔ علامہ تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں' عبدالجبار عتبی نے تاریخ یمینی میں' ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں' ان اثیر نے تاریخ الکامل میں اور امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی نے ''مغیث الخلق فی ترجیح القول الحق'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

فرشتہ رقم طراز ہے کہ جب محمود غزنوی نے قنوج فتح کیا تو اس نے اس شہر میں ''مساجد و مدارس تعمیر کرد'' یعنی مسجدیں اور مدرسے تعمیر کیے۔

افغانستان اور سرحد کے علمائے کرام اور اصحابِ تاریخ نے سلطان محمود غزنوی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مسلک اہل حدیث سے منسلک ہو گیا تھا۔

محمود غزنوی اور دیگر غزنوی حکمرانوں کے دور میں ملک کے دوسرے مقامات کی طرح لاہور کی علمی حالت بالکل بدل گئی تھی اور مختلف ملکوں کے بے شمار علما و فضلا یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ تاریخ سلاطین آل غزنی کا مصنف ہمیں بتاتا ہے۔

''جوق جوق تشنگان علوم از سائر بلادِ ہندو ولایت ہائے کاشغر و ماوراء النہرو

عراق و بخارا و سمرقند و خراسان و غزنی وغیرہ ذالک' ازاں خیرات متنفع می شدند چندانکہ یک آبادانی در حدود لاہور پدید آمد۔''

یعنی دورِ غزنویہ میں بلادِ ہند' کاشغر' ماوراء النہر' عراق' بخارا' سمرقند' خراسان اور غزنی وغیرہ ممالک سے لوگوں کے گروہ کے گروہ لاہور آنے اور یہاں کے علم وفضل سے نفع اندوز ہونے لگے۔

محمود غزنوی کے سلسلے میں ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ برصغیر میں جہاں علمائے اہل حدیث نے مدارس قائم کرنے اور علوم کو پھیلانے کی کوشش کی وہاں مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے بادشاہوں اور ان کے وزرا و امرا نے بھی اس سلسلے میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔ ان بادشاہوں میں محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق بھی شامل ہیں جو امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں سے متاثر تھے۔

قدیم علمائے برصغیر میں سے شیخ مسعود فریدالدین پاک پتن' شیخ نظام الدین اولیا' شیخ حسین بن احمد بخاری جہانیاں جہاں گشت اوچ شریف' حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی' شیخ عبدالحق محدث دہلوی' شیخ علی متقی' شیخ عبدالوہاب متقی' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے فرزندانِ گرامی' مرزا مظہر جان جاناں' حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی' میاں سید نذیر حسین دہلوی' امرتسر کے خاندانِ غزنویہ کے علمائے کرام' لکھوی خاندان کے علمائے عالی قدر' روپڑی اصحاب علم' حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی' مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے وغیرہ بے شمار علمائے اہل حدیث نے علوم کی ترویج واشاعت کے لیے بڑھ چڑھ کر خدمات سرانجام دیں' رحمہم اللہ تعالیٰ۔

یہ سلسلہ اب تک نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ یہ موضوع بہت تفصیل طلب ہے۔ چند صفحات میں اس کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ اس موضوع کی کتاب میں بیان ہوگی۔

۲۔ تصنیفی وتالیفی خدمت

اب آیئے تصنیف وتالیف کی طرف۔ اس سلسلے میں علمائے اہل حدیث کے عمل وسعی کا

دامن انتہائی وسیع ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفاسیر و تراجم کے باب میں بھی خوب کام کیا' کتب احادیث کے حواشی و شروح کو بھی لائق التفات ٹھہرایا' درسی کتابیں بھی تصنیف کیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا۔

قرآن مجید کے سلسلے میں تنہا حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خان کی خدمات دس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ پورے برصغیر میں اس باب میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ وہ کثیر التصانیف عالم ہیں اور ان کی تصانیف نہایت اہم موضوعات پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے عربی' فارسی' اردو' تینوں زبانوں میں لکھا اور بہ درجہ غایت محققانہ انداز میں لکھا۔ نواب صاحب کے علاوہ برصغیر کے بہت سے علمائے کرام نے اپنے اپنے انداز میں قرآن مجید کی خدمت کی اور مختلف زبانوں میں کی۔ اس موضوع کی کتاب اس فقیر نے حروف تہجی کی ترتیب سے مکمل کر دی ہے' الحمد للہ علی ذالک۔

حدیث پاک کی شروح و حواشی کے باب میں نواب صدیق حسن خاں' حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی' مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری' مولانا عبیداللہ رحمانی' مولانا محمد بن عبداللہ علوی' مولانا شرف الدین دہلوی' مولانا محمد اسماعیل سلفی' مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور دیگر حضرات کی خدمات کی جتنی بھی تحسین کی جائے بجا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے سلسلے میں اردو میں حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کی عربی کتاب ''الرحیق المختوم'' نہایت اونچے درجے کی تصانیف ہیں۔ الرحیق المختوم کا اردو ترجمہ جو کئی سال پیشتر خود اس کے مصنف شہیر نے کیا تھا اور مکتبہ سلفیہ (لاہور) نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا' متعدد دفعہ چھپ چکا ہے اور اس ترجمے نے ہر حلقے میں بے حد مقبولیت حاصل کی ہے۔

مصری مصنف محمد حسین ہیکل کی سیرت کے متعلق کتاب ''سیرت محمدؐ '' کا اردو ترجمہ جو مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے کیا' بہت مقبول ہوا' بہت چھپا اور بہت پڑھا گیا۔

رحمۃ للعالمین تو اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے اور بہ یک وقت متعدد ناشروں نے شائع کی ہے۔اس کا عربی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔انگریزی ترجمہ سب سے پہلے حضرت قاضی محمد سلیمان مرحوم کے فرزند گرامی قاضی عبدالعزیز مرحوم نے کیا تھا جو ''پاکستان ٹائمز'' میں چھپتا رہا ہے۔اس پر نظر ثانی قاضی عبدالباقی صاحب نے کی جو قاضی محمد سلیمان کے پوتے اور قاضی عبدالعزیز کے فرزند ارجمند ہیں۔ان شاءاللہ یہ کتاب جلد چھپ جائے گی۔نہایت خوشی کی بات ہے کہ رحمۃ للعالمین کا ترجمہ بنگلہ زبان میں بھی ہمارے محترم دوست ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کر دیا ہے جو اس وقت امریکہ میں مقیم ہیں۔

پھر روزانہ پیش آنے والے فقہی مسائل کی کتب فتاویٰ کی شکل میں اہل حدیث علمائے عظام نے کتاب و سنت کی روشنی میں اور اقوال صحابہؓ وائمہ دین کے حوالوں سے وضاحت کی ہے۔اس سلسلے میں علمائے غزنویہؒ کا فتاویٰ غزنویہ' حضرت سید میاں نذیر حسین دہلویؒ کا فتاویٰ نذیریہ' حضرت مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ کا فتاویٰ ثنائیہ' حضرت حافظ عبداللہ روپڑیؒ کا فتاویٰ اہل حدیث' حافظ عبدالستار دہلویؒ کا فتاویٰ ستاریہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔طویل عرصے سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مولانا حافظ ثناءاللہ مدنی کے فتوے بالالتزام شائع ہو رہے ہیں' جن سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔یہ بہت بڑی خدمتِ دین ہے جو اہل حدیث کی طرف سے کی جا رہی ہے۔

۳۔شعری خدماتِ اسلام

شعر و نظم میں بھی اہل حدیث اصحاب علم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس میدان میں انھوں نے علمی' تاریخی اور سیاسی اعتبار سے بہترین خدمات انجام دیں۔حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے سات ضخیم جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر پنجابی زبان میں نظم کی' صرف و نحو کے قواعد فارسی زبان میں نظم کیے۔فقہی اور اصلاحی مسائل سے متعلق انواعِ محمدی' احوال الآخرت' زینت الاسلام وغیرہ کتابیں پنجابی اشعار میں' حافظ محمد لکھویؒ کی تصانیف ہیں جو کسی زمانے میں پنجاب کے ہر گھر میں پڑھی جاتی تھیں' لاتعداد لوگ ان سے مستفید ہوئے۔

مولانا ظفر علی خاں نے اردو نظم میں بے حد شہرت پائی اور چمنستان' بہارستان وغیرہ ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کتابوں میں سیاست' مذہب' تنقید' طنز' ردِ مرزائیت' تردیدِ بدعت' نعت اور حمد وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ سعودی حکومت کی تعریف وتعارف میں بھی انھوں نے بہت کچھ نظم کیا ہے۔

ہمارے محترم دوست علیم ناصری صاحب نے شاہ نامۂ بالاکوٹ کے نام سے جماعت مجاہدین کی پوری تاریخ نظم کر دی ہے اور ان کے جہاد کے تمام واقعات شعر کی زبان میں عمدگی کے ساتھ تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ یہ ان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجاہدین کی ان سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے جو انھوں نے پنجاب کی سکھا شاہی اور برصغیر کی انگریزی حکومت کے خلاف انجام دیں۔ شاہنامۂ بالاکوٹ میں تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی خوب جلوہ دکھا رہی ہے۔ حمد ونعت میں بھی علیم ناصری کا بلند پایہ شعری مجموعہ ''طلع البدر علینا'' قابل ذکر ہے۔

حمد ونعت اور اصلاحی کلام کے باب میں ہمارے مرحوم دوست راسخ عرفانی اور الاعتصام کے سابق ایڈیٹر قاری نعیم الحق نعیمؒ بھی ایک خاص مقام پر فائز ہیں۔

اہل حدیث کی فارسی اور اردو شاعری میں ایک بہت بڑا نام حضرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا ہے اور عربی شاعری میں قاضی طلا پشاوری اور قاضی یوسف حسین خان پوری کا بھی ایک مقام ہے۔ اسی طرح پنجابی شاعری میں مولانا نور حسین گھرجاکھی' عبدالستار' علی محمد صمصام' سعید الفت' عبدالکریم گرنتھی وغیرہ حضرات نے بڑی مسلکی خدمت کی۔

ان کے علاوہ ابوالبیان حماد' محمد سعید (وساوے والا) اور دیگر بہت سے ہندوستان اور پاکستان کے شعرا بہ صورت نظم اردو زبان وادب اور دین کی خدمت کر رہے ہیں۔

۴۔ مرزائیت کی تردید

مرزائیت کی تردید میں اہل حدیث علمانے بے حد خدمات سرانجام دیں۔ سب سے پہلے مرزا غلام قادیانی پر کفر کا فتویٰ حضرت مولانا محمد حسین بٹالویؒ نے مرتب کیا اور اس پر

سب سے پہلے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلویؒ نے دستخط کیے اور مہر لگائی۔ پھر مولانا بٹالویؒ نے ہندوستان کے علمائے کرام سے اس فتوے پر دستخط کرائے۔

۱۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو مرزا قادیانی سے مناظرے کے لیے مولانا ثناء اللہ امرتسری قادیان گئے۔ ان کے علاوہ اس سے قبل کوئی عالم مرزا قادیانی سے مناظرے کے لیے قادیان نہیں گئے تھے۔ مرزا صاحب کو خود اپنے گھر قادیان میں مولانا امرتسری کے مقابلے میں آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے مولانا کو فاتح قادیان قرار دیا۔

مرزا قادیانی کی وفات بھی اس بددعا کے نتیجے میں ہوئی جس میں انھوں نے خود ہی ۱۵/اپریل ۱۹۰۷ء کو ایک اشتہار میں مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کے سلسلے میں لکھا تھا کہ ''جھوٹا سچے کی زندگی میں مر جائے'' چنانچہ اس سے تیرہ مہینے گیارہ دن بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا صاحب لاہور میں مر گئے اور مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس سے چالیس سال بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے اہل حدیث عالم مولانا محمد حنیف ندویؒ نے کیا۔ وہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر تھے اور میں معاون مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے پر مامور تھا۔ انھوں نے ''الاعتصام'' کے اجرا کے فوراً بعد ۱۹۴۹ء۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں مرزائیت کے بارے میں مضامین لکھے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے' بلکہ خود مرزائیوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ پاکستان کے آئین کی ترتیب کے وقت مرزائیوں کے مسئلے پر شدید الجھن پیدا ہوگی' انھیں چاہیے کہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انھیں اقلیت شمار کیا جائے۔ اس ضمن میں ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' کے نام سے ۱۹۵۳ء کے شروع میں مولانا محمد حنیف ندوی کی کتاب بھی شائع ہوئی تھی جو چند روز میں ختم ہوگئی تھی۔ اب یہ کتاب طارق اکیڈیمی فیصل آباد کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس پر اس فقیر نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس مقدمے میں مرزائیت سے متعلق اختصار کے ساتھ اہل حدیث کی خدمات بیان کی گئی ہیں۔

مرزائیت کے باب میں اہل حدیث کی اولیات ایک مستقل مضمون نہیں بلکہ مستقل کتاب کی متقاضی ہیں اور اس موضوع کی کتاب کی پہلی جلد شائع ہوگئی ہے جو ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد بہاء الدین کی تصنیف ہے' اس کتاب میں مرزائیت کی تردید کے بارے میں اہل حدیث کی خدمات کو خوب صورت انداز اور حوالوں کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ آزادیٔ وطن سے پہلے بھی اور آزادیٔ وطن کے بعد بھی پاکستان میں مرزائیت کے خلاف جتنی تحریکیں اٹھی ہیں' ان میں اہل حدیث نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے علمائے کرام نے بھی' عوام نے بھی ۔۔۔! تصنیفات کی صورت میں' تقریروں اور مناظروں کی صورت میں' قید و بند اور گرفتاریوں کی صورت میں' یہ ہمیشہ آگے رہے۔ لیکن انھوں نے اپنی ان سرگرمیوں اور کوششوں کو اس انداز سے کتابی شکل میں لانے کی طرف توجہ نہیں کی' جس طرح دوسری جماعتوں کے لوگ کرتے ہیں۔ اب یہ خدمت ڈاکٹر محمد بہاء الدین سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ فقیر بھی تاریخ اہل حدیث کے سلسلے میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان شاء اللہ ہر اس چھوٹے بڑے کا ذکر کیا جائے گا جس نے اس اہم تحریک میں حصہ لیا اور جس انداز میں لیا۔

۵۔ صحافتی خدمات

صحافت کے میدان میں بھی اہل حدیث نے خوب کام کیا۔ یہ بھی ایک مستقل موضوع ہے۔ اب تک برصغیر کے مختلف مقامات سے اہل حدیث کے کم و بیش دو سو اخبارات اور رسائل و جرائد شائع ہو چکے ہیں' جن میں سے بعض بند ہو گئے ہیں اور بعض کا سلسلہ اشاعت جاری ہے۔ جاری رسائل و جرائد میں سے پندرہ روزہ صحیفہ اہل حدیث (کراچی) ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث (لاہور) ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) اور ہفت روزہ اہل حدیث (لاہور) نے اللہ کے فضل سے بڑی عمر پائی۔ دعا ہے ان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ برکت پیدا فرمائے اور یہ اپنے مسلک کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں۔ جو اخبار کسی وجہ سے بند ہو گئے' ان میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے اخبار ''اہل حدیث'' نے

سینتالیس سال عمر پائی اور ملک وقوم اور مسلک کی بے حد خدمت کی۔

۶۔ سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں

اب چند الفاظ اہل حدیث کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں۔!

اہل حدیث عوام وخواص نے برصغیر کی سیاست میں ہمیشہ پُر جوش انداز سے حصہ لیا۔ ۱۸۲۶ء میں تحریکِ مجاہدین نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف سلسلۂ جہاد شروع کیا تو ابتدائی دور میں اس میں اکثریت اہل حدیث کی تھی۔ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کے میدان میں حضرت سید احمد بریلوی' مولانا اسماعیل دہلوی اور ان کے بہت سے رفقائے کرام نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد اس جماعت کا انگریزی حکومت سے مقابلہ شروع ہوا تو یہ پوری جماعت اہل حدیث حضرات پر مشتمل تھی اور پھر ہمیشہ یہی حال رہا' یہ نہایت صبر آزما اور جرأت مندانہ اقدام تھا جو آزادیٔ وطن یعنی ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ تحریک مجاہدین نے تقریباً ایک سو چھپیس سال عمر پائی اور وہ پاک باز لوگ انگریزوں کے خلاف پوری قوت کے ساتھ پنجہ آزما رہے۔ اب بھی یہ سلسلہ غیر اسلامی طاقتوں کے خلاف کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں بھی اہل حدیث نے بے حد تگ وتاز کی اور ان کے بے شمار لوگ انگریزی حکومت کی مخالفت کے نتیجے میں شہید ہوئے۔ پھر ان پر وہابی مقدمات قائم ہوئے۔ یہ مقدمات عظیم آباد (پٹنہ) انبالہ' راج محل' مالدہ وغیرہ میں قائم کیے گئے۔ ان مقدمات میں جن اہل حدیث علمائے کرام کو گرفتار کیا گیا تھا' ان میں سے بعض کو پھانسی کی سزائیں سنائی گئیں اور بعض کو عمر قید کر کے جزائر انڈمان یعنی کالے پانی بھیجا گیا اور بعض وہیں وفات پا گئے۔ ان کی جائدادیں انگریزی سرکار نے ضبط کیں اور ان کے ذرائع آمدنی مسدود کر دیے۔ ان میں زیادہ تر اصحاب ثروت لوگ تھے' ان کو سزائیں دے کر ان کے بچوں کو مالی اور معاشی اعتبار سے شدید ابتلاؤں میں ڈالا گیا۔

یہ موضوع بھی دیگر موضوعات کی طرح بہت تفصیل طلب ہے۔ اس ضمن میں یہاں اتنی بات عرض کروں گا کہ اہل حدیث نے برصغیر کی ہر اس تحریک میں نہایت جوش وخروش

سے حصہ لیا جس کا نقطۂ نظر اس خطۂ ارض کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ اس پورے ملک پر ہزار سال سے مسلمانوں کی حکمرانی تھی اور انگریزوں نے یہ ملک مسلمان حکمرانوں سے چھینا تھا' اس لیے قدرتی طور پر یہاں کے مسلمان اپنے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے بے تاب تھے' چناں چہ انھوں نے ان تمام تحریکوں سے تعاون کیا اور ان میں شمولیت کی' جو اس کی آزادی کے لیے عالمِ وجود میں آئی تھیں بلکہ بعض سیاسی جماعتیں خود اہل حدیث علما نے قائم کیں۔ مثلاً جمعیت علماے ہند ۱۹۱۹ء کے آخر میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز و تحریک سے قائم ہوئی' مجلس خلافت' تحریک ریشمی رومال' حزب اللہ اور مجلس احرار کے قیام میں بھی علماے اہل حدیث کا بہت بڑا حصہ ہے۔

بنگال میں مولانا شریعت اللہ کی رہنمائی میں فرائضی تحریک نے جنم لیا' وہ اہل حدیث بزرگ تھے جو ۱۷۸۰ء میں فیروز پور' (بنگال) میں پیدا اور ۱۸۴۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے محسن خاں نے باپ کی جگہ لی۔ محسن خاں کو دودھومیاں کہا جاتا تھا۔ ان کی ولادت ۱۸۱۹ء میں ہوئی اور ۱۸۶۲ء میں انھوں نے وفات پائی۔ پھر نثار علی عرف تیتو میاں نے آزادی کی تحریک چلائی۔ یہ بھی مولانا شریعت اللہ سے متاثر تھے اور انہی کی طرز پر تحریکی کام کرتے تھے۔ آگے چل کر ان کی تحریک میں تشدد آ گیا تھا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ آزادی کی دیوی کسی ایک ہی دروازے سے صحنِ چمن میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف دروازوں پر دستک دیتی ہوئی' کسی ایک دروازے پر آ رکتی اور صحنِ چمن میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ آزادیٔ برصغیر کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یہاں بے شمار تحریکیں اٹھیں اور حصولِ آزادی کے آخری باب کا آخری فقرہ اپنے پیچھے ایک طویل پس منظر اور لمبی داستان چھوڑ گیا' جس کا مطالعہ اس موضوع کی کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

مآخذ و مصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔	احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم	ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر مقدسی طبع لنڈن
۲۔	احسن البیان فیمافی سیرۃ النمان	مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی
۳۔	الادب المفرد	امام محمد بن اسماعیل بخاری
۴۔	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر اندلسی طبع مصر
۵۔	اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ	ابوالحسن عزالدین علی ابن اثر جزری
۶۔	اسلام کا نظام اراضی	مفتی محمد شفیع۔طبع کراچی
۷۔	اسلامی عہد کی عظمت رفتہ	قاضی اطہر مبارک پوری۔طبع دہلی
۸۔	الاصابہ فی تمیز الصحابہ	حافظ ابن حجر عسقلانی، طبع مصر
۹۔	اعلام الموقعین	امام ابن قیم
۱۰۔	الامامۃ والسیاسۃ	ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری۔طبع مصر
۱۱۔	کتاب الاموال	ابوعبید قاسم بن سلام۔ طبع حیدر آباد (دکن)
۱۲۔	کتاب الانساب	ابوسعید عبدالکریم سمعانی
۱۳۔	البدایہ والنہایہ	ابوالفدا اسماعیل ابن کثیر دمشقی۔مصر
۱۴۔	البیان والتبیین	ابوعثمان عمرو بن بحر جاحظ۔مصر

۱۵۔	تاج العروس من جواہر القاموس	سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی۔ طبع کویت
۱۶۔	تاریخ بغداد	ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی
۱۷۔	تاریخ ابن خلدون	عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون۔ مصر
۱۸۔	تاریخ سندھ	سید ابوظفر ندوی۔ دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ
۱۹۔	تاریخ الکامل	ابن اثیر۔
۲۰۔	تاریخ الملوک والامم	ابوجعفر محمد جریر طبری۔ مصر
۲۱۔	تاریخ معصومی	میر محمد معصوم بلگرامی۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی
۲۲۔	التاریخ الکبیر	امام محمد بن اسماعیل بخاری۔ حیدر آباد (دکن)
۲۳۔	تاریخ یعقوبی	احمد بن ابی یعقوب یعقوبی۔ طبع بیروت
۲۴۔	تجرید اسماء الصحابہ	حافظ ذہبی۔ حیدر آباد (دکن)
۲۵۔	تحفۃ الکرام	میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی
۲۶۔	تحریک آزادئ فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی	مولانا محمد اسماعیل سلفی۔ طبع لاہور
۲۷۔	تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد
۲۸۔	تذکرۃ الحفاظ	حافظ ذہبی حیدر آباد (دکن)
۲۹۔	تفہیمات الٰہیہ	شاہ ولی اللہ محدث
۳۰۔	تقریب التہذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی۔ مصر
۳۱۔	تقویم البلدان	عماد الدین اسماعیل۔ طبع پیرس
۳۲۔	تہذیب التہذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی۔ مصر
۳۳۔	جامع ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی۔ کراچی

۳۴۔ کتاب الجرح والتعدیل	ابومحمد عبدالرحمٰن بن ابوحاتم رازی۔ حیدر آباد (دکن)
۳۵۔ جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم اندلسی۔ مصر
۳۶۔ چچ نامہ	علی بن حامد بن ابوبکر۔ سندھی ادبی بورڈ۔ حیدر آباد
۳۷۔ حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ دہلوی۔ طبع لاہور
۳۸۔ کتاب الخراج	قاضی ابویوسف۔ طبع مصر
۳۹۔ کتاب الخراج	یحیٰی بن آدم قرشی۔ مصر
۴۰۔ خلافت امویہ اور ہندوستان	قاضی اطہر مبارک پوری۔ سکھر۔ سندھ
۴۱۔ رجال السند والہند	قاضی اطہر مبارک پوری۔ طبع مصر
۴۲۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان	سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی
۴۳۔ سنن ابی داؤد	سلیمان بن اشعث ابوداؤد سجستانی۔ کراچی
۴۴۔ سنن نسائی	ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی۔ طبع لاہور
۴۵۔ سیرت ابن ہشام	ابومحمد عبدالملک بن ہشام۔ طبع مصر
۴۶۔ سیرت النعمان	مولانا شبلی نعمانی
۴۷۔ صفوۃ الصفوہ	ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزی۔ حیدر آباد (دکن)
۴۸۔ طبقات الامم	ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی۔ مصر
۴۹۔ العبر فی خبر من غبر	حافظ ذہبی۔ کویت
۵۰۔ طبقات خلیفہ بن خیاط	خلیفہ بن خیاط مصری۔ طبع دمشق
۵۱ عجائب الہند	بزرگ بن شہریار۔ برل
۵۲۔ عرب وہند عہد رسالت میں	قاضی اطہر مبارک پوری۔ دہلی

۵۳۔ العقد الثمین فی فتوح الہند ومن ورد فیہا من الصحابۃ والتابعین — قاضی اطہر مبارک پوری۔ طبع مصر
۵۴۔ الفہرست — محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق
۵۵۔ الکامل فی التاریخ — ابن اثیر جزری
۵۶۔ کشف الظنون — حاجی خلیفہ
۵۷۔ لسان العرب — محمد بن مکرم بن منظور افریقی۔ طبع مصر
۵۸۔ لسان المیزان — حافظ ابن حجر عسقلانی۔ حیدر آباد (دکن)۔
۵۹۔ مجمع بحار الانوار — محمد طاہر پٹنی
۶۰۔ کتاب المحبر — ابو جعفر محمد بن حبیب بغدادی' حیدر آباد (دکن)
۶۱۔ المسالک والممالک — محمد بن عبدالکریم شہرستانی۔ مصر
۶۲۔ معجم البلدان — یاقوت حموی
۶۳۔ منہاج السنۃ — امام ابن تیمیہ' المکتبۃ السلفیۃ' لاہور
۶۴۔ مروج الذہب — علی بن حسین مسعودی۔ مصر
۶۵۔ مقالات الاسلامیین — ابوالحسن اشعری
۶۶۔ مقالاتِ سید سلیمان ندوی — مرتب صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین' اعظم گڑھ
۶۷۔ میزان الاعتدال — حافظ ذہبی۔ حیدر آباد (دکن)
۶۸۔ نزہۃ الخواطر — سید عبدالحی لکھنوی۔ حیدر آباد (دکن)
۶۹۔ وفیات الاعیان — ابن خلکان۔ طبع قاہرہ
۷۰۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں — قاضی اطہر مبارک پوری
۷۱۔ کتاب الہند — ابو ریحان بیرونی